بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ القرآن

وصیت و وراثت

مؤلفہ

مولانا عمر احمد عثمانی

ادارۂ فکر اسلامی
کاشانہ حفیظ ۲۴۰، ایبرداس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی ۳

طبعِ اوّل : اکتوبر ۱۹۸۶ء

طبعِ دوم : ~~اکتوبر ۱۹۸۷~~/ مارچ ۲۰۰۳ء

مطبع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر : **ادارۂ فکر اسلامی**

کاشانہ حفیظ نمبر ۲۴۰

گارڈن ایسٹ، ایسرداس اسٹریٹ، کراچی

﴿نوٹ از ناشر﴾

پہلی اشاعت میں موجودہ کتاب ''وصیت و وراثت'' کو فقہ القرآن کی جلد ہفتم کے طور پر شائع کیا گیا تھا لیکن اب چونکہ ہم ہر حصے اور ہر جلد کو مستقل عنوان کے تحت شائع کر رہے ہیں تا کہ قارئین کرام جس عنوان سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ متعلقہ کتاب خرید سکیں۔ اور ذہن پر بوجھ نہ رہے کہ جب تک ہم تمام جلدیں نہ خریدیں، تسلسل باقی نہیں رہے گا، لہٰذا اب یہ کتاب جلد ہفتم نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اپنے عنوان ''وصیت و وراثت'' کے تحت دستیاب ہوگی۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان

(صدر ادارۂ فکرِ اسلامی)

فہرستِ مشمولات

مضمون	صفحہ
سرنامہ ۔	۸
عرضِ ناشر ۔	۱۰
عرضِ مؤلف ۔	۱۱
وصیت نامہ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی ۔	۱۹
تعارفِ کتاب ۔	۲۶
تقریظ شیخ المشائخ حضرت مولانا جعفر شاہ پھلواروی ۔	۳۵
تبصرہ فراہی مکتبِ فکر کے ترجمان سہ ماہی "تدبر" لاہور کا تبصرہ	۴۳
گرامی نامہ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ۔	۴۷
کتاب الوصیۃ والوراثۃ ۔	۴۹
باب الوصیۃ ۔	۶۰
وصیت میں تبدیلی کرنا ۔	۶۳
وصیت کی ضرورت ۔	۶۵
وصیت کی آیات	۷۱
وصیت کی آیات منسوخ نہیں ہیں	۷۲
وجہ اول	۷۳
وجہ دوم	۷۵
وجہ سوم	۷۶
حدیث کا صحیح مطلب	۱۱۷
وصیت ثلث تک	۱۰۷
اصولی بحث	۱۱۰
حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی حدیث	۱۱۵
ہماری کوتاہ نظری	۱۱۸
وصیت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور افسانۂ فدک	۱۲۸
لفظ وراثت کے معنے	۱۲۸
کیا حضورؐ زمیندار تھے؟	۱۳۲
ازواجِ مطہرات کے لئے	۱۳۴
فدک کی کہانی	۱۳۵

مضمون	صفحہ
افسانۂ فدک ۔	۱۳۹
مالِ فئے کی حقیقت ۔	۱۴۴
حضرت علی رض کی مالی حیثیت ۔	۱۵۹
اس قضئے کی تحقیق	۱۷۹
حضرت علی رض کا عمل ۔	۱۸۳
حضرت فاطمہ رض کی ناراضگی ۔	۱۸۵
حضرت ابوہریرہ رض کی روایت ۔	۱۸۶
حضرت عائشہ رض کی روایت ۔	۱۸۹
محمد بن مسلم بن شہاب زُہری	۱۹۰
الکافی شیعہ امامیہ کی مستند ترین کتاب ہے ۔	۱۹۳
حقیقتِ واقعہ	۱۹۷
کیا حضورِ اکرمؐ کے پاس مالِ فئے کے علاوہ کچھ نہیں تھا؟ ۔	۲۰۸
ہمارا مؤقف ۔	۲۱۴
دوسرا اعتراض ۔	۲۲۵
اجماع کا سہارا ۔	۲۳۰
اصل حقیقت ۔	۲۳۵
اصل غلطی	۲۳۵
ہمارے نزدیک صحیح حل ۔	۲۳۶
کیا آدمی اپنی زندگی میں تصرف نہیں کرسکتا؟	۲۳۸
وقتی ضروریات کے ماتحت آرڈیننس ۔	۲۴۱
ارشادِ نبوی لا نورث ما ترکنا صدقۃ آیۂ وصیت کے عین مطابق تھا ۔	۲۴۶
وصیت کے فقہی مسائل ۔	۲۵۱
قاتل کے لئے وصیت ۔	۲۵۱
کافر کے لئے وصیت	۲۵۲
وصیت کو قبول یا رد کرنا ۔	۲۵۳
مقروض کی وصیت	۲۵۴

مضمون	صفحہ
نابالغ کی وصیت۔	۲۵۴
اس بچے کے لئے وصیت جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔	۲۵۵
وصیت سے رجوع۔	۲۵۵
رجوع لفظاً اور عملاً۔	۲۵۵
غیر معین وصیت۔	۲۵۶
حقوق اللہ کی وصیت۔	۲۵۶
حج کی وصیت۔	۲۵۸
باب الوصیۃ للاقارب وغیرھم۔	۲۶۳
سسرالی رشتہ داروں کیلئے وصیت۔	۲۶۳
سمدھانے کے لئے وصیت۔	۲۶۴
اقرباء کے لئے وصیت۔	۲۶۴
الاقرب فالاقرب۔	۲۶۸
اہل کے لئے وصیت۔	۲۶۹
آلِ فلاں کے لئے وصیت۔	۲۷۷
اہلِ بیت کے لئے وصیت۔	۲۷۸
اپنے اہلِ نسب اور اہلِ جنس کے لئے وصیت۔	۲۷۸

مضمون	صفحہ
بنو فلاں کے یتامیٰ، نابینا، معذور اور بیواؤں کے لئے وصیت۔	۲۷۹
خاندان کے فقراء و مساکین کے لئے وصیت۔	۲۷۹
بنو فلاں کے لئے وصیت۔	۲۸۰
فلاں کی اولاد کیلئے وصیت۔	۲۸۰
وَرَثہ فلاں کے لئے وصیت۔	۲۸۱
باب الوصیۃ بالسکنیٰ و الثمرۃ۔	۲۸۲
موصیٰ لہٗ اگر مر گیا۔	۲۸۳
وصیت میں تبدیلی۔	۲۸۳
باغ کے پھل کی وصیت۔	۲۸۵
باغ کی آمدنی کی وصیت	۲۸۵
بھیڑ کے اون، دودھ اور اولاد کی وصیت۔	۲۸۶
باب الوصیۃ الذمّی۔	۲۸۷
باب الوصی وما یملکہ	۲۹۱

مضمون	صفحہ
وصی کو انکار کرنے کا حق۔	۲۹۱
کسی نالائق کو وصی بنانا۔	۲۹۲
خود اپنے غلام کو وصی بنانا۔	۲۹۳
وصی اگر وصیت کی ذمہ داری پوری نہ کر سکتا ہو۔	۲۹۴
دو آدمیوں کو وصی بنانا۔	۲۹۴
اگر ایک وصی مرجائے۔	۲۹۶
وصی میت کا خلیفہ ہے۔	۲۹۶
وصی کے تصرفات	۲۹۷
ترکہ میں وصی کا تجارت کرنا	۲۹۸
وصی، نابالغ ورثہ کے لئے دادا پر مقدم ہے۔	۲۹۸
دو وصی تیسرے وصی کے لئے گواہی دیں۔	۳۰۰
دو بیٹے گواہی دیں	۳۰۰
دو وصی نابالغ ~~وراثت~~ وارث کے لئے گواہی دیں۔	۳۰۰
قرض کی شہادت	۳۰۲
باب الوراثۃ	۳۰۴

مضمون	صفحہ
مسائل میراث کے متعلق اصولی بحث۔	۳۰۴
اصولِ میراث کا خلاصہ، ذوی الفروض وغیرہ کے وجوہِ استحقاق	۳۰۹
استحقاقِ وراثت کا ایک اور اصول	۳۱۴
تعیینِ حصص کا اصول اور آیات متعلقہ فرائض کی تشریح۔	۳۱۵
وصیت کی ضرورت۔	۳۲۰
وصیت کی اہمیت۔	۳۲۲
فقہاء کا نقطۂ نظر۔	۳۲۳
مولانا عبید اللہ سندھی اور ناسخ و منسوخ۔	۳۲۵
آیۂ وصیت اور مولانا سندھی۔	۳۲۸
مرد اور عورت کے حصص میں فرق	۳۳۱
وراثت میں مرد کی برتری عورت پر۔	۳۳۱
علامہ اقبالؒ کی تصریحات	۳۳۲

مضمون	صفحہ
یتیم پوتے کی وراثت کے موافقین ومخالفین ۔	۳۳۶
قائلینِ وراثت کا نقطۂ نظر ۔	۳۳۶
اسلام کا اپنا مزاج ۔	۳۳۶
پوتا بھی ابن ہوتا ہے ۔	۳۴۱
دلیلِ اوّل	۳۴۹
دلیلِ دوم	۳۵۱
یتیم پوتے کو محروم قرار دینے کے لئے کوئی شرعی دلیل نہیں ۔	۳۵۹
تیسری دلیل ۔	۳۶۲
علامہ موسیٰ جار اللہ کی تصریحات	۳۶۴
حجبِ حرمان کے دو اصول ۔	۳۶۹

مضمون	صفحہ
دونوں اصول کے حدود ۔	۳۷۰
دلیل چہارم وپنجم ۔	۳۷۱
دلیل ششم ۔	۳۷۳
قائمِ مقامی ۔	۳۸۱
منکرینِ وراثت کا نقطۂ نظر ۔	۳۸۴
پوتے کا حقِ وراثت (حضرت شیخ الاسلام) مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون ۔	۳۸۵
کتاب الوقف ۔	۳۹۲
وقف علی الاولاد ۔	۴۰۶
اشتہارات	۴۱۳ تا ۴۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا جگر گوشۂ رسول

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی مقدس بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے جن کی ذاتِ گرامی اپنے زہد و اتّقاء اور دُنیوی دولت و ثروت سے بیزاری میں مسلم خواتین کے لئے ایک مینارۂ نور اور سرمایۂ افتخار ہونے کے ساتھ خانوادۂ نبوت میں وہ مظلوم ترین ہستی ہے جن کی کردار کُشی کے لئے خاندانِ رسالت کے دشمنوں نے محبت کے پردے میں طرح طرح کے افسانے اور طرح طرح کی کہانیاں وضع کر ڈالیں، جن سے ثابت کیا گیا کہ وہ معاذاللہ معاذ اللہ دُنیوی مال و منال کی اتنی حریص تھیں کہ پدری میراث کے نام سے زمین کے چند ٹکڑوں کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مقابلہ میں آگئیں اور آنحضرتؐ کی وصیت پوری کرنے والے وفادار خلیفۃ الرسول حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مرتے دم تک کبیدہ خاطر رہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

میں نے اس جلد میں "افسانۂ فدک" کے عنوان سے ان پر

اس قسم کے لگائے گئے الزامات کو بالکل صاف کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ تو اپنے والدِ محترم کے اس وصیت کے عمل کو مثالی قرار دیتی تھیں۔ اسی لئے خود انھوں نے بھی اسی قسم کی وصیت فرمائی۔ لہٰذا وہ اس نبوی وصیت کی اور اس کو نافذ کرنے والے خلیفۃ الرسول کی کیوں مخالفت کرتیں۔ وہ اس قسم کے ناپاک الزامات سے قطعًا پاک اور اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے سے بالکل مطمئن تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو اُمہات المؤمنین کے قدموں میں جگہ عطا فرمائے۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہا وعن اخواتہا وعن سائر الصحابیات اجمعین۔

آمین

اعلاء السنن جلد دوم

حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان تصنیف جس میں حنفی مکتبۂ فکر کے مطابق صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس جلد میں ابوابِ صلوٰۃ سے متعلق احادیث کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ بڑا سائز ۱۹۴ صفحات۔ عربی ٹائپ میں۔ طلبہ اور مدارسِ عربیہ کے لئے خصوصی رعایت۔

قیمت صرف پندرہ روپے۔

عرضِ ناشر

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم :- فقہ القرآن کی پہلی جلد ۱۹۷۳ء میں پیش کی گئی تھی اور اب ساتویں سال ساتویں جلد ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ حق تعالیٰ کا بے پایاں فضل و کرم اور احسان ہی ہے کہ اس نے ادارۂ فکرِ اسلامی کو اس عظیم الشان کام کی توفیق ارزانی فرمائی ورنہ ہم جیسے بے مایہ اور ضعیف البنیان انسانوں کے بس کی یہ بات نہیں تھی۔ اس پر ہم حق تعالیٰ عزّ اسمہٗ کا جتنا شکر بھی ادا کریں کم ہے۔

یہ بھی حق تعالیٰ کا احسان ہی ہے کہ اس نے علمی حلقوں میں فقہ القرآن کو قبولِ عام عطا فرمایا کہ اسکی ابتدائی جلدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ فقہ القرآن جلد سوم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ جلد سوم کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے کیونکہ ادارہ کے پاس اس کی کوئی جلد باقی نہیں رہی تھی اور اس کی فرمائشیں برابر آ رہی ہیں۔ جلد اول اور جلد دوم بھی تقریباً ختم ہیں مگر ان کے دوسرے ایڈیشنز ابھی مالی دشواریوں کی وجہ سے شائع نہیں کیے جا سکے۔ تاہم ادارہ اس کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ اس کا بھی مناسب انتظام فرما دے تو یہ مہم بھی سر ہو سکے۔

فقہ القرآن میں جو کاغذ استعمال ہو رہا ہے اس کی قیمتیں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا ایک ریم جو گذشتہ سال ایک سو اسّی روپے کا تھا امسال دو سو تیس ۲۳۰ روپے کا ملا ہے۔ اس لئے کتاب کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ہماری معذرت قبول فرمائیں گے۔ والسلام

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان

(ایس ایس۔ ایم ڈی۔ ایف سی سی پی امریکہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(تشکر)

مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ

(ترمذی)

میں بصمیمِ قلب سے ادارۂ فکرِ اسلامی کے جملہ اراکین اور خصوصیت کے ساتھ ادارہ کے چیرمین اور صدر جناب محترم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب (ایس ایس ایم ڈی، ایف سی سی پی امریکہ) اور ادارہ کے سکریٹری جنرل جناب مولانا قاری طاہر مکی صاحب کی خدمت میں ہدیۂ سپاس وتشکر پیش کرتا ہوں کہ اول الذکر موصوف کی مالی جدوجہد اور ثانی الذکر کے علمی تعاون اور زرّیں مشوروں سے "فقہ القرآن" جلد ہفتم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

فجزاهما اللہ تعالیٰ خیرالجزاء

آمین

مخلص عمر احمد عثمانی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

میں قرآن کریم کی اس عاجزانہ خدمت کو جو میری نسبت سے انتہائی حقیر اور قرآن کریم کی نسبت سے نہایت ہی عظیم المرتبت ہے، پھر اپنے جدِّ امجد حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ اور اپنے والدِ ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الاستاذ شیخ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ مظاہر العلوم سہارنپور) کے اسماءِ گرامی سے معنون کرنیکی سعادت حاصل کرتا ہوں جن کی دعاؤں، تمناؤں اور آرزوؤں اور توجہاتِ عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی اس خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

پُر تقصیر و ناکارہ

عبدہٗ بن عبادہٖ عمر احمد عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مؤلّف

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا :-

ملّتے را رفت چوں آئیں زدست | مثلِ خاک اجزائے او برہم شکست
ہستیٔ مسلم ز آئین ست و بس | باطنِ دینِ نبیؐ ایں است و بس
تو نمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ | زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم | حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات | بے ثبات از قوّتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے | آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں | حاملِ او رحمۃٌ للعٰلمین

(اسرار و رموز) صـ ۱۳۹ - ۱۴۰

ملّت کے ہاتھوں سے جب آئین جاتا رہا تو خاک کے ذروں کی طرح اس کے اجزا پراگندہ اور منتشر ہو گئے۔ مسلمان کی ہستی آئین ہی سے وابستہ تھی، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کا مغز یہی ہے۔ تو جانتا نہیں کہ تیرا آئین کیا ہے۔ آسمان کے نیچے تیری قوت و شوکت کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب، قرآنِ حکیم ہے جس کی حکمت لا فانی اور قدیم ہے۔

وہی تکوینِ حیات کے اسرار کا نسخہ ہے جس کی قوت سے ہر فانی کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ میں نہ شبہ ہو سکتا ہے نہ تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس کی آیات شرمندۂ تاویل نہیں ہو سکتیں۔ یعنی نوعِ انسانی کے لئے آخری پیغام جس کے علم بردار "رحمۃ للعٰلمین" صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فقہ القرآن، ایک نہایت حقیر اور ادنیٰ سے اسی کوشش کا اظہار ہے کہ فقہ اور فقہائے کرام (شکر اللہ سعیہم) کی کاوشوں کا قرآن حکیم کی روشنی میں جائزہ لیا جائے کہ زمانہ کی تبدیلیوں سے (کیونکہ زمانہ جامد و ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے) ان میں کسی تبدیلی یا نئی تشریح و تعبیر کی ضرورت تو لاحق نہیں ہو گئی کیونکہ خود فقہائے کرام کے ارشاد کے مطابق علم و آگہی کے نت نئے انکشافات سے حیاتِ انسانی کے وہ بہت سے اسرار و رموز جو پہلے سربستہ تھے آج واشگاف ہو گئے اور زندگی کے بہت سے تقاضے زمانہ کی نیرنگیوں کے ساتھ تبدیل ہو گئے ہیں۔

فقہائے کرام کا یہ ارشاد عقل و نقل کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا بیان ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (۴۱/۵۳)

ہم دنیا میں اور خود لوگوں کے نفوس میں اپنی
نشانیاں مستقبل میں دکھاتے چلے جائیں گے
حتیٰ کہ ان پر واضح ہو جائیگا کہ قرآن ہی حق ہے۔

حق تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ کائنات میں اور انسانی نفوس میں تدریجی طور پر حق تعالیٰ کی آیات اور نشانیاں مُنَصَّۂ شہود پر آتی رہینگی حتیٰ کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہوتی چلی جائے گی کہ قرآنی حقائق ہی حق ہیں۔ بہت سی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو ہمیں کل معلوم نہیں تھیں لیکن آج معلوم ہوگئیں، نیز ہزار ہا ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو آج ہمیں معلوم نہیں ہیں لیکن وہ ہمیں کل کلاں کو معلوم ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ کائنات کسی ایک نقطہ پر ٹھہر نہیں گئی ہے بلکہ وہ درجہ بدرجہ ارتقائی مدارج طے کرتی جا رہی ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۸۴/۹)

تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ضرور بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

یعنی تم مختلف طبقات میں سے گزرتے ہوئے اوپر کو چڑھتے، یعنی ارتقائی مدارج طے کرتے چلے جاؤ گے۔ یعنی انسانیت (HUMANITY) تہ در تہ اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی۔ تاریخ ان ہی تہوں کے ریکارڈ کا نام ہے

انسانیت میں جوں جوں ارتقائی تبدیلیاں آتی چلی جا رہی ہیں

انسانی زندگی کے تقاضے بھی بدلتے چلے جا رہے ہیں ۔ اب سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ وحی پر مبنی جب ایک پیغام اپنی معنویت کھو دیتا یعنی اس کی تفاصیل موجودہ دور کے تقاضوں کا حل پیش نہ کر سکتیں یا اپنے بنیادی اصول و مبانی میں تحریف و تصحیف سے بے معنی ہو جاتیں تو وحی کا ایک نیا پیغام اس کی جگہ لے لیتا تھا ۔ پیغمبروں کے بعد نئے نئے پیغمبر آتے چلے جانے کی بنیادی وجہ یہی تھی ۔ قرآن کریم کے بعد کسی نئی وحی کے آنے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور نبوت کا سلسلۃ الذہب مکمل ہو چکا ۔ اب کسی نئے نبی کے آنے کا راستہ ہی مسدود ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنا آخری پیغام اس انداز سے بھیجا ہے کہ وہ انسانی تقاضوں کی لمحظہ بلحظہ تبدیلیوں کا برابر ساتھ دیتا چلا جائے گا یعنی قرآنِ کریم کے الفاظ کی تعبیرات زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائینگی ۔

ایک مثال

قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ($\frac{8}{60}$)

اور ان (دشمنوں) کے لئے جتنی قوت تم سے ہو سکے تیار رکھو اور گھوڑوں کے رسالے بھی باندھے رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں

کو مرعوب اور خوف زدہ رکھ سکو۔

قرآن کریم کے ان الفاظ خصوصًا قُوَّۃٌ کی تفسیر و تعبیر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور گھوڑ سواری تھی۔ لیکن خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں ذرا آگے چل کر منجنیق اور دبّابے اور خندق وغیرہ اس کی تفسیر بن گئے۔ اور ہر زمانہ میں اسلحہ سازی کے ارتقاء کے ساتھ اس کی تفسیریں بدلتی رہیں۔ تاآنکہ آج اس قوّت کی تفسیر ایٹم بم۔ میزائلز۔ ہوائی جہاز۔ بمبار طیارے۔ ٹینک اور طرح طرح کے گیسز نے لیلی ہے۔ اگر آج کوئی پہلی ہی تفسیر پر اصرار کرے تو وہ قومی خودکشی کا مجرم سمجھا جائیگا۔

سنن ابو داؤد کی ایک مشہور روایت ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یبعث لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ علٰی رَأْسِ کُلِّ مِئَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُجَدِّدُ لھا دِیْنَھَا ۔

(اول کتاب الملاحم سنن ابو داؤد)

حق تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کی ابتداء میں ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا جو امت کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔

اس حدیث میں مَنْ یُجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا کے الفاظ قابل غور ہیں۔ کیونکہ تجدید دین اسے نہیں کہہ سکتے کہ دین کی پرانی باتوں کو دوبارہ نافذ کر دیا جائے یا مردہ اور فرسودہ امور کو دوبارہ

زندہ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کے لئے عربی زبان میں اِحیَاء اور اِعَادَۃٌ کے الفاظ موجود ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی

مَنۡ اَحۡیٰی سُنَّتِیۡ مَیۡتَۃً فَلَہٗ اَجۡرُ شَہِیۡدٍ

جو میری کسی مردہ سنت کو زندہ کرے اسے ایک شہید کا ثواب ملے گا

میں اس کیلئے اِحیاءٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسیطرح سورہ بروج میں ہے

اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ اِنَّہٗ ھُوَ یُبۡدِیٴُ وَیُعِیۡدُ (۸۵ / ۱۲-۱۳)

بے شک تیرے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔ وہی ابتداءً کوئی چیز کرتا ہے اور وہی اسے دوبارہ واپس لاتا ہے

اس آیت کریمہ میں پرانی چیزوں کو دوبارہ واپس لانے کیلئے اِعَادَۃٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

تجدید کے معنے یہی ہیں کہ پرانی باتوں کو نئے (جدید) پیکر مہیا کئے جائیں۔ جدّت طرازی اور نیاپن تجدید کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا تجدید دین کے لئے بنیادی بات یہی ہے کہ دین کی باتوں کی جدید تشریح و تعبیر کی جائے۔ زمانہ چونکہ جامد نہیں ہے وہ متحرک ہے اور برابر ارتقائی مدارج طے کرتا جارہا ہے اور ہر آن نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں لہذا زمانہ کی نت نئی ضرورتوں

اور تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جدید تعبیریں، جدید تشریحیں اور نئی نئی تفسیریں ایک ناگزیر ضرورت ہیں۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور کتنی ہی ارتقائی منازل طے کر لے وہ برابر اس کا ساتھ دیتا چلا جائیگا۔

ہم آج یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کل کلاں کو زمانہ کے تقاضے کیا ہوں گے۔ اسی طرح ہمارے پہلے بزرگانِ دین بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آئندہ آنے والے زمانے کی ضروریات اور تقاضے کیا ہوں گے۔ ہر زمانہ کے صاحبانِ فکر و نظر ہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھ سکیں۔ اس میں نہ پرانے عہد کے علماء کا کوئی نقص ہے اور نہ آئندہ عہد میں آنے والوں کا کوئی کمال ہے۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ تجدید دین کا کام نہایت دیانتداری اور خلوص نیت کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اگر نیت میں فتور ہو اور جاہ پرستی اور شہرت پسندی مطمح نظر ہو تو ظاہر ہے کہ ایسی عبادت و ریاضت بھی بارگاہ الٰہی میں قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

ہمارے علمائے کرام قرآن کریم کی جدید تعبیرات کی ہر زمانہ میں مخالفت کرتے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا یہ طرز عمل بھی ایک حد تک ضروری اور مفید ہے۔ کیونکہ یہ مخالفت درحقیقت نارواتجدید پسندی کے لئے ایک مفید

روک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا چیک بھی ضروری ہے ورنہ اگر بے روک ٹوک تجدید پسندی کی اجازت دیدی جائے تو غیر محتاط تجدید پسند اسلام کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھدیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ روک ٹوک بھی علمی ہو۔ مخالفت برائے مخالفت ہی نہ ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے علماء کی بیشتر مخالفتیں علمی اور سنجیدہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کی تنقیدیں طعن اور طنز اور سنت نئے خطابات پر مشتمل ہوتی ہیں اور جدید تشریح و تعبیر کرنے والوں پر طرح طرح کے لیبل چسپاں کر دینے پر متضمن ہوتی ہیں جو افسوسناک صورت حال ہے جس سے اجتناب برتنا چاہئے۔

اس جلد کا موضوع وراثت و وصیت ہے۔ لہٰذا موضوع کی مناسبت سے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے والد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کا وصیت نامہ ہو بہو نقل کر دوں جس سے قارئین کرام وصیت کے متعلق ان کے آخری نقطۂ نظر کا بھی اندازہ فرما سکیں گے۔

وصیت نامہ کا پس منظر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے کلیم کے سلسلہ میں کچھ اراضی ٹنڈو آلہ یار میں ملنی تھی۔ لیکن کافی عرصہ تک زمین پر ہندو مالک کا نام چڑھا رہا اور کاغذات میں نام کی تبدیلی نہ ہو سکی۔ اس کے لئے قانونی کارروائی ہوتی رہی اور وفات سے چند روز پہلے کاغذات میں نام کا اندراج ہو سکا۔ نام درج

ہونے سے پہلے وہ کوئی تصرف نہیں کر سکتے تھے۔ نام درج ہوا تو وہ مرض الوفات میں مبتلا ہو کر بغرض علاج میرے پاس کراچی تشریف لے آئے۔ وہ مجھے بتا بھی نہ سکے کہ نام کا اندراج ہو گیا ہے۔ البتہ کاغذات ان کے بکس میں موجود تھے جو انکی وفات کے بعد مجھے دیکھنا نصیب ہوئے۔ ٹنڈو آلہ یار میں ان کے ڈیکس میں ان کا ایک وصیت نامہ محفوظ تھا جو برادرم محمد مرتضیٰ عثمانی سلمہٗ (فاضل درس نظامی، ایم اے) نے کافی دن کے بعد مجھے بھیجا جو درج ذیل ہے[۵]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وصیّت نامہ

حامداً وَمُصَلِّیاً وَمُسَلِّماً: امابعد یہ میری وصیت ہے اپنی اولاد[۶] کو اور جملہ اعزہ کو

---

[۵] یہ خالص ایک ذاتی اور خانگی معاملہ ہے جسے میں یہاں درج کر نیسے پہلے کئی دن تک سوچتا رہا کہ اسے شائع کرنا مناسب ہوگا یا نہیں لیکن کافی سوچ بچار کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اسے شائع کر دینا بہتر ہوگا کہ یہ محفوظ ہو جائے اور ریکارڈ پر آجائے۔

[۶] حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی رحمۃ اللہ حنفی ہونیکے ساتھ ساتھ بقول مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اپنے وقت کے امام محمدؒ تھے۔ مولانا مرحوم اپنے وصیت نامہ میں ورثا ہی کیلئے وصیت فرمارہے ہیں جسکا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ورثا کیلئے وصیت کو جائز سمجھتے تھے۔ (باقی بر صـ ۲۵)

(۱) میرے ذمے حسب ذیل حضرات کا قرض ہے (گو یہ قرض انکا دیا ہوا نہیں مگر میں اس کو اپنے اوپر قرض ہی سمجھتا ہوں) مولانا ولی محمد صاحب بٹالوی کی بیوی بچوں کے لئے دو سو روپے۔ مولوی کرم الٰہی صاحب مدیر محلہ اشراف الرحمٰن۔ امام پورہ چک ۹۹ شاہ کوٹ ضلع شیخوپورہ پنجاب ایک سو روپیہ۔ میری دوسری بیوی مسماۃ حفیظہ خاتون مرحومہ کے بچوں کو ساڑھے سات سو روپئے بقاعدہ شرعیہ دیدیا جاوے۔ انھوں نے مہر معاف کیا تھا یا نہیں، یاد نہیں۔ اس لئے یہ رقم ان کے بچوں پر تقسیم کردی جائے۔ مولوی اسعد اللہ صاحب رامپوری ناظم حال مظاہر علوم سہارنپور۔ سو روپئے۔ حافظ مجیب الرحمٰن ڈھاکہ کے ورثہ کو سو روپئے۔ ان کا پتہ جامعہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ سے معلوم ہو جائے گا۔

حسب ذیل لوگوں پر میرا روپیہ ہے۔

(۱) یعقوب ملا کو پانچ سو روپئے دکان میں لگانے کیلئے دیئے ہیں، چھوٹے گھر والوں کی طرف سے۔

(۲) شیر بہادر صاحب کو جن سے شبیر احمد صاحب گھی مرچنٹ حیدرآباد واقف ہیں چار ہزار روپیہ دیا ہے بس میں شرکت کے لئے جس میں چوتھائی چھوٹے گھر والوں کا ہے۔ تین چوتھائی

(بقیہ از ص۱۹) اس صورت میں ان کا یہ عمل ہمارے لئے تائید کا باعث ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انھیں اپنی اولاد پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنی رضا و رغبت سے ان کی وصیت کو ضرور عملی جامہ پہنائیں گے۔ (گو ایسا نہ ہو سکا)

محمد مرتضیٰ سلمہٗ کا ہے۔

(۳) حبیب بینک مولوی بازار۔ ڈھاکہ میں میری کچھ رقم جمع ہے جو شاید بیس پچیس روپئے ہوگی۔ اسی طرح حبیب بینک کراچی میں تھوڑی سی رقم ہوگی۔ ڈاک خانہ ٹنگ وآلہ یار میں پانچ سو روپئے سے کچھ اوپر ہے نیشنل بینک ٹنڈو آلہ یار میں چار سو روپئے کے قریب ہے۔

(۴) آدم جی جوٹ مل ڈھاکہ میں میرے سات شیئر ہیں۔ جو قرضہ وصول ہوتا جائے گا اس کو قلم زد کر دیا جائے۔

(۵) دِہ ناہیکی میں ساٹھ ایکڑ اور دِہ ڈھنڈ شاہ میں دس ایکڑ زمین مولوی عمر احمد کی زمین کے ساتھ ہے اور چار ہزار روپئے مولوی عمر احمد کے ذمے سرکار کا سود تھا وہ بھی میں نے اپنی کلیم کاپی سے کٹوا دیا ہے۔ اس کے حصہ کی زمین بھی ڈھنڈ شاہ میں لینی ہے۔ اس زمین میں سے پچیس ایکڑ چھوٹی بیوی[۱] کا ہے۔ باقی محمد مرتضیٰ سلمہٗ کا ہے۔

(۶) ایک سو[۲] ایکڑ کے قریب یعنی کچھ زیادہ ٹنڈو باگو کے پاس

---

[۱] چھوٹی بیوی کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس لئے مولانا قدرتی طور پر ان کے مستقبل کے متعلق فکر مند ہیں۔

[۲] یہ زمین حضرت مولانا رحمہ نے قیمتہً خریدی تھی لیکن وہ اس کی اقساط ادا نہیں فرما سکے۔ اس کی اقساط کے تقاضے آتے رہے۔ مگر ہم نے بھی اس کی اقساط ادا نہیں کیں۔ بالآخر وہ کینسل ہوگئی۔

موضع پنولوبیں ہے جو محمد سرور صاحب صدیقی کو معلوم ہے۔ اس میں سے کچھ زمین جو نصف سے کم ہے محمد سرور صاحب کو اس شرط پر دینا کی تھی کہ وہ زمین کو آباد کریں گے۔ مگر انھوں نے تین سال گذر گئے اب تک آباد نہیں کی اسلئے اب ان کو شرکت کا حق نہیں ہے۔ لیکن وہ اگر جھگڑا کرے تو اس کو اس کا حصہ دے کر جو زمین بچے اس میں سے دس ایکڑ چھوٹی بیوی کو دے کر باقی زمین محمد مرتضیٰ سلمہٗ کو دی جائے میں کوشش کر رہا ہوں کہ میرے سامنے ہی تصفیہ ہو جائے۔

(۷) ایک گھر[۵] میرے نام جمشید روڈ بہار کالونی نمبر ۲/۱ کراچی ۵ میں ہے۔ اگر دونوں گھر والے اس میں رہنا چاہیں تو دونوں اس میں

---

۵ اس مکان کے متعلق حضرت مولانا عثمانیؒ نے ۲ جون ۷۴ء کو اپنی چھوٹی صاحبزادی کو جو بیوہ ہو چکی تھی ایک خط تحریر فرمایا تھا جس میں یہ مکان ان کے نام کر دینے کا ذکر ہے۔

یہ گرامی نامہ وصیت نامہ کے چھ ساڑھے چھ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ یعنی حضرت مولانا نے اس خط کے ذریعہ وصیت نامہ میں ترمیم فرمادی تھی۔ یہاں یہ عرض کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ یہ صاحبزادی ڈھاکہ میں مقیم تھی۔ بنگلہ دیش بنجانے کے بعد وہ بہ ہزار دشواری مغربی پاکستان آسکی۔ اس کے شوہر مرحوم کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ڈھاکہ میں انکی اچھی خاصی کوٹھی اور کاروبار تھا۔ وہ کچھ بھی ساتھ نہ لا سکی۔ مغربی پاکستان آجانیکے بعد وہ نہایت ہی پریشان تھی۔ چھوٹے چھوٹے یتیم بچے تھے۔ اسلام آباد میں کرایہ پر مکان میں قیام تھا جو مالکانِ مکان جب چاہے خالی کرا لیتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت مولانا کو اپنی وصیت میں ترمیم فرمانا پڑی۔

رہائش اختیار کرلیں۔ تین حصے کر کے ایک حصہ چھوٹی بیوی کو، دو حصے بڑی بیوی والدہ مرتضیٰ سلمہٗ کو دیا۔ دیئے جائیں کہ وہ صاحب اولاد ہیں اور اگر فروخت کرنا چاہیں تو اسی نسبت سے قیمت بانٹ لیں۔

(۸) ٹنڈوآلہ یار دارالعلوم کے جس مکان میں میرا قیام ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک میں بڑی بیوی اور ان کے بچے رہتے ہیں۔ دوسرے میں چھوٹی بیوی رہتی ہیں۔ دونوں گھروں میں جو برتن۔ پلنگ، تخت۔ کرسی ہیں وہ اسی بیوی کے ہیں جو مکان میں رہتی ہیں اور جو کپڑے زنانے ہیں وہ بھی اسی بیوی کے ہیں جو مکان میں رہتی ہیں۔ چھوٹی بیوی کے مکان میں میرے دو بکس ٹین کے ہیں اور ایک کالا بیگ اور ایک چمڑے کا سوٹ کیس ہے ان میں میرے کپڑے ہیں۔ یہ تینوں لڑکے باہم تقسیم کرلیں۔ چھوٹے گھر میں جو کتابیں ہیں وہ بھی سب میری ہیں۔ ایک قرآن چھوٹی بیوی کا ہے مولانا شیخ الہند کے ترجمہ کے ساتھ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تفسیر کا حامل ہے۔ باقی قرآن اور کتابیں سب میری ہیں۔ ان میں جو کتابیں عورتوں کے مناسب ہیں جیسے بہشتی زیور وغیرہ۔ وہ دونوں گھر والوں کو دیدی جائیں۔ بقیہ کتابیں تینوں لڑکے باہم تقسیم کرلیں۔ میری کچھ کتابیں دارالعلوم کے دفتر میں اور لوہے کی الماری میں بھی ہیں اور لوہے کی الماری میں دو بٹوے چمڑے کے ہیں۔ ان میں جو رقم ہو وہ میری ملکیت ہے۔ حصہ رسد موافق شرع تقسیم کرلیں۔ میری جانمازوں میں

ایک موٹی سی جانماز سیاہی مائل جامع مسجد دارالعلوم میں دیدی جائے کہ امام اس پر کھڑا ہوا کرے۔

(۹) چھوٹی بیوی کا مہر ادا ہو چکا ہے۔ بڑی بیوی کا بھی آدھے سے زائد دے چکا ہوں۔ ان کا مہر گیارہ سو روپئے تھا اس لئے پانچ سو روپئے نقد ان کو دیدیا جائے۔ اسکے بعد ترکہ تقسیم کیا جائے۔

(۱۰) میں نے حتی الامکان دونوں بیویوں میں برابر نان و نفقہ کا خیال رکھا ہے۔ جب بڑی بیوی نے اپنی بیماری کا عذر کرکے کہدیا کہ آپ کھانا چھوٹے گھر کھائیں تو میرا طعام و قیام چھوٹے گھر رہنے لگا۔ مگر شاید بعد میں یہ ان پر گراں ہوا ہے جس کو وہ ظاہر نہ کرسکیں اس لئے میں ان سے معافی چاہتا ہوں۔ اگرچہ وہ خود اپنے حق سے دستبردار ہوئی ہیں پھر بھی میں معافی کا خواستگار ہوں تاکہ آخرت کی باز پرس سے محفوظ رہوں۔

آخر میں سب کو وصیت کرتا ہوں کہ اعمال صالح کی پابندی کریں۔ دنیا سے دل نہ لگائیں۔ آخرت سے دل لگائیں۔ دنیا ہمارے واسطے پیدا ہوئی ہے اور ہم آخرت کے واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد رکھیں کہ بڑی دولت ہے اور نماز، روزہ تلاوت قرآن، اور درود شریف اور استغفار کی کثرت رکھیں اور مجھے دعاء و ایصال ثواب سے یاد رکھیں کم از کم تین

بار قل ھو اللہ اور ایک بار سورۂ یٰسٓ پڑھ کر بخشا۔ یا کریں۔
اور بقر عید میں ایک حصّہ قربانی کا میری طرف سے کر دیا کریں

والسلام

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ ۱۶ شعبان ۱۳۸۸ھ یوم الجمعہ

یہ ہے والد محترم حضرت شیخ الاسلام مرحوم کا وصیت نامہ جس سے وصیت کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے افسوس ہم ان کے اس وصیت نامہ پر عمل نہ کر سکے کیونکہ وارثین کی اکثریت مروجہ اصولِ وراثت کے مطابق فیصلہ چاہتی تھی، حضرت مرحوم کی وصیت نامے کے مطابق نہیں جس کا مجھے انتہائی قلق اور افسوس ہے۔

میں بہ ہزار دشواری صرف مکان کے سلسلہ میں ان کی خواہش کے مطابق وہ مکان چھوٹی صاحبزادی کو دلوا سکا جس کے لئے مجھے اپنی جیب سے بھی کئی ہزار روپے ان وارثین کو دینے پڑے۔

بہر حال میں صرف اتنا ہی کر سکا کہ قبلہ والد صاحب کے ترکہ میں سے خود کچھ نہ لوں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس میں وصیت کے خلاف حصہ بٹانا جائز نہیں تھا۔

تعارف کتاب

از عالی مرتبت جسٹس قدیر الدین احمد صاحب مدظلہٗ

میرے عزیز دوست ایک مسلمہ ذی علم شخصیت اور ماہر قانون جناب خالد اسحاق صاحب نے فرمائش کی ہے کہ میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کی کتاب فقہ القرآن کی ساتویں جلد کے متعلق جس کا مضمون وصیت اور وراثت ہے تعارفی کلمات تحریر کروں ۔ اِس فرمائش کو پورا کرنے کے لئے میں نے ساتویں جلد کا مطالعہ کیا بلکہ اس سے پہلے کی چھ جلدوں کو بھی دیکھا تو مجھے یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ فقہ القرآن کا مقصد ایک عظیم خدمت کی انجام دہی ہے اور ایک ایسے خیال کی تائید ہوئی ہے جو بار بار میرے دل و دماغ پر چھا چکا تھا لیکن میں اپنی کم بضاعتی کے سبب اس طرف توجہ نہیں دے سکا تھا وہ خیال یہ تھا کہ ہمارے پاس ایک فرقے کی فقہ تو موجود ہے لیکن ایسی فقہ میسر نہیں ہے جو فرقہ وارانہ ترجیحات سے بلند تر ہو اور خالص اسلامی فقہ کہلائی جا سکے ۔

اس کمی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ایسے مسلمان ہی شاذ و نادر ہیں جن کا تعلق کسی فرقہ سے نہ ہو ۔ جو اصحاب فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تحریریں بھی ان کے فرقوں ہی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

بس ایک ہی دینی کتاب ہمارے پاس ایسی ہے جو فرقوں کے اعتقادات اور خیالات سے ممتاز اور بالاتر ہے اور وہ ہے کلام اللہ۔ اس عظیم کلام کے علاوہ ہمارا سارا دینی علم محدثین، فقہار، علمار اور مفتیان کی ذاتی بصیرت اور ترجیحات سے علی الاعلان متاثر ہے اور اس طرح ان کے مذاہب سے متعلق ہے یہ صحیح ہے کہ ان کی بصیرت اور ترجیحات کا اثر کلام پاک کی تفاسیر میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ ہر ایک تفسیر اسی مفسر کے رجحانات، ترجیحات اور طرز تفکر کا عکس ہوتی ہے جو اسے مرتب کرتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص اسلامی فقہ کی تشکیل صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ براہ راست کلام اللہ پر انحصار کیا جائے۔ چنانچہ مولانا عمر احمد عثمانی صاحب نے یہی راہ اختیار کی ہے اور وہ بھی احتیاط کے ساتھ۔

ایک احتیاط تو مولانا موصوف نے یہ کی ہے کہ کلام پاک کے علاوہ جو دینی علم اہل اسلام کو حاصل ہے اسے چھوڑنا نہیں ہے بلکہ ان کی تجویز یہ ہے کہ

(۱) پہلے تو فقہ اسلامی (کسی خاص فقہ کو نہیں بلکہ تمام ائمہ کی فقہ) کو سامنے رکھ کر وہ حصّہ یکجا مرتب کر لیا جائے جو صرف قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے۔

(۲) پھر اس کے بعد فقہ کا وہ حصّہ مرتب کر لیا جائے جو تعامل و اجماع (سنتِ جامعہ) سے ثابت ہوتا ہے۔

(۳) اس کے بعد وہ حصہ رہ جائے گا جو اخبار دیا اجتہادات

ائمہ پر مشتمل ہے اور ان دونوں عنوانات پر بہت سی کتب
تصنیف ہو چکی ہیں "

صاحب موصوف نے اب تک جتنی جلدیں تصنیف و تالیف کی ہیں معہ زیر نظر ساتویں جلد کے یہ سب پہلے مرحلے کے اجزا رہیں یعنی اس فقہ کے جو صرف قرآن مجید سے ثابت ہو۔

یہاں یہ بات بیان کر دینا ضروری ہے کہ خود مؤلف اور اُن کے بزرگوں میں جیسے مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب حنفی مذہب کے پیرو ہی نہیں بلکہ رہبروں میں شمار ہوتے رہے ہیں ۔ اِن حالات میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کیلئے حنفی اعتقادات سے متاثر نہ ہونا اسی حد تک ممکن ہے جس حد تک انسا اپنی کوشش سے اس قسم کے تاثرات سے بچ سکتا ہے اپنی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی جج سو فیصدی انصاف نہیں کر سکا کیونکہ اس کے تحت الشعور میں کچھ رجحانات ہوتے ہیں جس کے زیر اثر وہ رہتا ہے مثلاً اس کو بعض وضع کے گواہ قابل اعتبار معلوم ہوتے ہیں اور بعض قسم کے خیالات کو وہ صحیح محسوس کرتا ہے یہ قول درست ہے لیکن جب انسان اپنے تحت الشعور کے اثرات سے متنبہ ہو جائے اور ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے تو یہ کیفیت اُس صورت حال سے مختلف ہو جاتی ہے جس میں انسان یا تو اپنے پوشیدہ رجحانات سے بے خبر ہو یا اُنکی طرف داری ہی کو حق اور فرض شناسی سمجھتا ہو ۔ اس طرح ان رجحانات سے بچنے کی بجائے اُس طرف جھکنے کو سعادت جانتا ہو۔

میری رائے میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب اپنی اس کوشش میں "قبل از تحقیق" ان کے جو رجحانات تھے ان سے متاثر نہ ہوں دو مسائل میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں ایک اس مخالفت میں کہ وصیت کو وصیت کرنے والے کی ایک تہائی ملکیت تک محدود کردیا جائے اور کسی وارث کے حق میں دوسرے وارثوں کی اجازت کے بغیر اپنی ملکیت میں سے کچھ دینے کی وصیت نہ کرسکے دوسرے اس مخالفت میں کہ یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کردیا جائے۔ مولانا موصوف نے وراثت میں حصص کے تعین کا فلسفہ اور مرد اور عورت کے ورثے میں فرق ہونے کی توجیہہ بھی باب وراثت میں بیان فرمائی ہے اِن دونوں قسم کے احکام کی بنیادوں کو نمایاں کرنیکی کوشش کی ہے اُن کی تحقیق کے مطابق سب سے بڑی بنیاد قبائلی زندگی کے لوازمات ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ایک عنوان ہے "وراثت میں مرد کی برتری عورت پر" اس کے ماتحت صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ

"یہ بات کہ ایک منزلہ کے ورثا میں مرد کا حصہ عورت سے ڈبل رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان کی حمایت اور قبیلے کی طرف سے مدافعت کا فریضہ مرد ہی انجام دیتا ہے عورتوں پر اس انداز کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ مرد پر عام مصارف زندگی کو برداشت کرنے کا بار بھی ہے جبکہ عورت ان مصارف سے آزاد ہے"

اگر غور سے دیکھا جائے تو مندرجہ بالا دونوں وجوہ کا تعلق ایسی قبائلی زندگی سے نظر آتا ہے جس میں زمینداری یا جاگیرداری کا عنصر موجود ہے مولفِ کتاب نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے حصہ دوم میں سے ایک طویل اقتباس بھی پیش کیا ہے اُس میں تحریر ہے کہ

"منجملہ اصول وراثت کے ایک یہ ہے کہ مرد کو عورت پر ترجیح دی جاتی ہے بشرطیکہ وہ دونوں ایک ہی درجہ میں ہوں اس کا فلسفہ یہ ہے کہ حقوق کی حفاظت اور حمایت مردوں ہی کا کام ہے دوسرے یہ کہ مردوں کو کئی ایک موقعوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور وہ ہمیشہ مصارف کے زیر بار رہتے ہیں"

اُسی اقتباس میں آگے چل کر یہ بھی تحریر ہے کہ

"ماں جائے بھائی چونکہ بلحاظ نسبت دوسری قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے باوجود مرد ہونے کے بھی اُن سے یہ توقع نہیں کہ وہ ایسے بھائی کی حمایت کے فرائض ادا کریں گے جو دوسری قوم سے ہے اس بنا پر ان کے اور ان کی بہنوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ یا الفاظ دیگر مرد کو عورت پر ترجیح دینے کا اصول جاری نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں چونکہ ان کی وجہ قرابت صرف ماں کا رشتہ ہے اس لئے ان سب بھائی بہنوں کو عورت کی حیثیت دی گئی"

مندرجہ بالا تصریحات میں مرد کے ساتھ عورت کی نسبت بہتر سلوک کرنے کے جو اسباب واضح کئے گئے ہیں ان کا وجود ہر ملک ہر زمانے اور ہر قوم کے حالات میں نہیں پایا جاتا۔ خصوصاً اُن قوموں اور ملکوں میں اُن کا ظہور نہیں ہوتا جہاں صنعت و حرفت ترقی پاکر زندگی کے طور طریقوں کو بدل دیتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس پہلو پر روشنی ڈالی کہ ہم کو ابھی یہ راز معلوم نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ ان معاملات پر غور و فکر کیا جائے۔ مؤلف نے علامہ اقبال کی تصریحات بھی کتاب زیر نظر میں شامل کی ہیں ان میں سے چند سطریں یہاں پیش کی جاتی ہیں تاکہ دنیا کے بدلے ہوئے حالات کے تقاضے بھی زیر نظر رہیں۔ علامہ اقبال کے اقوال کی مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ فرمایئے۔

(وراثت) کی تہہ میں جو اصول کارفرما ہے فقہار نے اُن پر اتنی توجہ صرف نہیں کی جس کے وہ مستحق ہیں۔ جدید سوسائٹی کی تلخ طبقہ داریت اور کشمکش کے پیش نظر ہم کو غور و فکر کرنا چاہیئے اگر ہم اپنے قوانین کا مطالعہ آنے والے اس اقتصادی انقلاب کی روشنی میں کریں تو اغلب ہے کہ ہماری نظر میں اساسی اصولوں کے ایسے مشہور پہلوؤں دریافت کرلیں جنھیں ہم ان اصولوں کی حکمت پر ایک نئے یقین اور ایمان کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث میں نے دو مقاصد سے کی ہے ایک مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ خیالات کے جس ماحول میں انسان تربیت پاتا ہے اُن سے باہر نکل کر ایک آفاقی نظر پیدا کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ دوسرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مؤلف نے حتی المقدور اُن تصورات کو پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے جن میں نئی وسعتِ نظر کی نشان دہی کی گئی ہے چنانچہ میں نے اوپر جو اقتباسات پیش کئے ہیں وہ خود زیر نظر کتاب ہی میں سے حاصل کئے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ مؤلف وسعت نظری کے قائل ہیں تنگ نظری کے نہیں۔ جو راستہ انھوں نے اپنے لئے مقرر کیا ہے وہ دشوار گزار ہے اور جو منزل متعین کی ہے وہ جدید ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہمارے پاس کوئی فقہ ایسا نہیں ہو جسے ان معنوں میں اسلامی کہا جائے کہ وہ کسی فرقے کی فقہ نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جو دینِ اسلام کی اصل اور بنیاد ہے یعنی کلام اللہ وہ فقہی مسائل کی متعدد بڑی بڑی کتب کی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اہم ترین مسائل کا حل فتاوٰی کے ذریعے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ فتاویٰ فقہاء کے استنباطات ہوتے ہیں آپ فتاوٰی عالمگیری کو ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر ذکر اذکار فقہاء کے اخذ کردہ نتائج کے ہیں۔ کلام اللہ تو بڑی بات ہے احادیث نبوی کا تذکرہ بھی فقہاء کے فتاویٰ کے مقابلے میں بہت کم ہے حوالجات عام طور پر فقہاء کی تصانیف کے ہیں۔ میں نے ایک مضمون بعنوان "اجتہاد کا دروازہ اور راستہ" تحریر کیا

تھا جسے اردو کالج کے شعبۂ تصنیف وتالیف نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا ہے اس مضمون میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مستشرقین تو یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث مصدقہ کو تو آجکل مسلمانوں کی تاریخی کتب میں شمار کرنا چاہئے کیونکہ اس زمانے میں مسلمانوں کا سارا کام فتاوی کی مدد سے چلتا ہے اور فتاوٰی کی بنیاد دیگر فتاوٰی ہوتے ہیں ان کا عام طرز یہ ہے کہ دلائل نہیں دئے جاتے بلکہ ہر فتوٰی کی قدر وقیمت مفتی کی شہرت اور ذاتی توقیر کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فقہ وعلم وفقہ اور فقاہت یا تفقہ ایک ہی چیز نہیں ہیں فقاہت یا تفقہ اُس استعداد اور ان کے استعمال کی قابلیت کا نام ہے جو انسان کو کثیر مطالعہ، غور وفکر، ذہانت اور بصیرت سے میسر آتی ہے۔ وہ استعدلو اور اُس کا استعمال فتاوٰی کے ہر مجموعے سے مختلف چیز ہے فقہ دراصل فقہاء کی اجتہادی آراء ونتائج یا علم کا نام ہے لہذا کتب فقہ کا علم رکھنے والے کو عالم فقہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن فقیہ نہیں کہہ سکتے دونوں میں بڑا فرق ہے محض فقہ کا عالم اس عطار کی طرح ہوتا ہے جو جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے نام تو جانتا ہے لیکن ان کا استعمال نہیں جانتا جبکہ فقیہ کی مثال حکیم وطبیب کی سی ہے جو جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے ساتھ ان کے استعمال کو بھی جانتا ہے۔ فتاوٰی جس طرح عام طور پر لکھے جاتے ہیں اس کی غرض تفہیم نہیں بلکہ دو ٹوک فیصلے صادر کرنا ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ اور بیان کا

مقصد نہ لکھنے والی کی بصیرت کو واضح کرنا ہوتا ہے اور نہ پڑھنے والے میں بصیرت پیدا کرنا ہوتا ہے۔

ان دنوں شریعت بل کا چرچا ہے اور اس کی مخالفت بھی ہورہی ہے در حقیقت یہ مخالفت نہ کلام اللہ کی ہے اور نہ سنت رسول اللہ کی ہے بلکہ دلوں میں خوف یہ ہے کہ اس کے ذریعے اُن علماء کے فتاویٰ کو نافذ نہ کیا جائے جو اہل اقتدار میں اثر رکھتے ہیں۔ دوسرا خوف یہ ہے کہ کہیں ان فتاویٰ کے نفاذ کو ترجیح دینے کا سلسلہ شروع نہ ہوجائے جو بااثر فرقوں کے اعتقادات کے مطابق ہیں۔ اس کا امکان کہاں ہے کہ اس فقہ کا نفاذ ہو جو سب فرقوں کے اعتقاد سے گذر کر براہ راست کلام اللہ سے اخذ کی گئی ہو۔

اِن حالات میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کی یہ دعوت کہ راست کلامِ پاک کے احکام کی طرف آؤ ایک مجاہدہ ہے اس کوشش میں اُن کی کامیابی دنیائے اسلام کے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے باعث فخر اور سعادت ہوگی۔

(قدیرالدین احمد)

کراچی

۱۷ رفروری ۱۹۸۷ء۔

تقریظ

شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

شیخ المرکز القادریہ کراچی ۔ سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ

(مولانا مرحوم نے یہ تقریظ تیسری جلد کے لئے لکھی تھی ۔ اور اسی زمانہ میں "فقہ القرآن پر تبصرے" نامی ہمارے کتابچہ میں شائع بھی ہو گئی تھی مگر حیرت ہے کہ فقہ القرآن کی کسی جلد میں اب تک درج نہ ہو سکی ۔ مولانا مرحوم کی اس مفصل تقریظ کا حق تھا کہ فقہ القرآن کی کسی جلد میں محفوظ کر لیا جائے ۔ اس لئے اسے یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔)

امام ابن تیمیہ حنبلیؒ نے رائے دی تھی کہ چاروں فقہ ـــ حنفیؒ مالکی ، شافعی اور حنبلی ـــ کو ملا کر ایک نئی جامع فقہ تیار کرنی چاہیئے اور معلوم نہیں کتنے علماء نے یہی ضرورت محسوس کی ہو گی اور کہی بھی ہو گی ، پھر ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور میں یہی تجویز حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ نے اپنی پہلی تقریر میں بھی فرمائی ۔ یہ پوری تقریر سر سیدؒ نے اپنے اخبار تہذیب الاخلاق (مؤرخہ یکم محرم ۱۳۱۳ھ) میں شائع کی ۔ اس میں صرف فقہ ہی نہیں بلکہ تاریخ و تصوف اور دیگر علوم پر بھی نظر ثانی پر زور دیا گیا تھا ۔ پھر کچھ عرصہ بعد علامہ اقبالؒ نے کہا کہ "وہ شخص اس دور کا مجدد ہو گا جو مسلمانوں کے لئے ایک جدید فقہ مرتب کر دے" قیام پاکستان کے بعد راقم الحروف نے بھی یہ سوال بار بار اٹھایا ، محض زبانی نہیں بلکہ بہت سے معاشرتی ۔ سیاسی ، تاریخی ، ازدواجی ، اور دوسرے فقہی مسائل پر بلا خوف لومۃ لائم اپنی آزادانہ رائے شائع کر دی جس کے عوض ایک ساتھ دعائیں بھی لیں اور گالیاں بھی ۔

مگر آج غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ علامہ اقبال کی آرزو کی تکمیل حضرت علامہ عمر احمد عثمانی (ابن شیخ الحدیث علامہ ظفر احمد تھانوی) کی شکل میں ابھر رہی ہے ۔ اور انشاء اللہ

یہی خواب اقبال کی تعبیر ثابت ہوں گے۔

مولانا عثمانی نے فقہ القرآن لکھ کر کیا چیز پیش کی ہے اسے سننے سے پہلے ایک ضروری بات سُن لیجئے۔

سیدنا معاذؓ کو جب آنحضورؐ قاضی یمن بنا کر بھیجنے لگے تو پوچھا! تم کس چیز سے فیصلے کرو گے؟ عرض کیا! کتاب اللہ (قرآن کریم سے پھر سوال کیا کیا؛ فان لم تجد؟ (اگر وہاں نہ ملے) عرض کیا فبسنۃ رسول اللہ (پھر سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا) ارشاد ہوا اگر وہاں بھی نہ ملے؟ عرض کیا! تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا — سیدنا معاذؓ کے جوابات سے آنحضورؐ کو اتنی خوشی ہوئی فرمایا، اس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے فرستادہ (قاضی) کو اس بات کی توفیق بخشی جسے وہ پسند فرماتا ہے اور جس سے وہ راضی بھی ہے۔

یہ حدیث نبویؐ تمام مسلمان ججوں اور علمائے دین کے لئے فیصلے اور فتوے کی ایسی لازوال بنیاد مہیا کرتی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے جو قیمتی نکات حاصل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں

(۱) کتاب اللہ کو بہر حال اولیت دینی واجب ہے اس میں زندگی کے لئے تمام ضروری ہدایات موجود ہیں لیکن یہ عین ممکن ہے کہ بعض نکات تک نظر کی رسائی نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں سنت میں اسے تلاش کرنا چاہئے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بعض نکات سنت میں بھی نہ ملیں۔ اس صورت میں اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔

(۲) اجتہاد اس وقت کیا جائے گا جب سنت میں مطلوبہ ہدایت نہ ملے اور سنت کو اس وقت دیکھا جائے گا جب مسئلہ قرآن میں نہ ملے۔ اگر قرآن ہی میں مسئلہ مل جائے تو سنت کو دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر سنت میں مسئلہ مل جائے

تو اجتہاد کی کوئی حاجت نہیں۔ (مگر ہمارا طرزِ عمل کچھ ایسا ہے کہ قرآن سے پہلے حدیث کو حدیث سے پہلے فقہ کو دیکھتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ اپنے امام کے اجتہاد کے سامنے سنت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور سنت کے سامنے قرآن سے بے پرواہ ہوجاتے ہیں۔ امام کی رائے سے سنت کو اور سنت سے قرآن کو منسوخ کرنے میں کوئی مضائقہ یا شرم محسوس نہیں کرتے۔ آنحضور فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ میں کوئی بات نہ ملے تب سنت کو دیکھو اور ہم قرآن میں ایک صریح بات دیکھتے ہوئے بھی بے تکلف اسے کسی حدیث سے منسوخ قرار دے دیتے ہیں یہ طرزِ عمل جہاں قرآن کے خلاف ہے وہاں خود ارشاد نبوی کے صریحًا خلاف ہے۔ مشکوٰۃ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کلام اللہ ینسخ کلامی وکلامی لا ینسخ کلام اللہ (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم) اتنی معمولی سی بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ حضور صلی اللہ وسلم کو اتباع وحی کا پابند کیا گیا (واتبع ما یُوحیٰ اِلَیکَ من رَبِّکَ) نیز (قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی) لیکن قرآن کو حضور کا پابند نہیں بتایا گیا ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضور اپنے کسی ارشاد سے کسی حکم قرآنی کو منسوخ یا تبدیل کردیں؟ (العیاذ باللہ) یہ جرم اس جرم سے کسی طرح کم نہیں کہ کسی امام کے قول سے ارشاد نبوی کو منسوخ کردیا جائے یا حدیث رسول کو کسی فلسفی یا شاعر کے قول کے برابر بھی وقعت نہ دی جائے۔

مجتہدوں کے لئے تو پھر بھی کبھی حدیث کو نظر انداز کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ

(۱) اس سے مختلف دوسری حدیث موجود ہے یا

(۲) اس حدیث کے متن یا سند میں فلاں خرابی ہے جس کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ یا

(۳) فلاں قرآنی حکم سے متصادم ہوتی ہے یا

(۴) یہ عقل کے مطابق نہیں۔ یا

(۵) مسلمہ تاریخی حقیقت کے خلاف ہے۔ یا

(۶) اس کے بیان کردہ عذاب وثواب میں مبالغہ ہے۔ یا

(۷) یہ مُعلّل ہے (یعنی وجدان اسے صحیح نہیں مانتا)۔ یا

(۸) اس سے اللہ۔ اس کے رسول اور کلام اللہ کی عظمت مجروح ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن قرآن کی کسی آیت کے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ (بجز غلط فہمی یا کفر کے) ہمارے مجتہدین وائمہ فقہ نے اخلاص کے ساتھ ہی آیات کی تفسیریں کیں اور اخلاص کے ساتھ ایک مضمون کی مختلف احادیث میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا۔ یا کتاب وسنت ہی کی روشنی میں اجتہاد سے کام لیا۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ۔ اجتہادات ائمہ کی سعی مشکور ہونے کے باوجود فائنل، حرف آخر یا آخری سند نہیں کہ ان پر قرآن کی طرح ایمان لے آیا جائے۔ یا ان پر نظر ثانی حرام قرار پائے۔ قرآن کے سوا کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جو قیامت تک کے لئے نظر ثانی یا تنقید سے بالاتر ہو۔

مثلہ مَعَہٗ والی حدیث (جو شاید صرف سنن ابو داؤد ہی میں ہے) اگر تنقید سے بالاتر اور قرآن کی طرح متواتر مان لی جائے جب بھی احادیث

کی مثلیت کو قرآن کی سطح پر سمجھنا کوئی معقول بات نہیں ، روئے زمین کے تمام جانداروں اور فضا کے تمام اُڑنے والے پرندوں کو قرآن نے انسانی امت کی طرح کی امتیں قرار دیا ہے (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (۳۸/۶) آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو کُتّے کے مثل بتایا ہے (مثله کمثل الکلب ان تحمل علیه یلهث او تترکه یلهث (۱۷۶/۷) توریت نہ سنبھالنے والے یہودیوں کو گدھے کے مثل فرمایا گیا ہے (مثل الذین حملوا التورٰۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یَحْمِلُ اسفارا) کون صاحب عقل کہہ سکتا ہے کہ اس تشبیہ کی بنیاد پر انسان فی الواقع پرندے کی طرح اڑتے ہیں یا کُتّوں کی طرح دم ہلاتے اور زبان لٹکائے پھرتے ہیں یا گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرکے رینگتے ہیں ؟ یہ تمثیل تشبیہہ محض جزئی ہوتی ہے کسی ایک دو صفت کی وجہ سے پس مثلہ معہ والی حدیث کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جس نبیؐ کی زبان سے اللہ کا کلام نکلا ہے ۔اسی زبان سے رسول کا اپنا کلام بھی نکلا ہے اور وہ بھی واجب العمل ہے (بشرطیکہ محض مشورہ نہ ہو) جب امیر کا حکم واجب العمل ہے جب قاضی کا فیصلہ واجب التسلیم ہے تو رسول کا حکم تو بطریق اولےٰ واجب التسلیم ہے دوسروں کے حکم سے انکار کرنے کا تو ایک دروازہ کھلا ہوا ہے یعنی لا طاعۃ لمخلوق فی معصیتہ الخالق ۔ لیکن رسول کے حکم میں تو اس کی بھی گنجائش نہیں ۔غرض کلام اللہ اور کلام رسول اللہ بھی واجب التسلیم ہے مگر اس فرق

کے ساتھ کہ اپنے کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے لیا ہے۔ اور کلام رسول کی حفاظت کا ذمہ نہ اللہ نے لیا ہے نہ خود رسول اللہ نے: جو ذخیرہ احادیث آج محفوظ ہے وہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہے اور وہ سعی مشکور ہے۔ لیکن یہ فرق ہمیشہ باقی رہے گا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے اور صحیح ہے۔ ہر آیت یکساں کلام اللہ ہے اور کسی ایک آیت کے بارے میں بھی کوئی یہ کہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں تو وہ بلا ریب وشک کافر و مرتد ہو جائے گا لیکن اگر کسی حدیث کے بارے میں (خواہ وہ کتنی ہی صحیح و قوی ہو) کوئی یہ کہدے کہ فلاں دلیل سے یہ رسول کا قول ہے ہی نہیں تو اسے کفر کا مرتکب نہیں کہا جائے گا۔ دنیا کا ایک مجتہد یا محدث بھی آج تک ایسا نہیں گزرا ہے جس نے بہت سی حدیثوں کا انکار نہ کیا ہو۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ انکار ہرگز حدیث رسول ؐ کا انکار نہیں (نعوذ باللہ) بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ قول تو حدیث رسول ؐ ہے ہی نہیں۔ رسول ؐ کی طرف اس قول کا انتساب ہی غلط ہے یا تو کسی منافق بے دین نے یہ حدیث گھڑی ہے یا کسی سادہ لوح مومن کی غلط فہمی ہے۔ ایسی من گھڑت احادیث ہزاروں لاکھوں ہیں۔ صرف امام بخاری کو دیکھ لیجئے جنہوں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے سوا تین ہزار حدیثیں قبول کیں اور باقی رد کر دیں گویا ہر دو سو روایات میں سے ایک یعنی ½ فیصد حدیثیں صحیح نظر آئیں امام بخاری کی یہ کاوش و محنت ہزار تشکر و امتنان کا محل ہے مگر پھر بھی وہ انسان تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ غلط احادیث نادانستہ لے لی ہوں

اور کچھ صحیح احادیث درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ امام بخاری کا جمع کردہ مجموعہ احادیث قرآن کی طرح نقد و جرح سے ہمیشہ کے لئے بالاتر ہے ایسے خیال کو شرک فی القرآن کہنا غلط نہ ہوگا

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے ائمہ مجتہدین نے تقریباً ہر مسئلے میں جو الگ الگ مسلک اختیار کئے وہ کیوں؟ یہ درحقیقت ان کا اپنا اپنا فہم ہے اور اس فہم کے مطابق ان کی اپنی رائے ہے۔ ایسا اختلافِ رائے خود صحابہؓ میں بھی تھا۔ استدلال کی بنیاد پر اپنی رائے دینے کا حق کوئی ایسا حق نہیں ہے جو صحابہ یا مجتہدین پر ختم ہوگیا۔ ہر ذی علم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دلیل کی بناء پر ان میں سے کسی کی رائے کو ترجیح دے یا ان سب سے الگ اپنی رائے ظاہر کرے۔

علامہ عمر عثمانی نے اسی حق سے صحیح فائدہ اُٹھایا ہے۔ فقہی مسائل میں صحابہ و مجتہدین کی مختلف رائیں ظاہر کردی ہیں اور ساتھ ہی اپنی رائے بھی دے دی ہے کہ فلاں کا مسلک قرآن سے زیادہ قریب نظر آتا ہے اور اس کی یہ دلیل ہے۔ مولانا نے حدیث معاذؓ کے مطابق ایک نڈر مؤمن کی طرح ہر مسئلے میں قرآن کو مقدم رکھا ہے اور اسکے خلاف انھیں جو روایت یا قولِ مجتہدین نظر آیا اسے رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے اور جسے بھی رد کیا ہے عقلی و نقلی دلیل سے رد کیا ہے۔ بعض مسائل میں کسی ایک امام مجتہد کے مسلک کو اختیار کیا ہے اور بعض مسائل ائمہ مجتہدین کے سب مسلکوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کردی ہے مگر ہر جگہ قوی استدلال کو ملحوظ رکھا ہے آنحضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کئی افسانے ہماری کتابوں میں درج ہیں ان میں سے سات افسانوں پر مولانا موصوف نے جس جرأتمندانہ اور علمی و عقلی انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ انہی کا حصہ ہے ان کا اصل ماخذ قرآن ہے اور ہر مؤمن کسی ایسے خیال کو رد کرنے میں حق بجانب ہے جو اس کی نگاہ میں قرآنی روح کے خلاف ہے۔ مولانا عثمانی کا اصل "قصور" صرف اسی قدر ہے۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ مولانا موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر ہے۔ قرآن کے سوا کوئی چیز بھی حرفِ آخر نہیں باقی سب کچھ انسانی کوشش ہے جس میں صواب و خطا کا یکساں امکان موجود ہے قرآن ہمیشہ کیلئے ہے۔ ابدی ہے ناقابل تبدیل ہے۔ لیکن قرآن کی جتنی تفسیریں ہیں وہ نہ ابدی ہیں نہ غیر متبدل ہیں ہر تفسیر اپنے دور میں صحیح ہے اور وہ بھی اس لئے کہ انسانی تحقیق وہیں تک پہنچ سکی ہے اور جیسے جیسے انسانی عقل و علم و تجربہ کی ارتقائی منازل طے ہوتی جائیں گی۔ ہر نئی تفسیر پچھلی تفسیر سے آگے ہوگی گزشتہ کے مقابلے میں موجودہ اور موجودہ کے مقابلے میں آئندہ تفسیر زیادہ ارتقا یافتہ ہوگی۔ یہ عین ممکن ہے کہ جس روایت کی بنیاد پر کوئی تفسیر کی گئی ہے وہ روایت ہی کبھی غلط ثابت ہوجائے۔ اس لئے وہ تفسیر بھی ناقابل اعتبار ہوجائے۔ فقہ القرآن میں آپ کو اس کی بہتیری نظیریں ملیں گی۔

ہم فقہ القرآن کے فاضل مؤلف کو اس جرأتمندانہ اقدام پر مبارکباد دیتے ہیں اور پڑھنے والوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ فرقی تعصبات سے بالاتر ہوکر حریت فکر کے ساتھ اسکا مطالعہ فرمائیں۔ بلاشبہ اسلامی قانون سازی کیلئے یہ کتاب روشنی کا منارہ ثابت ہوگی۔

محمد جعفر پھلواروی

فراہی مکتب فکر کے ترجمان سہ ماہی تدبر لاہور کا

تبصرہ

(اپریل ۱۹۸۶ء)

جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے، لوگوں کی خواہش رہی ہے کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو مگر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس سمت میں کوئی خاص پیش رفت ہوتی نظر نہیں آئی۔ جو لوگ اسلامی نظام کے قیام کے مخالف ہیں وہ اس کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام کے اندر مختلف فقہی گروہ پیدا ہو چکے ہیں اور اب یہ ممکن نہیں رہا کہ ان گروہوں کو کسی ایک مسلک کے تحت جمع کیا جا سکے۔ یہ خیال اگرچہ ایک نہایت محدود گروہ کا خیال ہے اور یہ امکان نہیں کہ یہ گروہ ملک کی رائے عامہ پر غالب آ سکے مگر اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے درمیان سرسری اور سطحی قسم کے جو اختلافات تھے وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس قدر پختہ اور گہرے ہو چکے ہیں کہ ان کا استیصال آسان نہیں رہا اور ان کو ختم کیے بغیر نہ اسلامی قانون کی تدوین ممکن ہے اور نہ اس کے مؤثر نفاذ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسلامی قانون کے صحیح اور مؤثر نفاذ کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمام مسلمان من حیث الجماعت تمام گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر تسلیم کریں کہ ان کے قانون پر کھنے کے لیے اصل کسوٹی قرآن و سنت ہیں۔

مسلمانوں کے اندر تشتت و تفرق کی ایک وجہ فقہائے متاخرین کا تقلید جمود ہے۔ ایک ہی متعین امام کی تقلید اور تنہا انہی کے اقوال کی پیروی نے الگ الگ اماموں کے مقلدین اور متبعین کے الگ الگ گروہ بنا دیئے ہیں اور ان میں

سے ہر ایک حق و ہدایت کو اپنے ہی امام اور اس کے منتسبین کے اندر محصور ماننے لگا ہے ۔ اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیا کہ اس کی ہر بات تنقید کے بغیر تسلیم کر لی جائے ۔ اجتہاد خواہ کتنے ہی بڑے آدمی کا ہو اس میں غلطی اور صحت دونوں کا احتمال ہوسکتا ہے اس لئے اجتہادی امور میں رواداری اور وسعت قلب کا دامن چھوڑ کر تعصب اور تشدد کی راہ اختیار کرنا اور کسی ایک اجتہاد کو نص کا درجہ دے کر دوسروں سے لڑنا جھگڑنا درست نہیں ۔ ہمارے ائمہ کرام جن کی تقلید پر زور آجکل بڑے شدومد سے دیا جاتا ہے ، ان میں سے ہر ایک نے خود تقلید پر کاری ضرب لگائی ہے ۔

مختلف فقہی گروہوں کی موجودگی میں ، اگرچہ کوئی گروہ اکثریت میں بھی ہو ، اسلامی ریاست کسی ایک امام کی تقلید یا کسی ایک فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں کی جا سکتی بلکہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست کتاب وسنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو ، ہمارے علمائے کرام اجتہادی امور میں مختلف ائمہ کرام کے اجتہادات پر ترجیح اور تعصب کے بغیر نگاہ ڈال کر ان اقوال اور آراء کو اختیار کریں جو ان کی نظر میں کتاب وسنت اور روح اسلام کے قریب تر نظر آئیں اور جن امور سے متعلق پچھلے ائمہ کے اجتہادات میں کوئی قول یا رائے نہ ملے ، کتاب وسنت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر خود اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں ۔

اس وقت جب کہ ملک میں نفاذ شریعت کے لئے اقدامات کی امید پیدا ہوئی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ علمائے کرام فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی قانون کی تدوین کی راہ ہموار کریں ۔ اس سلسلہ میں ادارۂ فکر اسلامی کراچی

نے نہایت قابل ستائش قدم اٹھایا ہے۔ اس ادارہ نے فقہ کی ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جو پوری اسلامی فقہ کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہو۔ لوگوں کو اصولی و بنیادی اور فروعی و جزئی مسائل میں امتیاز کرنے کا عادی بنانے کے لئے حکمت عملی یہ اختیار کی گئی ہے کہ ایک کتاب میں فقہ کا وہ حصہ مرتب کیا جائے جو قرآن مجید کی نصوص سے ثابت ہے۔ دوسری کتاب فقہ کے اس حصہ پر مشتمل ہو جو سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ کتاب تصنیف کرنے کے لئے ادارہ نے مولانا عمر احمد عثمانی سے رجوع کیا۔ وہ ملک کے معروف دینی و علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے صاحبزادے ہیں اس اعتبار سے ان کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ مولانا نے فقہ القرآن کے نام سے ایک سلسلۂ کتب تیار کر دیا ہے جس کی جلد ششم ہمارے پیش نظر ہے۔

ہماری قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ جمود اور تقلید کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ دین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی اگر کوئی عالم، خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ، کوئی نیا فکر عام موقف سے ہٹ کر پیش کرے، تو لوگ اس پر کفر یا کم از کم انکار حدیث کا لیبل چسپاں کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ مولانا عثمانی کو بھی فقہ القرآن لکھنے پر اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لوگوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے کتاب کو پھبتیوں سے اڑانے کی کوشش کی ہے کہ وہ عقل و استدلال کی جولانی دکھانے کے باوجود فقہا کی تحقیقات کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔ چونکہ ہر صحیح بات دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتی اور اپنے قدردان پیدا کر لیتی ہے اس لئے مخالفت کے باوجود مولانا عثمانی کے مداحوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عقلیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ دین کے

وفادار ہونے کی شہرت رکھتے ہیں ہمارے نزدیک اس نامساعد دور میں کتاب کی یہ تائید بھی کافی ہے۔

جلد ششم میں صرف تین موضوعات یعنی مختلف جرائم و معاملات میں شہادت کے احکام، عورت کی دیت اور اجماع پر بحث کی گئی ہے اور وہ بڑی سیر حاصل ہے۔ فاضل مصنف نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ اسلامی قانون کی تدوین کی راہ ہموار کرنے میں انشاء اللہ مددگار ثابت ہوگا اور مولانا موصوف نے قرآن و سنت سے ٹھوس دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ عورت کی شہادت سوائے مالی معاملات کے مرد کی شہادت کے برابر ہے اور اسی طرح عورت کی دیت کی مقدار بھی مرد کی دیت کی مقدار کے برابر ہے مولانا کی رائے سے اختلافات رکھنے کا ہر کسی کو حق ہے مگر انکی اس جرأت پر انھیں گردن زدنی قرار دینا کسی لحاظ سے بھی قرین انصاف نہیں۔ کتاب کے آخر میں مولانا موصوف نے اجماع کی حقیقت پر ایک مقالہ لکھا ہے جسمیں اجماع کے مفہوم، عہد صحابہ اور عہد صحابہ کے بعد اجماع کے سلسلہ میں مذاہب، اجماع کی اقسام اسکے انعقاد اور اسکی حجیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ سابق اجماع سے ثابت شدہ مسائل و احکام میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے عورتوں کی شہادت اور دیت کے مسائل اس سے پہلے کی جلدوں میں بھی بیان ہوئے ہیں جن پر ملک میں بحثیں اُٹھائی گئیں۔ جلد ششم میں ان بحثوں کا جواب بھی ہے اس لئے زیر نظر کتاب کا طرز تحریر قدرے مناظرانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اسکے آئندہ ایڈیشن میں معمولی حذف و اضافہ سے اگر یہ سقم دور کیا جائے تو اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ جائیگی۔ تعارف کتاب کے عنوان سے اس کتاب کی تقریظ جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے جسٹس آفتاب حسین سابق چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت نے لکھی ہے۔ اسی طرح علامہ سعید احمد اکبرآبادی کے قلم سے بھی ایک تعریفی تحریر شامل کتاب ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم

سابق صدر شعبہ اسلامیات علی گڑھ یونیورسٹی و ڈائریکٹر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم۔ دیوبند

کا

ایک گرامی نامہ

(پچھلی جلد جب شائع ہوئی تو مولانا مرحوم بقید حیات تھے اس میں ان کی تقریظ بھی شائع ہوئی تھی۔ اب پرانے کاغذات دیکھتے ہوئے مولانا کا ایک گرامی نامہ نظر آیا جو مرحوم نے فقہ القرآن کی پہلی دو جلدوں اور رجم والے حصہ کے ملنے پر مولانا عمر احمد عثمانی کے نام لکھا تھا جو درج ذیل ہے۔)

محبِ محترم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا محبت نامہ مورخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء مجھ کو بہت دنوں کے بعد ملا۔ کیونکہ میں ۳ر اکتوبر کو غیر ممالک کے ایک طویل سفر سے واپس ہو کر دہلی پہونچا اور پھر اندرون ملک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بہر حال آپ کا خط دیکھ کر قلبی اور روحانی مسرت ہوئی اور وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم دونوں مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری میں یکجا تھے اور لطفِ کلام و صحبت رہتا تھا۔ آپ نے اس درمیان میں جو علمی مرتبہ و مقام حاصل کیا ہے وہ آپ کی خاندانی روایات اور خود اپنے شخصی اوصاف و کمالات کے عین مطابق ہے۔ زادکم اللہ شرفاً وکرامۃ۔

میں سال گذشتہ دو مرتبہ کراچی گیا۔ یہ تو معلوم تھا کہ آپ کراچی میں ہیں، مگر کہاں؟ دریافت کرنے پر بھی اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس لئے مجبور رہا۔ اب میں نے آپ کا پتہ اور فون نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ اب آیا تو انشاء اللہ ضرور ملونگا۔ عرصہ دراز کے بعد آپ سے ملاقات کر کے واقعی بڑی مسرت ہوگی۔

آپ کی دونوں کتابیں فقہ القرآن اور حکم رجم مل گئیں۔ میں ان کے مطالعہ سے محظوظ ہوا۔ علماء کرام بعض مشتملات سے اختلاف کریں گے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ان مسائل پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا جائے اور آپ نے اسی کے لئے کافی مواد فراہم کر دیا ہے۔ "برہان" میں اس پر تبصرہ ہوگا۔

والسلام

مخلص سعید احمد اکبر آبادی

قرآن مجید اور مروّجہ اسلام	جناب محترم ماسٹر کریم بخش صاحب سکھانی مدظلہٗ کی عمر بھر کی فکرِ قرآنی کا نچوڑ

ہے۔ اگر آپ حقیقی اسلام کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیے یہ آپ کو اسلام کی حقیقت سے آشنا کرنیکے ساتھ اپنی ان غلطیوں سے بھی آگاہ کرے گی جن میں ہم صدیوں سے گرفتار چلے آرہے ہیں۔

ضخامت ۴۴۶ صفحات۔

قیمت صرف پینتیس روپے

کتاب الوصیۃ والوراثۃ

وصیت و وراثت کے سلسلہ میں ہمارے فقہائے کرام نے بڑی بڑی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو سینکڑوں صفحات سے متجاوز ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنی چند آیات میں پورا علم الفرائض سمیٹ لیا ہے۔ مسائل وراثت پر بحث کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی متعلقہ آیات پیش کر دی جائیں۔

(۱) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

(۲ / ۱۸۰ - ۱۸۲)

(٢) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا
اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ج فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَّعْرُوْفٍ ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥

($\frac{٢}{٢٤٠}$)

(٣) لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ
وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَاِذَا حَضَرَ
الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى ج وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ
فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا
وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ
ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ص فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ
وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ٥ اِنَّ الَّذِيْنَ يَا
كُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ
نَارًا ط وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ٥ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ
اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ج
فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا
مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ج
وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا

تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۗ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ
لَهُ وَلَدٌ ۗ .... وَوَ
رِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ
كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ
بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ
وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ
فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝
وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ
وَلَدٌ ۗ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ
مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا
أَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ
لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ
فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ
يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ
مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ
وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝

(۴ / ۱۲-۷)

(۴) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

(۴/۳۲-۳۳)

(۵) يَسْتَفْتُوْنَكَ ط قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ ط
اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ
اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ج وَهُوَ يَرِثُهَآ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ط فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ
فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ط وَاِنْ كَانُوْٓا
اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْاُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ط
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(۴/۱۷۶)

(۶) وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ
فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(۸/۷۵)

(۷) اَلنَّبِىُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ
اُمَّهٰتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى
بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ
فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

(۳۳/۶)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی محسوس کرے، اس کے مرنے کی گھڑی آگئی، اور وہ اپنے بعد مال و متاع میں کچھ چھوڑ جانے والا ہو، تو چاہیئے کہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے اچھی وصیّت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں، ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

پھر جو کوئی ایسا کرے کہ کسی آدمی کی وصیت سننے (اور اس کے گواہ اور امین ہونے) کے بعد اس میں رد و بدل کر دے تو اس گناہ کی ذمہ داری اسی کے سر ہو گی جس نے رد و بدل کیا ہے (وصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کی تعمیل ہر حال میں ضرور ہو گی) یقین کرو، اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (پس نہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مظلوم کی فریاد سے وہ بے خبر رہ جائے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنی خیانت اس سے چھپا سکے)

اور اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بیجا رعایت کرنے یا معصیت کا اندیشہ ہو، اور وہ (بر وقت مداخلت کر کے یا وارثوں کو سمجھا بجھا کر)

ان میں مصالحت کرا دے تو ایسا کرنے میں کوئی
گناہ نہیں (کیونکہ یہ وصیت میں رد و بدل کرنا
نہیں ہے بلکہ ایک بُرائی کی اصلاح کر دینا ہے
اور) بلاشبہ اللہ (انسانی کمزوریوں کو) بخشنے
والا، اور (اپنے تمام احکام میں) رحمت رکھنے
والا ہے ! -

(۲) اور جو لوگ تم میں سے وفات پائیں اور اپنے
پیچھے بیوہ عورتیں چھوڑ جائیں، وہ (مرنے سے
پہلے اس طرح کی) وصیت کر جائیں کہ برس دن
تک انھیں نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی
جائیں، پھر اگر ایسا ہو کہ وہ خود ہی (اس
مدت سے پہلے) گھر چھوڑ دیں (اور دوسرا
نکاح کرلیں یا نکاح کی بات چیت
کریں) تو جو کچھ وہ جائز طریقہ پر کریں اس کیلئے
تم پر کوئی گناہ عائد نہ ہوگا (کہ تم انھیں وصیت
کی تعمیل کے خیال سے روکو۔ اور سال بھر تک
سوگ منانے پر مجبور کرو) اور یاد رکھو اللہ سب
پر غالب اور اپنے ہر کام میں حکمت رکھنے والا ہے۔

(۳) ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں تھوڑا ہو
یا بہت، لڑکوں کا حصہ ہے، اور اسی طرح، ماں
باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں لڑکیوں کا بھی

حصہ ہے (حق دار ہونے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں) اور یہ حصّہ (حق تعالیٰ کا) ٹھہرایا ہوا حصّہ ہے۔ اور (دیکھو) جب ایسا ہو کہ ترکہ تقسیم کرنے کے وقت (دور کے) رشتہ دار اور (خاندان کے) یتیم اور مسکین افراد بھی حاضر ہو جائیں تو چاہیئے کہ میت کے مال میں سے انھیں بھی (حسب مقدور) تھوڑا بہت دیدو، اور (اگر اس بارے میں ردّو کد ہو) تو انھیں اچھے طریقہ پر بات کہہ کر سمجھا دو کیونکہ وہ حاجتمند ہیں اور حاجتمندوں کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آنا چاہیے کہ کسی حقدار کے حق میں ناانصافی کی جائے) اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں اولاد چھوڑ جائے تو انھیں اُن کی طرف سے کیا کچھ اندیشہ ہوتا (ایسا ہی دوسروں کے لئے بھی سمجھیں) پس چاہیئے کہ اللہ سے ڈریں اور ایسی بات کہیں جو درست اور مضبوط ہو۔

جو لوگ یتیموں کا مال ناانصافی سے خورد بُرد کر لیتے ہیں، تو (وہ یاد رکھیں) یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنے شکم میں آگ کے انگارے بھر رہے ہیں، اور قریب ہے کہ دوزخ میں جھونکے جائیں گے۔

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کیلئے دُو لڑکیوں کے برابر حصّہ ہو (یعنی

لڑکی سے لڑکے کا حصہ دوگنا ہونا چاہیئے) پھر اگر ایسا ہو کہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ترکہ میں ان کا حصّہ دو تہائی ہوگا۔ اور اگر اکیلی ہو تو اسے آدھا ملے گا۔ اور میت کے ماں باپ میں سے ایک کو ترکہ کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ میت کے اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو اور وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو ماں کے لئے تہائی (باقی باپ کا)

اگر (ماں باپ کے علاوہ) میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہنیں بھی ہوں تو ماں کا حصّہ چھٹا ہوگا۔ لیکن یاد رہے۔ میت نے جو کچھ وصیت کر دی ہو، یا جو کچھ اس پر قرض رہگیا ہو، اس کی تعمیل اور ادائیگی کے بعد یہ حصّے تقسیم ہوں گے۔

(دیکھو) تمھارے باپ دادا بھی ہیں اور تمھاری اولاد بھی ہے (یعنی رشتہ کے لحاظ سے اوپر کا بھی رشتہ ہے اور نیچے کا بھی) تم نہیں جانتے، نفع رسانی کے لحاظ سے کونسا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک ہے (اور کس کا حق زیادہ ہونا چاہیئے کس کا کم۔ اللہ کی حکمت ہی اس کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ پس) اللہ نے حصے ٹھہرا دیئے ہیں، اور وہ (اپنے بندوں کی مصلحت کا) جاننے والا اور (اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے

والا ہے۔

تمھاری بیویاں جو کچھ ترکہ میں چھوڑ جائیں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے اولاد نہ ہو تو تمھارا (یعنی شوہر کا) حصہ آدھا ہے اور اگر اولاد ہو تو چوتھائی۔ مگر یہ تقسیم اس کے بعد ہو گی کہ جو کچھ وہ وصیت کر گئی ہوں اس کی تعمیل ہو جائے اور جو کچھ ان پر قرض ہو ادا کر دیا جائے۔

اور جو کچھ ترکہ تم چھوڑ جاؤ (یعنی شوہر چھوڑ جائے) تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تم سے اولاد نہ ہو تو بیویوں کا حصّہ چوتھائی ہو گا اور اگر اولاد ہو تو آٹھواں۔ جو کچھ تم وصیت کر جاؤ اس کی تعمیل۔ اور جو کچھ تم پر قرض رہ گیا ہو اس کی ادائیگی کے بعد۔

اور اگر ایسا ہو کہ کوئی مرد یا عورت ترکہ چھوڑ جائے اور وہ کلالہ ہو (یعنی نہ تو اس کا باپ ہو نہ بیٹا) اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ بھائی بہن میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہو گا۔ اور اگر (بھائی بہن) ایک سے زیادہ ہوں تو پھر ایک تہائی میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔ لیکن اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو میت نے کر دی ہو نیز اس قرض کی ادائیگی کے بعد جو میت کے ذمے رہ گیا ہو۔

بشرطیکہ (وصیت اور قرض سے) مقصود (حقداروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔ یہ (ترکہ کی تقسیم کے بارے میں) اللہ کی طرف سے حکم ہے، اور (یقین رکھو) اللہ (بندوں کے مصالح) جاننے والا اور (ان کی کمزوریوں کے لئے اپنے احکام و قوانین میں) بہت بردبار ہے۔

(۴) اور (دیکھو) جو کچھ ترکہ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کیلئے ہم نے حقدار ٹھہرا دیئے ہیں، نیز جن سے تمہارا کوئی عہد و پیمان ہو چکا ہو (ان کا بھی ہم نے حصّہ ٹھہرا دیا ہے) پس چاہئے کہ جس کا حصہ ہو۔ وہ اس کے حوالے کر دو۔ (اور یاد رکھو) اللہ حاضر و ناظر ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

(۵) (اے پیغمبر!) لوگ آپ سے کلالہ کے بارے میں (یعنی ایسے آدمی کے بارے میں جس کے نہ تو باپ ہو، نہ اولاد) فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ کہدو، اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں (حسب ذیل) حکم دیتا ہے، اگر کوئی مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ باپ دادا) اور اس کے بہن ہو تو جو کچھ مرنے والا چھوڑ مرا ہے اس کا آدھا بہن کا حصّہ ہوگا۔ اور بہن مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو، تو اس کے سارے مال کا

وارث وہ بھائی ہی ہوگا۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں (یا دو سے زیادہ) تو انھیں ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن (ملے جُلے ہوں) کچھ مرد کچھ عورتیں، تو پھر (اسی قاعدے سے حصے تقسیم ہوں گے کہ) مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ۔ اللہ تمھارے لئے اپنے احکام واضح کر دیتا ہے تاکہ گمراہ نہ ہو، اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔

(٦) رہگئے قرابت دار، تو اللہ کے قانون اور حکم میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں (پس باہمی بھائی چارگی میں ان کے حقوق فراموش نہ کر دیئے جائیں) بلاشبہ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

(٧) نبی مؤمنین پر ان کے نفسوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور نبی کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

قرابت دار تو اللہ کے قانون اور حکم میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں بہ نسبت دوسرے مومنین مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ نیکی کرنا چاہو (تو کر سکتے ہو) یہ اللہ کے قانون میں لکھا ہوا ہے۔

انہاء السکن عن بطالع اعلاء السنن — حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز تصنیف اعلاء السنن کا مقدمہ جسمیں فقہ حنفی کے اصول پر "اصول حدیث" کی مستند ترین کتاب ہے۔ عربی ٹائپ میں بڑے سائز پر۔ قیمت صرف بیس روپے۔

باب الوصیة

قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں ارشادِ الٰہی ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ
تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ
بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

(۲/۱۸۰)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر جب کہ کسی کو موت آنے لگے، جب وہ اپنے بعد کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر دینا فرض کر دیا گیا ہے۔ یہ تقویٰ شعار لوگوں پر فرض ہے۔

اس آیت کریمہ میں وصیت کی فرضیت کے لئے دو لفظ الگ الگ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ ایک تو کُتِبَ عَلَيْكُمْ (تم پر فرض کی گئی ہے) اور دوسرے حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (تقویٰ شعار لوگوں پر فرض ہے)۔ جس مسئلہ کی فرضیت، اس قدر تاکید کے ساتھ فرمائی گئی ہو اسے غیر اہم قرار دے دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اس کے بعد سورہ مائدہ میں وصیت کرتے وقت دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنانے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ۝ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِن شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا ۚ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَن تُرَدَّ أَيْمَانٌ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاسْمَعُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

(۵ / ۱۰۶-۱۰۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو وصیت کرنے کے وقت اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو اپنے درمیان گواہ بنالیا کرو۔ اور اگر

تم زمین میں سفر کر رہے ہو (اور وہاں مسلمان آدمی نہ مل سکیں تو) یا دو آدمی غیر قوم کے جب تمھیں موت کی مصیبت پیش آجائے۔ ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لو اور اگر تمھیں کوئی شک ہو تو وہ قسم کھائیں کہ ہم اپنی قسم سے کچھ دنیوی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگرچہ جن کے خلاف ہم گواہی دے رہے ہیں کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی شہادت کو چھپاتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو بیشک ہم گنہگاروں میں شمار ہوں گے۔ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دو دوسرے آدمی جنکی انھوں نے حق تلفی کی ہے کھڑے ہوں اور وہ میت کے قریب ترین رشتہ دار ہوں۔ وہ دونوں قسم کھائیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ قابل قبول ہے اور ہم نے اس شہادت میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم یقیناً ظالموں میں سے ہوں گے۔ یہ طریقہ اس سے قریب تر ہے کہ لوگ صحیح طور پر گواہی دیں یعنی انھیں یہ اندیشہ لگا رہے کہ فریق ثانی کی قسموں کے بعد ان کی قسمیں رد ہو جائیں گی۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ کی ہدایت کو کان لگا کر سنو، اور اللہ فاسقوں کو صحیح راہ نہیں دکھایا

کرتا۔

ان آیات میں پورا ضابطہ بیان فرمادیا گیا ہے کہ وصیت کرتے وقت دو معتبر آدمیوں کو اپنے میں سے گواہ بنالینا ضروری ہے۔ اور اگر دورانِ سفر موت آجائے اور وہاں دو مسلمان آدمی نہ مل سکیں تو دو غیر مسلم آدمیوں کو گواہ بنالو۔ وہ گواہ متوفی کی وصیت تم تک پہنچائیں اور جو مال اس نے (سفر میں) ان کے حوالہ کردیا تھا اسے تم تک پہنچائیں۔ اگر ان کے متعلق تمہیں کوئی شبہ ہو تو نماز کے بعد مسجد میں ان کو روک کر ان سے قسم لے لو اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان لوگوں نے کسی خیانت کا ارتکاب کیا ہے تو میت کے دو قریبی رشتہ دار قسمیں کھائیں کہ ان لوگوں نے خیانت کی ہے اور ان کی شہادت ان کے مقابلہ میں صحیح تر ہے۔ تو عدالت دونوں کے بیانات اور شہادتیں سننے کے بعد فیصلہ دیدے۔

وصیت میں تبدیلی کرنا | گواہوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ متوفّی کی وصیت میں کسی طرح کی تبدیلی کردیں۔ البتہ اگر متوفّی نے وصیت کرنے میں کوئی زیادتی کی ہے یا کسی جنبہ داری کا ثبوت دیا ہے تو گواہوں کو چاہئے کہ ورثاء کو سمجھا بجھا کر اس کی اصلاح اور درستگی پر تیار کرلیں اور وہ باہمی رضامندی سے متوفّی کی غلطی کا تدارک کردیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ

عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ (۲/۱۸۱-۱۸۲)

پھر جو شخص اس وصیت کو سننے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ بدلنے والوں ہی کو ہوگا۔ یقیناً اللہ سننے والا جاننے والا ہے لیکن جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے طرفداری یا کوتاہی کا اندیشہ کرے اور ورثاء کے درمیان (ان کی باہمی رضامندی سے) اصلاح کر دے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یقیناً حق تعالیٰ بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ گواہ اپنی مرضی سے متوفّٰی کی وصیت میں کوئی تبدیلی کریں نیز وہ اصلاح اور درستگی کی اپنی مرضی سے کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ متوفّٰی نے کسی کی طرفداری کی ہے اور دوسرے کی حق تلفی کر دی ہے تو ورثاء کو سمجھائیں کہ متوفّٰی نے وصیت تو یہ کی ہے لیکن یہ وصیت اس اس وجہ سے غلط ہے۔ متوفّٰی وصیت تو کر گیا مگر اس وصیت کی وجہ سے اسے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہی کرنی ہوگی اور شاید اسے اس کی سزا بھی بھگتنی پڑے۔ لہٰذا آپ لوگ اسے درست کر دیں تاکہ آخرت کے وبال سے متوفّٰی بچ جائے وغیرہ وغیرہ تو ایسی کوشش کر لینے میں کوئی

مضائقہ نہیں بلکہ عند اللہ اُنھیں اس کا اجر و ثواب ملے گا۔

وصیت کی ضرورت

جس طرح دو انسانوں کی صورتیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہی ہوتا ہے ایسے ہی دو انسانوں کے حالات و کوائف بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ کم وبیش کوئی نہ کوئی فرق ضرور ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تمام انسانوں کے ان کوائف اور مختلف احوال ظروف کے مطابق کوئی قانونِ کلی بنا دینا مشکل ہے جو سب کے احوال و کوائف کو یکساں طور پر حل کر دے۔ مثال کے طور پر غور کیجئے۔ ایک شخص کے چند بیٹے ہیں۔ وہ ان کو پڑھا لکھا چکا، ان کی شادیاں کر چکا سب برسرِ روزگار ہیں۔ لیکن ایک بیٹا جو ابھی دس بارہ سال کا ہے۔ ابھی تعلیم پا رہا ہے۔ نہ اسکی تعلیم مکمل ہوئی نہ اس کی شادی ہوئی نہ اس کا کوئی ذریعہ آمدنی ہے۔ کیونکہ ابھی وہ برسرِ روزگار ہی نہیں ہے۔ یہ سارے بیٹے ظاہر ہے کہ نہ ان کی ضروریات یکساں ہیں نہ ان کی ذمہ داریاں یکساں ہیں، نہ ان کے ذرائعِ آمدنی یکساں ہیں۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ اسی طرح ایک شخص کی تین بیٹیاں ہیں۔ دو کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔ باپ نے ان کو جہیز بھی دیدیا ہے۔ اس میں کپڑے، زیور، فرنیچر اور گھر کی دیگر ضروریات سب کچھ اس نے دیا ہے لیکن تیسری لڑکی ابھی دس گیارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ اس کو جہیز وغیرہ کچھ نہیں دیا گیا۔ ابھی باپ نے اس کی شادی کی تیاری ہی نہیں کی۔ ظاہر ہے

کہ تینوں بیٹیاں ۔ برابر نہیں ہیں ۔ ان کی ضروریات برابر نہیں ہیں ۔ انکی ذمہ داریاں برابر نہیں ہیں ۔ ان کی متوقع احتیاجات برابر نہیں ہیں۔ ایک شخص کے باپ بھی ہے اور ماں بھی ۔ باپ برسرِ روزگار ہے اور اسے بیٹے سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن دوسری طرف ماں ہے ۔ وہ ایک گھریلو عورت ہے اسے اُمورِ خانہ داری ہی سے فرصت نہیں ہوتی ۔ وہ نہ تعلیم یافتہ ہے اور نہ برسرِ روزگار ہے ۔ اس کے باپ کو بھی اپنی بیوی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں رہی ۔ باپ نے اپنے بعد کے لئے بیوی کے واسطے کوئی انتظام بھی نہیں کیا ۔ باپ کے دوسری بیوی سے دوسری اولاد بھی ہے جو ہو سکتا ہے کہ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس سوتیلی ماں کو گھر سے ہی نکال باہر کریں ۔ ظاہر ہے کہ ماں باپ کے حالات وکوائف یکساں نہیں ہیں ۔ دونوں کی ضروریات یکساں نہیں ہیں ۔ باپ کو اپنے بیٹے سے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن ماں کو اس کی مدد کی سخت ضرورت ہے ۔ یہی حال بھائی بہنوں اور دوسرے قریب ترین رشتہ داروں کا بھی ہو سکتا ہے ۔ نہ سب کے حالات یکساں ہو سکتے ہیں نہ سب کی ضروریات و احتیاجات یکساں ہو سکتی ہیں ۔ ہر آدمی اپنے حالات اور اپنے رشتہ داروں کے حالات و ضروریات سے زیادہ واقف ہوتا ہے ۔ کوئی خوش حال ہے ۔ کوئی تنگ دست ہے ۔ کوئی تندرست و توانا ہے تو کوئی معذور و مجبور اور ناتواں ہے ۔ ظاہر ہے کہ قانون تو ہر ہر فرد کے لئے الگ الگ نہیں بنایا جا سکتا ۔ لیکن

ہر انسان کو اپنے حالات و کوائف کے ماتحت یہ اختیار ہونا ضروری ہے کہ وہ ان حالات کے مطابق کوئی فیصلہ کر سکے اور اپنے رشتہ داروں کی ضروریات کے مطابق وہ اپنے وَرَثہ کو بتا دے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے۔

خود میرے علم میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی تین بیٹیاں ہیں۔ اچھا کھاتا پیتا خاندان ہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادی اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوئی تھی۔ لیکن قضائے الٰہی سے ایک بیٹی کا شوہر مر گیا۔ اس بیٹی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور اب کمانے والا کوئی نہیں رہا۔ وہ اب روٹی تک کو محتاج ہے اور باپ ہی کے گھر میں وہ بیوہ ہو کر چلی آئی ہے۔ چنانچہ باپ ہی اب اس کا کفیل ہے۔ لیکن دوسری دو بیٹیاں خوب عیش کر رہی ہیں۔ ان کو باپ کے ترکہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود ہی خوش حال ہیں۔ اگر باپ کے ترکہ میں سے انھیں کچھ مل جائے تو ان کی دولت مندی میں تھوڑا سا اور اضافہ ہو جائے گا۔ اور اگر انھیں کچھ بھی نہ ملے تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچیگا۔ ایسی صورت میں باپ کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوہ بیٹی کے لئے معقول وصیت کر جائے جس سے وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ کیونکہ اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ متوفیؒ کے دوسرے داماد متوفیؒ کے بعد اس کی بیوہ بیٹی اور اس کے بچوں کی معقول خبر گیری کر سکیں گے۔

ایسی مثالیں بھی میرے علم میں ہیں کہ ایک شخص نے اپنے ایک بیٹے کو پڑھایا لکھایا ۔ یورپ بھیجا وہاں سے وہ بیرسٹری یا انجینرنگ کا ڈپلوما لے کر آگیا ۔ اس کے آجانے پر باپ نے اسکو دفتر لے کر دیا ۔ گاڑی خرید کر دی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا ۔ اس کا دوسرا بیٹا ہے جو زیرِ تعلیم ہے ۔ باپ نے اس کے لئے ابھی کچھ نہیں کیا ۔ وہ باپ کی خدمت بھی بجالاتا ہے ۔ مگر بڑا بیٹا باپ کو ستاتا ہی رہتا ہے ۔ آج دو ہزار دیدیجئے ۔ آج دس ہزار دیدیجئے ۔ مکان کا اوپر کا حصّہ مجھے دیدیجئے ۔ نیچے کا حصّہ مجھے دیدیجئے ۔ باپ سخت پریشان ہے کہ یا اللہ میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا ۔ اس چھوٹے بچے کا کیا بنے گا ۔ بڑا بیٹا نہایت فضول خرچ اور عیاش ہے ۔ وہ تو ساری رقم خورد بُرد کر دیگا ۔ چونکہ ملک میں ابھی تک انگریزی قانون رائج ہے ۔ اس لئے وہ اس قانون سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کو اپنی تمام جائداد سے عاق کر دیتا ہے ۔ تاکہ بڑے بیٹے کو کچھ نہ ملے اور چھوٹے بیٹے کو ساری جائداد مل جائے ۔ کیونکہ وہ خود ساختہ اسلامی قانون کے مطابق چھوٹے بیٹے کے لئے وصیت نہیں کر سکتا ۔ اور بڑے بیٹے سے اندیشہ ہے کہ وہ باپ کے مرنے کے بعد چھوٹے بھائی کے حصہ کو بھی خورد بُرد کر لے گا ۔ چونکہ اسلامی قانون میں وہ اپنے حالات اور اپنی ضروریات کا حل نہیں پاتا اس لئے وہ انگریزی قانون اختیار کرتا ہے اور اس سے اپنے چھوٹے بیٹے کے مفادات کا تحفّظ کرتا ہے ۔

ایسی مثالیں بھی میرے علم میں ہیں کہ ایک شخص کی دو بیویاں ہیں ۔ ایک بیوی سے کئی بچے ہیں اور وہ جوان ہو چکے ہیں یا جوان ہونے کو ہیں ۔ لیکن دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے ۔ اس کے مرجانے کے بعد جس کے اولاد موجود ہے ۔ اس کی زندگی تو آرام سے گذر سکتی ہے کیونکہ اس کی اولاد کمانے والی اور اسے مدد پہنچانے والی موجود ہے ۔ لیکن شوہر کے مرجانے کے بعد دوسری بیوی کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا ۔ سوتیلی اولاد سے کوئی توقع نہیں باندھی جا سکتی اور اس کی اپنی اولاد کوئی ہے نہیں ۔ ان حالات کا یہ تقاضا ہے کہ شوہر اس بے اولاد بیوی کے مفادات کا کچھ نہ کچھ تحفظ کرے اور کچھ ایسی وصیت کر جائے کہ اس غریب کی زندگی بھی آرام سے کٹ سکے لیکن ہمارے ہاں کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ۔ تو لامحالہ شوہر کو کچھ نہ کچھ دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے ۔

ایسے حالات بھی میرے علم میں ہیں کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں ۔ ایک بیٹا لکھ پڑھ کر کسی اچھی پوسٹ پر ہے اور خوب کما رہا ہے ۔ لیکن دوسرا بیٹا ذہنی طور پر معذور ہے ۔ وہ نہ تعلیم حاصل کر سکا اور نہ کچھ کمانے دھمانے کے قابل ہو سکا ۔ وہ پاگل بھی نہیں کہ اسے پاگل خانہ میں داخل کر دیا جائے لیکن نیم پاگل ضرور ہے اس کا دماغ ناپختہ ہے ۔ باپ کے لیئے یہ معذور بیٹا زیادہ توجہ اور شفقت کا مرکز ہے ۔ دوسرے بھائی سے یہ توقع نہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ اپنے معذور بھائی کا ایسا ہی خیال رکھ سکے گا جیسا کہ باپ رکھتا ہے ۔ دوسرے بیٹے کو جو تعلیم یافتہ ہے اچھا کما دھما رہا ہے ۔ باپ

کے ترکہ کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے اور دوسرا معذور بیٹا ظاہر ہے کہ اسے باپ کے ترکہ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں باپ اگر ایسا کوئی انتظام کرنا چاہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی معذور اولاد تباہ و برباد نہ ہو تو ہمارے ہاں کا فقہی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور لوگوں کو دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑتے ہیں جو عملاً اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون ہماری مشکلات کا کوئی حل پیش نہیں کرتا۔ جو مثالیں میں نے دی ہیں وہ درحقیقت پیش آ چکی ہیں یہ فرضی مثالیں نہیں ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ناظرین کے علم میں بھی ایسی ہزارہا مثالیں ہوں گی۔ قرآن کریم ہماری مشکلات کے حل میں نہ کبھی ناکام تھا نہ آج ناکام ہے۔ یہ دراصل ہمارا قصورِ فہم ہے کہ ہم نے فقہی مذاہب کو عین قرآن اور عین اسلام سمجھ لیا ہے اور فقہی کمزوریوں کو ہم قرآن کے سر تھوپ دینے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ورنہ قرآن ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس میں ہماری تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم قرآن پر غور و فکر اور تدبّر کریں۔

آدمی اپنے مال میں اپنی زندگی میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔ اس کا وہ مال خود اس کا کمایا ہوا ہو یا بزرگوں سے وراثت میں ملا ہو۔ ہمارے ہاں ہندو لاء کے مطابق یہ حکم نہیں ہے یعنی یہ کہ جدّی جائداد کو کوئی شخص اپنی مرضی سے فروخت وغیرہ نہیں کر سکتا۔ وصیت بھی انسان اپنی زندگی اور صحت کے زمانہ ہی میں کرتا ہے

جب کہ اسے اپنی مملوکہ جائداد میں ہر قسم کے تصرف کا حق ہوتا ہے۔ لہذا اس میں اصولی طور پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ ہر آدمی اپنے حالات کے مطابق اپنی جائداد کو تقسیم کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے اتنا موقعہ نہ ملے کہ وہ وصیت کر سکے۔ یا اس نے وصیت کر دی ہے لیکن اس کی وصیت کے بعد بھی مال بچ جاتا ہے تو دونوں صورتوں میں کیا صورت اختیار کی جائیگی تو قرآن کریم نے ان دونوں صورتوں کے لئے میراث کی تقسیم کے ضابطے مقرر فرما دیئے ہیں۔ جن کا بیان ہم کتاب الوراثہ میں کرینگے۔

وصیت کی آیات

وصیت کی تین طرح کی آیات ہم نے بیان کی ہیں۔ اور وصیت سے متعلق ان تین آیات کے علاوہ قرآن کریم میں اور کوئی آیت نہیں ہے۔ یہ تینوں آیتیں باہم مربوط ہیں پہلی قسم کی آیت $\left(\frac{۲}{۱۸۰}\right)$ سورہ بقرہ کی آیت ہے جس میں دو مرتبہ اعلانِ فرضیت کے ساتھ والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی آیات سورۂ مائدہ کی ہیں $\left(\frac{۵}{۱۰۶ - ۱۰۸}\right)$ جن میں حکم دیا گیا ہے کہ جب وصیت کی جائے تو دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لیا جائے۔ اور گواہوں کے بیانات پر اگر ورثاء کو شبہ ہو تو کیا صورت اختیار کی جائے۔ تیسری قسم کی آیات $\frac{۲}{۱۸۱ - ۱۸۲}$ پھر سورۂ بقرہ ہی کی آیات ہیں جن میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ گواہوں کو وصیت میں کسی قسم کی تبدیلی کر دینے کا حق نہیں ہے۔ اگر انھیں یہ خیال ہو کہ متوفّٰی نے جانب داری یا حق تلفی سے کام لیا ہے تو وہ وصیت

کو صحیح طرح بیان کر دیں اور ورثار کو سمجھا بجھا کر وصیت میں اصلاح کرا دیں ۔ ان تینوں قسم کی آیات میں اصل حکم تو پہلی قسم کی آیت (۲/۱۸۰) میں بیان کیا گیا ہے کہ "اے مسلمانو! اللہ نے تم پر والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا فرض قرار دیا ہے اگر تم اپنے بعد کچھ مال چھوڑ رہے ہو۔ یہ تو اصل حکم ہے اس وصیت کے حکم کے متعلق سورۂ مائدہ (دوسری قسم) کی آیات میں یہ مزید ہدایت فرما دی گئی کہ جب تم یہ وصیت کرو تو دو معتبر آدمیوں کو گواہ ضرور بنالو۔ اور اگر گواہوں کے بیان پر شبہ ہو تو یہ صورت اختیار کرو۔ پھر تیسری قسم کی آیات (۲/۱۸۱-۱۸۲) میں اسی وصیت کے متعلق گواہوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وصیت میں تم کسی طرح کا ردو بدل نہ کرو۔ البتہ اگر تمھیں کسی طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو بجائے وصیت میں از خود ردّو بدل کرنے کے ورثار کو سمجھا بجھا کر اصلاح کی کوشش کرو۔ بہرحال دوسری اور تیسری قسم کی آیات میں اسی وصیت کے اصل حکم کے متعلق جو پہلی قسم کی آیت میں پیش کیا گیا تھا مزید ہدایات دیکر اس کی تکمیل کی گئی ہے ۔ لہٰذا پہلی قسم کی آیت تو اصل حکم پر مشتمل ہے اور دوسری اور تیسری قسم کی آیات اس حکم سے متعلق ہیں اور اسی کی تکمیل کر رہی ہیں ۔

وصیّت کی آیات منسوخ نہیں ہیں

ہمارے علمار عام طور پر وصیت کی آیات کو منسوخ مانتے ہیں اور فرماتے

ہیں کہ آیاتِ میراث کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ ہر آدمی اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کر دے اور بتا دے کہ کس رشتہ دار کو کیا دیا جائے گا۔ لیکن جب حق تعالیٰ نے وراثت کے احکام نازل فرمادیئے تو اقربار کے لئے وصیت کرنے کا یہ حکم جو آیت (۲/۱۸۰) میں دیا گیا تھا وہ منسوخ ہو گیا۔ اب غیر ورثار کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے اور وہ بھی ایک تہائی تک۔ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن علمار کرام کا یہ مؤقف بوجوہ ناقابلِ قبول ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

وجہ اول سب سے پہلی وجہ تو اصولی ہے کہ ہمارے نزدیک قرآن کریم کے اندر آج کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو منسوخ ہو۔ ہم نسخ کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک جو آیات حق تعالیٰ نے منسوخ فرمادی ہیں وہ اب قرآن کریم میں موجود نہیں ہیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(۲/۱۰۶)

ہم کوئی آیت منسوخ نہیں کرتے یا نہیں بھلا دیتے تو ہم اس سے بہتر یا اس کے مثل کوئی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) آپ جانتے نہیں کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے۔

جو آیات منسوخ ہوئی تھیں وہ منسوخ ہو گئیں اور لوگو نکے

ذہنوں سے بھلا کر مٹا دی گئیں اب وہ قرآن میں موجود نہیں ہیں۔
اب جو کچھ قرآن کریم میں موجود ہے وہ محکم اور غیر منسوخ ہے۔ امام ابو بکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں لکھا ہے ———

——— کہ "بعض متأخرین نے جو اہلِ فقہ میں سے نہیں ہیں کہا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نسخ نہیں ہے اور جو کچھ قرآن کریم میں نسخ کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد انبیاءؑ متقدمین کی شریعتوں کا نسخ ہے جیسے سبت، مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر کے نماز وغیرہ پڑھنا ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام آخر الانبیاء ہیں۔ اور آپ کی شریعت ثابت اور باقی رہنے والی ہے جب تک قیامت قائم نہ ہو جائے۔ اور یہ صاحب علمِ بلاغت میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور بہت کچھ علمِ لغت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ لیکن علمِ فقہ اور اصولِ فقہ سے ان کو حصہ نہیں ملا۔ ویسے نہایت سلیم الاعتقاد تھے اور ان کے ظاہر کے خلاف ان پر کوئی بدگمانی بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اپنے اس قول کے اظہار سے وہ توفیق سے دور جا پڑے ہیں۔ (احکام القرآن للرازی صـ۶۷ جـ۱ مطبوعہ مطبعہ مصریہ ۱۳۴۷ھ)

اس کے بعد امام ابو بکر جصاص رازی نے ان کی تردید فرمائی ہے۔ یہ بعض متأخرین کون ہیں جو علمِ بلاغت ولغت میں بقول امام ابو بکر جصاصؒ کے یدِطولیٰ رکھتے ہیں لیکن علمائے فقہ واصول میں سے نہیں ہیں اس پر شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی نے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ———

ابو مسلم اصفہانی نے کہا ہے کہ نسخ اگرچہ عقلاً جائز ہے لیکن اس کا وقوع نہیں ہوا۔ روح المعانی میں ایسا ہی ہے۔"
(احکام القرآن للعثمانی ج۱ ص۱۴۱ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی ۱۳۸۷ھ)

بہرحال ہمارے نزدیک امام ابو مسلم اصفہانیؒ کے قول کا مطلب اگر یہ ہے کہ نسخ کا وقوع مطلقاً ہوا ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اس کی تائید نہیں کرتے اور اگر ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ قرآن کریم میں نسخ کا وقوع نہیں ہے یعنی موجودہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے تو ہم یقیناً اس کی تائید کرتے ہیں۔ اصولی طور پر ہم موجودہ قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔

وجہ دوم خود قرآن کی رو سے وصیت کی آیات کو منسوخ قرار دینے کا دعویٰ اس لئے غلط ہے کہ قرآن کریم میں جہاں وراثت کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں وہ سورہ نساء کی صرف تین آیتیں ہیں (۴/۱۱ و ۱۲ و ۱۷۶) اور ان آیتوں میں۔ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ —— مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ —— مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ —— مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ —— —— چار مرتبہ وصیت کا ذکر فرمادیا گیا ہے کہ میراث کی یہ تقسیم جو ہم بیان کر رہے ہیں، متوفیٰ کی وصیت کو پورا کر لینے اور قرضہ کو ادا کر دینے کے بعد عمل میں آئے گی۔ اگر وصیت کا حکم منسوخ ہو چکا تھا تو خود آیاتِ میراث میں چار مرتبہ وصیت کے حکم کو دُہرانے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ چونکہ خود آیاتِ میراث

میں جو اتفاق سے کل تین ہی آیات ہیں اور ان میں سے دو آیات میں ورثاء کے حصے بیان کرتے کرتے وصیت کو پورا کرنے کی چار مرتبہ تاکید کی جارہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وراثت کی آیات نے وصیت کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا بلکہ اس کو باقی رکھا ہے اور پوری تاکید کے ساتھ باقی رکھا ہے۔

وجہ سوم ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وصیت کا حکم اصل میں سورۃ بقرہ کی آیت ($\frac{2}{180}$) میں وارد ہوا ہے باقی دوسری آیات یعنی ($\frac{2}{181-182}$ اور $\frac{5}{106-108}$) میں اس حکم کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یعنی ($\frac{2}{181-182}$) میں بتایا گیا کہ وصیت کرنے والے نے جب وصیت کردی ہے تو گواہوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اس میں ردو بدل کردیں اور ($\frac{5}{106-108}$) میں بتایا گیا کہ جب کوئی وصیت کرے تو دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنالے۔ اگر سفر میں ہو اور گواہی کے لئے دو مسلمان آدمی نہ مل سکیں تو غیر قوم کے آدمیوں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری تفصیلات اسی وصیت کے حکم کے متعلق ہیں جو سورہ بقرہ کی ($\frac{2}{180}$) میں دیا گیا تھا کہ تم میں سے اگر کوئی مال چھوڑ کر جارہا ہو تو اس پر والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر کے جانا فرض ہے۔ اصل حکم اور اس حکم کی تفصیلات کو ذہن میں رکھئے اور یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ حکم کے بغیر اس کی تفصیلات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اصل حکم تو ہو نہیں اور اس کی تفصیلات موجود ہوں۔ اس مختصر تمہید کے

بعد علامہ شیخ الاسلام ابو بکر جصاص رازیؒ کی یہ تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ـــــــــــــ اور ضمرۃ ابن جندب اور عطیہ ابن قیس نے روایت کیا ہے۔ دونوں کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ مائدہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری سورت ہے۔ لہٰذا اس کے حلال کو حلال کرو اور اس کے حرام کو حرام کرو۔ نیز جبیر ابن نفیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ سورۂ مائدہ وہ آخری سورت ہے جو نازل ہوئی لہٰذا جو تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال کرو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ اور ابو اسحٰق نے ابو میسرہ سے نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ میں اٹھارہ فرائض کا بیان کیا گیا ہے اس میں کوئی منسوخ نہیں ہے۔ اور امام حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ سورۂ مائدہ میں سے کوئی بات منسوخ نہیں ہے۔ یہ تمام حضرات اسی طرف گئے ہیں کہ ان آیات میں (وصیت پر گواہ بنا لینے والی آیات $\frac{5}{106-108}$) میں کوئی چیز منسوخ نہیں ہے۔

(احکام القرآن للامام الجصاص الرازی ص $\frac{598}{2ج}$ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصر ۱۳۴۷ھ) ـــــــــــــ

ان تمام ارشادات کو دیکھتے ہوئے جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ ابو میسرہؒ اور حسن بصریؒ کے ارشادات بھی شامل ہیں جو اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ سورۂ مائدہ کی آیات ($\frac{5}{106-108}$) ثابت ہیں

منسوخ نہیں ہیں۔ ان آیات میں اسی وصیت کے لئے جس کا حکم (۲/۱۸۰) میں دیا گیا تھا کہ اگر تم میں سے کوئی مال چھوڑ کر مر رہا ہو تو اپنے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے لئے وصیت کر جانا اس پر فرض ہے۔ ان آیات میں اس وصیت پر دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر گواہوں کے بیان پر کوئی شک ہو کہ وہ صحیح بیان دے رہے ہیں یا خورد بُرد کر رہے ہیں تو اس صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا اس کا بیان کیا گیا ہے۔ اب یہ صورت انتہائی حیرت ناک اور اُضحوکہ بن جائیگی کہ اصل حکم کی تفصیل اور اس کے تضمّنات کا بیان تو ثابت اور غیر منسوخ ہو لیکن اصل حکم کے متعلق یہ کہدیا جائے کہ وہ منسوخ ہو گیا ہے۔ جب وصیت کا حکم ہی منسوخ ہو گیا اور وہ باقی نہیں رہا تو گواہ کس چیز کے بنائے جا رہے ہیں۔ یہ تفصیلات کس کی بیان کی جا رہی ہیں کہ اگر گواہوں کے بیان پر شبہ ہو جائے تو یہ طریقہ اختیار کرنا۔ واضح رہے کہ اصل حکم محض وصیت کا نہیں تھا۔ بلکہ والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے لئے وصیت کر کے جانے کا تھا۔ اور آیات (۵/۱۰۶-۱۰۸) اور (۲/۱۸۱-۱۸۲) میں اسی حکم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا اگر نزول کے اعتبار سے سورۂ مائدہ آخری سورت ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہے تو لا محالہ وصیت کی آیت (۲/۱۸۰) بھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سورۂ مائدہ کی آیات (۵/۱۰۶-۱۰۸) میں سورۂ بقرہ کے وصیت کے حکم ہی کی تفاصیل تو بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کے مسئلہ سے بحث کر کے ہم اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کر دیں۔ ہمارے علمائے اصول نے نسخ کے سلسلہ میں فقہائے حنفیہ کا جو مسلک بیان کیا ہے اس نے ہمیں مطمئن نہیں کیا علمائے احناف کا یہ فیصلہ فقہ حنفی کے مزاج کے بھی منافی ہے کیونکہ فقہ حنفی تمام دیگر فقہی مسالک سے اس امر میں منفرد اور ممتاز ہے کہ وہ اَدِلّۂ شرعیہ کو اپنے اپنے مقام پر رکھتی ہے اور کسی کو نہ اپنے مقام سے گراتی ہے اور نہ کسی کو حد سے بڑھاتی ہے۔ وہ فقہی مسائل کے استنباط میں قرآن کریم کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے چنانچہ اس کے مامورات کو فرض اور اسی کے منہیات کو حرام ٹھہراتی ہے۔ سنت سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں انھیں واجب یا سنت اور اسکے منہیات کو مکروہِ تحریمی قرار دیتی ہے۔ اور اس کے بعد مستحب، مندوب، مکروہِ تنزیہی اور ناپسندیدہ بتاتی ہے۔ حنفی مسلک سنت کے ذریعہ سے عام طور پر کتاب اللہ پر زیادت کا قائل نہیں۔ سنت کے ذریعہ سے کتاب اللہ کے مطلق کو مقیّد کرنا، عام کو خاص کر لینا بھی فقہ حنفی کے مطابق جائز نہیں جب کہ فقہائے شافعیہؒ کے ہاں یہ سارے امور جائز ہیں لیکن نسخ کے معاملہ میں ہمارے اصحابِ اُصول نے جو کچھ بیان فرمایا ہے وہ فقہ حنفی کے اس مزاج سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ میں اس سلسلہ میں نور الانوار کا طویل اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ذرا غور فرمائیں۔

بات یوں شروع ہوتی ہے ــــــــــــ یہ حُجج
شرعیہ یعنی کتاب اور سنت کا بیان کہا جا سکتا ہے۔ یعنی متکلم اسکی
وضاحت، وضاحت کی پانچوں اقسام و انواع کے ذریعہ سے کرسکتا
ہے" ــــــ اس کے بعد ان پانچوں وضاحتوں کی تفصیل پیش
کی ہے۔ چنانچہ وہ تفصیل یہ ہے۔ بیان تقریر، بیان تفسیر۔
بیان تغییر۔ بیان ضرورت اور بیان تبدیل۔ اسی کو لغت
میں نسخ کہتے ہیں ــــــ (اسے بیانِ تبدیل کہنا یوں صحیح ہے کہ)
حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ
بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ
(١٦/١٠١)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل
دیتے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا
ہے تو (کفار) کہتے ہیں کہ (اے پیغمبر!) تو محض افتراء
کرنے والا ہے۔

پھر دوسری جگہ اسی کو یوں کہا ہے

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ
مِّنْهَآ۔
(٢/١٠٦)

ہم کسی آیت کو جو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس
سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ تبدیل اور نسخ ایک ہی چیز ہے۔ اور اسے بیانِ

تبدیل کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک معنے میں بیان ہے اور دوسرے معنے میں تبدیل ہے ...... ۔ اور وہ مطلق حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے جو اللہ کو تو معلوم تھا ۔ لیکن اس نے اسے مطلق رکھا تھا تو بظاہر وہ انسانوں کے حق میں باقی رہنے والا حکم تھا ۔ یعنی خدا نے مثلاً شراب کو ابتداءِ اسلام میں حلال رکھا ۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ کچھ وقت کے بعد اسے یقیناً حرام کرے گا ۔ لیکن اس نے ہم سے نہیں کہا کہ میں مدتِ معینہ تک اسے حلال کر رہا ہوں ۔ تو ہمارے خیال میں یہی بات تھی کہ یہ اِباحت قیامت تک باقی رہے گی ۔ لیکن جب یکبارگی اس کے بعد تحریم کا حکم آگیا تو وہ ہمارے حق میں حکم تبدیل ہو گیا ۔ کیونکہ اس حکم نے اِباحت کو حرمت سے بدل دیا ۔ اور صاحبِ شرع (حق تعالیٰ) کے حق میں محض بیان رہا ۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے علم میں اِباحت کی مدت موجود تھی ۔ تو حق تعالےٰ کے حق میں اس کا بیان ہونا اور انسان کے حق میں اس کا تبدیل ہونا ایسا ہی ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو قتل کر دے ۔ تو یہ اللہ کے علم میں اس کی مقدر شدہ موت کی مدت کا بیان ہے اور لوگوں کے حق میں یہ تبدیلی ہے ۔ کیونکہ وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ اگر وہ آدمی اسے قتل نہ کرتا تو وہ مزید عرصہ تک زندہ رہتا ۔ تو قاتل نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ۔ اسی وجہ سے دنیا میں اس پر قصاص اور دِیت واجب ہوتی ہے اور آخرت میں عذاب واجب ہوتا ہے ۔ اور یہ نسخ اور تبدیل اس آیت کی وجہ سے جو ہم نے بیان کر دی ہے ہمارے نزدیک جائز ہے ۔

(مسلمانوں میں معتزلہ مثلاً ابو مسلم اصفہانی اور جاحظ وغیرہ نسخ کے قائل نہیں جیسا کہ نور الانوار کے حاشیہ میں درج ہے ۔ مترجم) ....

اور نسخ کتاب اور سنت سے اتفاقاً اور اختلافاً جائز ہے۔ یعنی کتاب کو کتاب سے اور سنت سے، ایسے ہی سنت کو کتاب سے اور سنت سے منسوخ کر سکتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک چاروں صورتیں جائز ہیں ۔ امام شافعیؒ اختلاف کی صورت میں اس کے مخالف ہیں ۔ چنانچہ ان کے نزدیک کتاب کو کتاب سے اور سنت کو سنت سے منسوخ کر سکتے ہیں مگر کتاب کو سنت سے اور سنت کو کتاب سے منسوخ نہیں کر سکتے۔ [نواب صدیق حسن خاں صاحب نے امام صیرفیؒ اور خفافؒ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے ملاحظہ ہو حصول المامول فی علم الاصول صـ۸۲ عثمانی]

ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر کتاب کو سنت سے منسوخ کرنا جائز ہو تو اعتراض کرنے والے کہیں گے کہ لو، رسول ہی نے سب سے پہلے اللہ کی تکذیب کر دی تو اس کی تبلیغ پر ایمان کیسے لایا جائے ۔ اور اگر سنت کو کتاب سے منسوخ کر دینا جائز ہو تو اعتراض کرنے والے کہیں گے کہ لو ۔ اللہ ہی نے اپنے رسول کو جھٹلا دیا تو اس رسول کی بات کو کیسے مانا جائے۔

ہم کہیں گے کہ ان اعتراضات سے تو چھٹکارا ممکن نہیں ہے ۔ متفقاً نسخ کی صورت میں بھی اعتراض ہو سکتا ہے کہ رسول نے خود اپنی بات کو اور اللہ نے خود اپنی بات کو جھٹلا دیا ۔ یہ تو

جاہل احمقوں کے اعتراضات ہیں۔ ان کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اور امام شافعیؒ نے کتاب اللہ کو سنت سے منسوخ کرنے کے خلاف اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا مَا رُوِیَ لَکُمْ عَنِّیْ فَاعْرِضُوْہُ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ فَمَا وَافَقَہٗ فَاقْبَلُوْہُ وَمَا خَالَفَہٗ فَرُدُّوْہُ جب تمہارے سامنے میری کوئی حدیث پیش کی جائے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو۔ اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو تو اسے قبول کرلو ورنہ اسے رد کردو۔ اس حدیث کے مطابق، کتاب اللہ کو سنت سے کیسے منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی سنت کو کتاب اللہ سے منسوخ کرنا قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کا ارشاد تو یہ ہے لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (اے پیغمبر! تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں بیان کردیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں) تو اگر سنت قرآن سے منسوخ ہونے لگے تو وہ کتاب اللہ کا بیان کیسے ہوسکتی ہے۔''

(نورالانوار صفحہ ۲۱۰-۲۱۱ مطبوعہ سعید کمپنی پاکستان چوک)

نورالانوار کے اس طویل اقتباس میں علاوہ اس کے کہ شافعیہ اور حنفیہؒ کا جو موقف بیان کیا گیا ہے وہ شافعیؒ اور حنفی مکتب فکر دونوں کے مزاج کے منافی ہے۔ کیونکہ فقہائے حنفیہ کتاب اللہ کی سربلندی کے بڑے علم بردار اور شافعیہ سنتِ نبوی کے انتہائی حمایتی (اور Champion) مانے جاتے ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں ایسا نظر آتا ہے کہ شائد غلطی سے کسی نے امام

ابوحنیفہؒ کی جگہ امام شافعیؒ اور امام شافعیؒ کی جگہ امام ابوحنیفہؒ کا نام رکھدیا ہے۔ بہرحال جو بھی صورت ہو واقعہ یہی ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا موقف قطعًا صحیح ہے اور فقہائے حنفیہ کا موقف ناقابلِ یقین ہے۔ کیونکہ وہ قطعًا قرآن کے خلاف ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۝

(۱۰/۱۵)

اور جب اُن پر ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی توقع نہیں رکھتے وہ کہنے لگتے ہیں کہ (اے پیغمبر!) کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو۔ (اے پیغمبر) کہدیجئے کہ میں اسے اپنی طرف سے نہیں بدل سکتا۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

سورۂ قٓ میں ہے۔

مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ

لِلْعَبِيْدِ ۝ (۵۰/۲۹)

میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں ۔

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰/۶۴)

اللہ کی باتوں کے لئے بدلنا نہیں ہے ۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے

اور وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ج وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۶/۶۴)

اللہ کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے اور تمام رسولوں کا حال آپ کو معلوم ہو چکا ہے ۔

اور وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات سچائی اور توازن میں مکمل ہو چکی ہے ۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے ۔

اور وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ج لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ؕ (۱۸/۲۷)

اور (اے پیغمبر) جو کچھ آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرو، اللہ کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں اور آپ اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے ۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن ہی کے اتباع کا حکم تھا اور آپ اسی کا اتباع فرماتے تھے۔ آپ قرآن کے احکام میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں فرماتے تھے۔ سورہ اَنعام میں ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ (۶/۵۰)

میں تم سے یہ تو نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے

سورۂ اعراف میں ہے

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ (۷/۲۰۳)

اے پیغمبر! کہدو۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی جانب سے وحی کی جاتی ہے۔

سورۂ احقاف میں ہے۔

قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۴۶/۹)

اے پیغمبر کہدو، میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں۔ مجھے کیا معلوم کہ کل میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ میں تو صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

سورۂ جاثیہ میں ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۤءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥

(۴۵/۱۸)

پھر اے پیغمبر ہم نے آپ کو دین کے ایک طریقہ پر
کر دیا ہے آپ اسی کی پیروی کرتے جایئے اور جاہلوں
کی خواہشات کا اتباع نہ کیجئے۔

سورۂ مائدہ میں ہے

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَاۤءَهُمْ عَمَّا جَاۤءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ

(۵/۴۸)

اے پیغمبر! ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلے کیجئے
جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اور ان کی خواہشات کی
پیروی نہ کیجئے یعنی اس حق کے بجائے جو آپ کے
پاس آچکا ہے۔

اگلی آیت میں پھر دوبارہ تاکید ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
تَتَّبِعْ اَهْوَاۤءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ
يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

(۵/۴۹)

اور ان کے درمیان جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس
کے مطابق فیصلے کیجئے اور ان سے بچتے رہئے کہیں وہ

آپ کو ان بعض احکام سے جو اللہ نے آپ کی
طرف نازل کیے ہیں بچلا نہ دیں۔

اور اِتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)
اے پیغمبر! اس کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف
آپ کے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ (۱۰/۱۰۹)
اے پیغمبر! اسی کی پیروی کیجئے جو وحی کی جاتی ہے
اور اس پر جمے رہیے۔

اور وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ
(۳۳/۲)
اے پیغمبر! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف
سے وحی کی جاتی ہے اسی کی پیروی کیجئے۔

اور فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ
(۴۳/۴۳)
تو اے پیغمبر جو کچھ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے
مضبوطی سے تھام لیجئے۔

اس مسئلہ پر معتزلہ یعنی مثلاً ابو مسلم اصفہانی اور جاحظ وغیرہ نیز امام صیرفی اور خفاف وغیرہ نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی جگہ ہے لیکن ہمیں اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے بھی غور کرنا چاہئے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم حق تعالےٰ کی طرف عطا فرمایا ہوا ایک دستورِ حیات ہے۔ ایک ضابطۂ قوانین ہے۔ قانون اور دستور

کے لئے اس کا محکم ہوتا انتہائی ضروری ہے تاکہ اس پر ان لوگوں کا اعتماد قائم ہو سکے جن کے لئے وہ قانون بنایا گیا ہے۔ اگر لوگوں کو اس قانون اور اس کے نتائج دعواقب پر اعتماد نہیں ہوگا تو وہ نہ اس قانون کی پابندی کر سکیں گے اور نہ اعتماد کے ساتھ ارتقائی میدان میں ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں گے اور نہ دنیا میں کبھی بھی امن و سکون کی فضا قائم ہو سکے گی۔ آیئے دیکھیں کہ نظامِ کائنات میں خدا کے قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ جس نظامِ کائنات کے طبیعی قوانین اتنے محکم اور اٹل ہیں اس کے ملی اور معاشرتی قوانین بھی اسی طرح اٹل ہونے چاہیئیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے آگ میں انگلی ڈالئے تو وہ جل جاتی ہے اور اس کے جلنے سے تکلیف ہوتی ہے یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ قانون کس طرح کارفرما ہے۔ آپ لوگوں کے سامنے آگ میں انگلی ڈالیں گے تو تو بھی وہ جل جائے گی۔ آپ کسی کمرے کی تنہائی میں —— جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو —— ایسا کریں گے، تب بھی وہ جل جائے گی۔ بالفاظِ دیگر اس جرم کی سزا کے لئے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہے۔ نہ پولیس نہ خارجی عدالت کی۔ یہ بھی نہیں کہ آپ اس امر کا اقرار کریں کہ میں نے آگ میں انگلی ڈالی تھی تو آپ کے درد ہو اور اگر آپ انکار کر دیں تو درد نہ ہو۔ اس جرم کی سزا آپ کو دونوں صورتوں میں ملے گی۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ ایک ہزار روپئے رشوت دیدیں یا کسی بڑے سے بڑے حاکمِ

وقت کی سفارش لے آئیں تو سزا سے بچ جائیں ۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آگ میں انگلی تو آپ ڈالیں اور درد کسی اور کے ہو جائے ۔ حتّیٰ کہ آپ کی غم خوار بیوی، ماں باپ، بہن بھائی اگر آپ کا درد بٹانا چاہیں تو نہیں بٹا سکتے ۔ چونکہ خدا کا یہ قانون محکم اور اٹل ہے اس لئے محض اس کے محکم اور اٹل ہونے ہی کی وجہ سے دنیا کا کوئی بھی انسان جانتے بوجھتے عمداً اس کی جرأت نہیں کرپاتا کہ آگ میں ہاتھ ڈال دے ۔ اس کے برعکس انسانوں کے نظامِ قانون میں آپ چوری کرتے ہیں جہاں آپ کو کسی نے نہیں دیکھا تو آپ سزا سے بچ جاتے ہیں آپ اگر پولیس کی گرفت میں بھی آجاتے ہیں تو رشوت اور سفارش سے آپ کام لے سکتے ہیں کہ آپ کا چالان بھی ہو جائے ۔ معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تب بھی آپ رشوت دیکر یا سفارش بہم پہنچا کر عدالت سے بری ہو سکتے ہیں عدالت سے آپ کو سزا بھی ہو جائے اور آپ جیل بھی چلے جائیں تب بھی یہ ممکن ہے کہ جیلر کو رشوت دیکر یا اس تک سفارش پہنچا کر آپ چکی پیسنے سے بچ جائیں ۔ قانون کی نامحکمی ہی تو ہے کہ جرائم میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ جتنی جیلیں بھرتی جاتی ہیں جرائم کی رفتار اسی تناسب سے دن بدن بڑھتی جاتی ہے ۔ لوگوں کو قانونِ جزا و سزا پر چونکہ اعتماد نہیں ہے اس لئے ہزار جیلیں بھر دیجئے، جرائم کا یہی حال رہے گا ۔

قدرت کا یہ قانون ہے کہ اگر کوئی مکعب چیز پانی میں چھوڑ دی جائے تو وہ تیرتی رہتی ہے، ڈوبتی نہیں ۔ لوگوں کو قانون کی اس

اس محکمیت پر اعتماد تھا تو انہوں نے ہزاروں ٹن کے وزنی جہاز بنا ڈالے ۔ اور سمندروں کو فتح کر لیا ۔ اگر قدرت کے قوانین میں بھی انسانی قوانین کی طرح ردوبدل اور نسخ ہوا کرتا تو انسانی تمدن کبھی بھی ارتقار کے میدان میں ایک قدم آگے نہ بڑھا سکتا یہ قوانین قدرت کی محکمیت ہی تو ہے کہ آج انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی جرأت کر رہا ہے ۔ قرآن کریم بھی انسانوں کے لئے ایک ضابطۂ قوانین ہے جو انسانوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ کا بنایا ہوا ہے ۔ اس کے قوانین اور ان کے نتائج بھی طبعی قوانین کی طرح محکم اور اٹل ہیں ۔ ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ بیشک انسانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس قانون کو تسلیم کریں اور چاہیں تو اس کا انکار کر دیں ۔ لیکن آپ قانون کا انکار کر سکتے ہیں ۔ لیکن قوانین کے نتائج و عواقب کو تبدیل نہیں کر سکتے ۔ اس سلسلہ میں آپ مجبور محض ہیں ۔ قرآن نے چوری کرنے سے منع کیا ہے ۔ جھوٹ بولنے سے منع کیا ہے ۔ آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ اس قانون کو مانیں یا نہ مانیں ۔ آپ چوری کریں یا نہ کریں ۔ آپ جھوٹ بولیں یا نہ بولیں لیکن قدرتِ الٰہی نے چوری کرنے اور جھوٹ بولنے کا جو نتیجہ مقرر کیا ہے ، جو اس کی عاقبت رکھی ہے ۔ اسے آپ تبدیل نہیں کر سکتے ۔ جو نتیجہ ان اعمال سے ذات پر مرتّب ہوتا ہے وہ یقیناً ہو کر رہے گا ۔ یہ قانون کی محکمیت کا تقاضا ہے ۔ اگر انہیں روز تبدیلیاں ہوتی رہیں اور نسخ و فسخ کا سلسلہ جاری رہے تو

نہ قانون پر لوگوں کو اعتماد قائم ہوگا اور نہ وہ اپنے نتائج مرتّب کر سکے گا۔ ان کا حال وہی ہو جائیگا جو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا ہوتا ہے کہ جیلیں بھرتی چلی جا رہی ہیں اور جرائم بیش از بیش ہوتے جا رہے ہیں۔

انسان عہدِ طفولیت میں تھا۔ اس نے تہذیب و تمدن آہستہ آہستہ سیکھا ہے۔ لہٰذا اسے قوانین بھی آہستہ آہستہ دیئے گئے۔ جوں جوں اس کا قدم آگے بڑھتا رہا قوانین میں بھی ترقی ہوتی رہی لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول اور نبی تھے۔ آپ کو جو شریعت دی گئی وہ آخری اور مکمل ترین شریعت تھی یہ نوعِ انسانی کو اس وقت دی گئی جب وہ عہدِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی اور اب اسے ان تبدیلیوں سے واسطہ نہیں رہا تھا جو عہدِ طفولیت میں اس کے لئے لازمی تھیں۔ لہٰذا اس میں اب کوئی حک و اضافہ کا امکان ہی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اس آخری شریعت میں کسی رد و بدل اور نسخ وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي کا مطلب ہی یہ ہے کہ اب اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے اس میں جتنی کچھ کمی بیشی ہو سکتی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک ہو سکتی تھی۔ لیکن جوں ہی حق تعالیٰ نے تکمیلِ دین اور اِتمامِ نعمت کا اعلان فرما دیا اور اپنے آخری رسول کو اپنے پاس بلا لیا تو حک و اضافہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ختمِ نبوت کے اعلان کا مطلب ہی یہ ہے کہ اب دین میں نئی ہدایات

کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ لہٰذا موجودہ قرآن کریم میں ایسی آیات کو تسلیم کرنا جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ناقابلِ تصور ہے اور احادیث کے ذریعہ سے قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دیدینا تو انتہائی ناقابلِ قبول ہے حدیث کتنی ہی متواتر یا مشہور کیوں نہ ہو اس کا مرتبہ قرآن کریم سے بہر حال فروتر ہے۔ قرآن کریم ہر اعتبار سے احادیث سے بلند تر ہے۔ جو چیز ناسخ ہو سکتی ہے اسے لامحالہ منسوخ سے بلند تر ہونا چاہیئے۔ حدیثِ متواتر یا حدیثِ مشہور قرآنِ کریم سے بلند تر تو نہیں ہو سکتیں احادیثِ مشہورہ کے ذریعہ سے قرآن کریم کی آیات کو منسوخ کر دینا ایسا موقف ہے جس کی تائید نہیں کیجا سکتی۔ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کے مسلک کا یہ جزو کہ کتاب اللہ کو سنت سے خواہ وہ متواتر ہو یا مشہور ہو منسوخ کر دینا صحیح نہیں ہو سکتا ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح ہے۔ البتہ ہم انکے مسلک کے دوسرے جزو سے اتفاق نہیں کرتے کہ سنت کو بھی قرآن کریم سے منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کتاب اللہ کا درجہ بہر حال سنت سے بدرجہا بلند ہے۔ اور جو چیز مرتبہ میں بلند ہے وہ اپنے سے کمتر اور فروتر چیز کو منسوخ کر سکتی ہے۔ ہماری تائید مسند احمد ابن حنبل کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے صاحبِ مشکوٰۃ نے امام احمد بن حنبل اور امام طبرانی کے حوالے سے اپنے ہاں نقل کیا ہے نیز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی حجۃ اللہ البالغۃ میں نقل فرمایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ کَلَامِی لَا یَنْسَخُ کَلَامَ اللّٰہِ وَ کَلَامُ اللّٰہِ یَنْسَخُ

کَلَامِیْ ۔ وَکَلَامُ اللّٰہِ یَنْسَخُ بَعْضُہٗ بَعْضًا (میرا کلام، اللہ کے کلام کو منسوخ نہیں کرسکتا ۔ اور اللہ کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرسکتا ہے۔ اور اللہ کا کلام خود اللہ کے کلام کو بھی منسوخ کرسکتا ہے) ۔ لہٰذا سنت کو ہم کلام اللہ سے منسوخ کرسکتے ہیں ۔ کلام اللہ خود کلام اللہ کو منسوخ کردے تو اس کا امکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں تھا ۔ آپ کے بعد نہیں رہا ۔ چنانچہ آج کتاب اللہ میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو منسوخ ہوچکی ہو ۔ کتاب اللہ کی جو آیتیں منسوخ ہوئی تھیں وہ کتاب اللہ سے نکال دی گئیں یا لوگوں کے حافظوں سے محو کردی گئیں اور ان کی جگہ دوسری آیات نے لیلی ۔ اب کتاب اللہ میں جس قدر آیات ہیں وہ سب ثابت، محکم اور قابلِ عمل ہیں ۔

صاحبِ نورالانوار نے امام شافعیؒ کے رد میں کوئی دلیل نہیں دی ۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ "—— ان اعتراضات سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے ۔ متفقاً نسخ کی صورت میں بھی اعتراض ہوسکتا ہے کہ رسول نے خود اپنی بات کو اور اللہ نے خود اپنی بات کو جھٹلا دیا ۔ یہ تو جاہل احمقوں کے اعتراضات ہیں ان کی پروا نہیں کرنی چاہئے ——" کافی نہیں ہے ۔ یہ بات واقعی غور طلب ہے کہ ایک طرف رسول کا دعوٰی یہ ہے کہ میں خود کچھ نہیں کہہ رہا ۔ میں تو اللہ کا پیغام پہنچا رہا ہوں ۔ دوسری طرف وہ خدا کا ایک پیغام پہنچاتا ہے اور پھر خود اس پیغام کے خلاف حکم دیتا ہے ۔ تو ایسے شخص کی بات پر

کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یا تو خدا کا پیغام خدا کا پیغام نہیں تھا۔ یا جو کچھ وہ بعد میں کہہ رہا ہے، وہ غلط کہہ رہا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ رہ گئی وہ دلیل جو انہوں نے منکرینِ نسخ کے مقابلہ میں دی ہے وہ بھی قوی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کا حکیم ہونا، بندوں کی مصلحتوں کو جان کر روزانہ اپنے علم اور مصلحت کے مطابق فیصلے کرتے رہنا اور یہ مثال دینا کہ جیسا کہ ایک طبیبِ حاذق اپنے مریض کے حالات و مزاج کے مطابق روزانہ دوا اور غذا میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالےٰ بھی اپنے احکام بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ دلیل تسلیم کر لی جائے تو لوگوں کے حالات اور مصلحتیں تو کسی ایک مقام پر رک نہیں گئیں۔ وہ تو اب بھی بدلتی رہتی ہیں تو اس نسخ کا دروازہ آج بھی کھلا رہنا چاہیئے۔ پھر اگر کوئی مدعئی نبوت اسی دلیل سے کام لیتے ہوئے کوئی نئی ہدایت لانے کا دعویٰ کر دیتا ہے تو آپ اسے کیوں مطعون کرتے ہیں؟

ابومسلم اصفہانی، جاحظ، اور ان کے ہم نوا حضرات موجودہ قرآن میں نسخ کے منکر ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ اب قرآن میں منسوخ آیات موجود ہیں۔ نیز امام شافعیؒ، امام صیرفیؒ اور امام خفاف اس کے منکر ہیں کہ قرآن کریم کی آیات کو احادیث و سنن سے منسوخ کر دیا جائے۔ بہرحال ان حضرات کا موقف ہمارے خیال میں صحیح ہے۔ ہمیں صرف اس وجہ سے کہ ہمارا تعلق فقہ حنفی سے ہے، حنفی فقہ کی ہر بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے بجائے تحقیق سے کام لینا چاہیئے اور اگر کوئی بات حق سے دور نظر آتی

ہے تو اس کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے لـه

لـه والد ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے انجاز الوطن عن الازدراء بامام الزمن یعنی مقدمہ اعلاء السنن میں اپنا ایک خواب نقل فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کل رات شب چہار شنبہ ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر زیارت کے لئے حاضر ہوا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جنھیں میں پہچانتا ہوں وہ قبر پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ میں نے اُنھیں ڈانٹا اور وہاں سے ہٹا دیا۔ پھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے میں مشغول ہو گیا۔ اور میں نے ان مدرس سے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر کے قریب قرآن وحدیث کے علاوہ مثلاً نحو اور فقہ وغیرہما کا درس نہ دیا کرو۔ اس سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہوتی ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ فقہ سے بھی اذیت ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں! اگر تم اپنے مسلک کی تائید میں صحیح حدیث کو رد کر دیتے ہو یا اس کی ایسی تاویل کرتے ہو جو حضور اکرمؐ کو پسند نہیں آتی۔ پھر میں نے دیکھا کہ قبر شریف شق ہونے لگی اور میں درود سلام میں مشغول ہو گیا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی اور درود وسلام کے الفاظ میری زبان پر جاری تھے۔ اللھم صلّ وسلّم وبارِک علیٰ سیّدِنا ومولانا محمدٍ وآلہٖ واصحابہٖ کما تحب وترضیٰ (ص۵۶ مطبوعہ سپیر آرٹ پریس۔ فریر روڈ کراچی)

خلاصہ یہ کہ اس مسلکی عصبیت سے نہ اللہ خوش ہو سکتا ہے نہ اس کا رسول کہ ہم ایک غلط بات اپنے مسلک کی پیچ میں گرفتار ہو کر غلط تاویلات سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کریں لیکن اس غلط عصبیت میں ہمارے بڑے بڑے علماء گرفتار ہیں۔ مؤلف

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہمارے ارباب اصول نے نسخ کا نام بیانِ تبدیل رکھا ہے اور نسخ اور تبدیل کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ——————— "وہ ایک اعتبار سے بیان ہوتا ہے اور دوسرے اعتبار سے تبدیل ہوتا ہے۔ اس بنار پر مؤلف المنار نے کہا ہے۔ وہ حکم مطلق کی مدت کا بیان ہوتا ہے جو اللہ کو معلوم تھا۔ مگر اُس نے اسے مطلق رکھا تھا تو انسان کے حق میں اس کا ظاہر بقاء تھا۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے شراب کو مثلاً ابتدارِ اسلام میں حرام نہیں فرمایا اور اس کے علم میں یہ بات تھی کہ ایک مدت کے بعد وہ اسے ضرور ہی حرام کر دے گا۔ لیکن ہم سے اس نے یہ نہیں کہا کہ میں مدتِ معینہ تک اسے حلال کر رہا ہوں۔ بلکہ اس نے اِباحت کو مطلق رکھا۔ تو ہمارے خیال میں یہی بات رہی کہ یہ اِباحت قیامت کے دن تک باقی رہے گی۔ پھر جب اس کی تحریم یکبارگی آگئی تو یہ ہمارے حق میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن صاحبِ شرع کے حق میں یہ محض ایک بیان ہی بیان تھا۔

(نور الانوار ص۲۱۱)

ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا نام بدل دینے سے وہ حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی نسخ کا نام اگر بیان تبدیل رکھ دیا جائے تو نسخ کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ نسخ بہر حال حکم الٰہی میں تبدیلی ہے اور قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق خدا کی باتوں میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی (۱۰/۱۵ ذ ۵/۲۹ ذ ۱۰/۶۴ ذ ۶/۱۵

ذ ۱۸/۲ ے) میں حق تعالیٰ نے نہایت واضح طریقہ پر یہ بتا دیا ہے کہ حق تعالیٰ کے کلمات میں (اس کی باتوں میں) کسی تبدیل کا امکان ہی نہیں ہے ۔ بیانِ تبدیل کہئے یا نسخ کہئے بات ایک ہی ہے ۔ اس حقیقت کو ہم لاکھ اپنی فقہی اصطلاحات کے پردوں میں چھپائیں کہ نسخ دراصل کسی حکمِ مطلق کی مدت کا بیان ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں وقت تک باقی رہیگا ، اس کے بعد بدل دیا جائے گا ۔ اس مطلق حکم کی مدت حق تعالےٰ کے علم میں ہوتی ہے مگر بندوں کو معلوم نہیں ہوتی ۔ اس لئے بندے اس وقت تک جب تک ناگہانی طور پر دوسرا حکم نہ آجائے یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ حکم قیامت تک باقی رہے گا ۔ یہ بندوںکی نسبت سے تو تبدیلی ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ کی نسبت سے یہ محض بیان ہوتا ہے وغیر ذلک ۔ ان تعبیرات سے حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ۔

اِس سلسلہ میں حنفیہ کا موقف چونکہ انتہائی کمزور ہے ۔ اس لئے ہمارے فقہاء اسے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بات کسی طرح بنتی نہیں ۔ شیخ الاسلام علامہ ابوبکر جصاص رازی نے اس سلسلہ میں عجیب وغریب تضاد بیانیوں سے کام لیا ہے ۔

وہ فرماتے ہیں ——— " پھر جو حضرات آیاتِ وصیت کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں ان میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کس چیز سے منسوخ ہیں ۔ ہمیں عکرمہؒ اور ابن عباسؓ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ آیاتِ مواریث نے انھیں

منسوخ کردیا ہے ۔ اور ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کا ارشاد لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ہے ۔ اور دوسرے لوگوں نے کہا کہ آیتِ وصیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ نے منسوخ کیا ہے۔ اسے شہر ابن حوشب نے عن عبدالرحمٰن بن عثمان عن عمرو ابن خارجہ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ نیز عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا، وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ۔ اور اسماعیل ابن عیاش عن شرحبیل ابن مسلم کی سند سے ہے کہ میں نے ابو اُمامہؓ کو سنا کہ میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا۔ دیکھو اللہ تعالےٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے ۔ تو وارث کے لئے وصیت نہیں ہے ۔ اور حجاج ابن جریج نے عن عطار الخراسانی عن ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں البتہ یہ کہ ورثار اس وصیت کی اجازت دیدیں ۔ یہ بات صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کی گئی ہے ۔ اسے حجاج عن ابی اسحٰق عن الحارث عن علیؓ نے بھی نقل کیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں نیز عبداللہ ابن بدر نے عن ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ۔ اور یہ خبر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

اس بارے میں منقول ہوئی ہے اور ان مختلف جہات سے وارد ہوئی ہے جنھیں ہم نے بیان کر دیا ہے۔ وہ ہمارے نزدیک تواتُر کے زمرہ میں آتی ہے۔ کیونکہ امت میں وہ مشہور اور عام ہو چکی ہے اور فقہاء نے اسے قبول کر لیا ہے اور اس کے مطابق عمل کیا ہے اور اس جیسی حدیثوں سے ہمارے نزدیک کتاب اللہ کا نسخ جائز ہے جبکہ وہ اس زمرہ میں آتی ہے جو علم کو اور آیات پر عمل کو واجب کر دیتی ہو۔

(احکام القرآن ص ۱۹۳/۱ج)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ علامہ جصاص رازیؒ اس اقتباس میں حدیث نبوی لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ کو معنًا متواتر اور مشہور قرار دے رہے ہیں جس کو فقہاء نے قبول کر لیا اور اس کے مطابق عمل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس جیسی حدیثوں سے ہمارے نزدیک قرآن کا نسخ جائز ہے۔ چنانچہ ان کا موقف یہ ہے کہ وصیت والی آیت اور میراث والی آیت دونوں متعارض ہیں۔ لہٰذا وصیت والی آیت کو منسوخ ماننے کے سوا چارہ نہیں۔ لہٰذہ وہ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ والی اسی حدیث سے منسوخ ہے لیکن اب اس کے خلاف بھی سنئے۔ اسی ضمن میں ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ —

—— لیکن حق تعالیٰ کا وَرَثَہ کے لئے میراث کو واجب کرنا وصیت کے حکم کو منسوخ ہونے کا متقاضی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میراث اور وصیت دونوں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وارث کے لئے وصیت

کو جائز رکھا ہے، جبکہ ورثاء اس کی اجازت دیدیں۔ لہٰذا وصیت اور میراث کا ایک آدمی کے لئے جمع ہوجانا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ اگر صرف آیتِ میراث ہی موجود ہوتی تب بھی یہ محال نہیں تھا۔ اور یہاں تو حق تعالیٰ نے میراث کا حکم وصیت کے بعد ہی رکھا ہے تو اس سے کونسی چیز مانع ہوسکتی ہے کہ آدمی وصیت کا حصّہ الگ ادا کر دے پھر اس کے بعد میراث کا حصہ ادا کر دے۔
______" (احکام القرآن ۱۹۳/ج۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یا تو اس بات پر اصرار ہو رہا تھا کہ آیتِ وصیت منسوخ ہے اور آیتِ میراث سے منسوخ ہے۔ یعنی حضرت علامہ کو دونوں آیتوں میں تعارض نظر آرہا تھا۔ اور وہ مجبور نظر آتے تھے کہ وصیت کی آیت کو منسوخ قرار دیں لیکن اگلے اقتباس میں وہ تضاد، تعارض اور تخالف سارا کا سارا جاتا رہا اور یہ نظر آنے لگا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تضاد یا تعارض نہیں ہے۔ وہ دونوں جمع بھی ہوسکتی ہیں۔ اس کے بعد پھر اور سنئے ______" اور امام شافعی نے کتاب الرسالہ میں فرمایا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آیاتِ میراث، آیاتِ وصیت کی ناسخ ہوں اور ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ ثابت۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجاہد کے طریق سے یہ روایت لی گئی جو منقطع ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ (وارث کے لئے وصیت نہیں ہوسکتی) تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا کہ میراث کی آیتیں والدین اور

قریب ترین رشتہ داروں کے لیئے وصیت کرنے کے حکم کی ناسخ ہیں۔ خبرِ منقطع کے ساتھ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ــــــــــ ــــــــــ" (احکام القرآن ص۱۹۴ ج۱)

دیکھا آپ نے کہ اس سے پہلے حضرت علامہ کو اس پر اصرار تھا کہ "لا وصیۃ لوارث" والی روایت معنًا متواتر ہے۔ کئی صحابہ سے منقول ہے۔ اسے علماء میں کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ فقہاء اسے قبول فرما چکے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ اس جیسی خبر سے تو قرآن کریم کو بھی منسوخ کر دینا ہمارے نزدیک جائز ہے۔ لیکن اب وہ امام شافعی سے نقل فرما رہے ہیں کہ حدیث تو منقطع ہے متصل بھی نہیں ہے۔ اس سے کتاب اللہ کو وہ منسوخ تو نہیں کر سکتے[1] البتہ اس کی مدد سے یہ ضرور

---

[1] تفسیر مظہری ص۱۸۶-۱۸۷ میں ہے، والحدیث حدیث الاحاد لا یجوز بہ النسخ .... لم یصل ذلک النسخ الینا بطریق قطعی .... مارواہ الدارقطنی من حدیث جابر وصوب ارسالہ من ھذا الوجہ ومن حدیث علی واسنادہ ضعیف ..... رواہ ایضا ابن عیاش وشیخہ وھما ضعیفان اسنادہ ضعیف۔ روی ابن جریر والبیضاوی عن الحسن البصریؒ و علاء بن زیاد ومسروق ومسلم بن یسار وغیرھم ان آیۃ الوصیۃ غیر منسوخۃ۔

ترجمہ:۔ اور یہ حدیث حدیث احاد ہے۔ اس سے آیت قرآن کو منسوخ کر دینا جائز نہیں ... نسخ کا یہ حکم ہم تک کسی قطعی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہہ سکتے ہیں کہ آیاتِ میراث سے آیاتِ وصیت کو منسوخ مان لیا جائے۔ واضح رہے کہ پچھلے اقتباس میں حضرت علامہ فرما چکے تھے کہ آیاتِ میراث، آیاتِ وصیت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ ایک کو دوسرے کا ناسخ ماننا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد اگلے اقتباس میں پھر فرماتے ہیں ——————

——————" ابوبکر (یعنی خود جصاص رازیؒ) کہتا ہے کہ امام شافعیؒ نے اس احتمال کا اقرار فرما لیا ہے کہ وصیت اور میراث کے دونوں حکم جمع ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آیاتِ میراث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو وارث کے لئے وصیت کے حکم کے منسوخ ہونے کو ضروری قرار دے سکے۔ لہٰذا وصیت کی آیت میراث کی آیات سے منسوخ نہیں ہوگی۔ کیونکہ دونوں کا جمع ہونا ممکن ہے۔ اور حدیث ان کے نزدیک ثابت نہیں ہو سکی

(صفحہ سابقہ) طریقہ سے نہیں پہنچا۔۔۔۔۔۔ اسے صرف دار قطنی نے جابرؓ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اسی سند سے اس کے مرسل ہونے کی تصویب کی ہے اور حضرت علیؓ کی حدیث سے بھی نقل کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔۔۔۔۔۔۔ اسے ابن عیاش اور ان کے استاذ نے بھی روایت کیا ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔

ابنِ جریر اور بیضاوی نے حسن بصری، علاء بن زیاد، مسروق، مسلم بن یسار وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وصیت کی آیت منسوخ نہیں ہے۔

کیونکہ وہ منقطع طریقہ سے روایت ہوئی ہے اور امام شافعیؒ مرسل روایت کو قبول نہیں کرتے اور اگر یہ حدیث متصل طریقہ سے بلکہ تواتر کے ساتھ بھی منقول ہوتی تب بھی وہ اس حدیث سے آیت کے حکم کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتے تھے۔ کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک سنت کے ذریعہ سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں ہے۔ لہذا ضروری ہوگیا کہ والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے لئے وصیت کا حکم منسوخ نہ ہو بلکہ ثابت ہو۔ کیونکہ ایسی کوئی چیز وارد ہی نہیں ہوئی جو اس کے نسخ کو ضروری قرار دے سکے۔

(احکام القرآن ص ۱۹۴/۱)

امام جصاص رازی صاحبؒ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آیاتِ میراث اور آیاتِ وصیت میں کوئی تعارض تو ہے نہیں دونوں جمع بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ آدمی کی وصیت کو بھی پورا کر دیا جائے اور پھر میراث کو بھی تقسیم کر دیا جائے لہذا آیتیں تو دونوں امام شافعیؒ کے مسلک پر ثابت اور محکم ہونگی۔ رہگئی لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ والی حدیث تو وہ منقطع اور مرسل ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مرسل اور منقطع حدیث قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ لہذا وہ اس حدیث سے بھی آیتِ وصیت کو منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ چونکہ ان کے ہاں سنت سے قرآن کا نسخ جائز نہیں ہوتا اس لئے اگر یہ حدیث متواتر بھی ہوتی تب بھی ان کے مسلک کے مطابق اس سے وصیت کی آیت کو منسوخ

نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا امام شافعیؒ کے مسلک پر کسی طرح بات نہیں بنتی۔ وصیت کی آیت کے مطابق وارث کے لئے وصیت کو وہ بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اور دوسری طرف وارث کے لئے وصیت ان کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے لہٰذا ان کے مسلک کے مطابق معاملہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اللہ کا بڑا شکر ہے کہ حنفیہؒ کو اس مسئلہ میں ایسی کسی دشواری کا سامنا نہیں ہے۔ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ والی حدیث منقطع اور مرسل ہے تو ہوا کرے ہم تو مرسل حدیث کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اور سنت کے ذریعہ سے کتاب اللہ کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے مسلک پر وہ روایت منقطع اور مرسل ہونے کے باوجود مقبول ہے اور اس کے ذریعہ سے کتاب اللہ کا نسخ بھی جائز ہے۔ لہٰذا ہمیں کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔ اگر آیاتِ وراثت اور آیاتِ وصیت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور اس لئے ہم آیات میراث سے وصیت والی آیت کو منسوخ نہیں کہہ سکتے تو حدیث لا وصیۃ لوارث سے اسے منسوخ کر سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کی مشکلات پر امام جصاص رازیؒ کو شادیانے بجانے کا تو حق نہیں ہے۔ اگر ایک شخص کوئی بڑی غلطی کرتا ہے تو اسے اپنے سے چھوٹی غلطی کرنے والے کا مذاق اُڑانا نہیں چاہئے۔ فقہائے احناف کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہیں ہے کہ وہ قرآن کریم کے خلاف ایک ایسی

حدیث نبوی کا سہارا لے رہے ہیں جو تمام محدثین کے نزدیک منقطع اور مرسل ہے اور منقطع مرسل کی روایت اکثر محدثین کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ اول تو حدیث منقطع اور مرسل اور پھر وہ بھی ایسی کہ اول درجہ کی حدیث کی کتابوں (مؤطا اور بخاری ومسلم) میں اسے بار نہیں ملا ۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کی کتابوں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دار قطنی نے اس کو بیان کیا ہے ۔ صحیحین نے اس کی تخریج نہیں کی اور خود فقہائے حنفیہ کی تصریحات کے مطابق اگرچہ مرسل اور منقطع حدیثیں ان کے نزدیک مقبول ہو جاتی ہیں ۔ لیکن ان کا درجہ متصل اور مسند احادیث سے ہر حال میں کمتر اور فروتر ہی ہوتا ہے ۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ـــــ

ـــــــــ "مرسل حدیث ہمارے نزدیک مسند اور متصل حدیث سے کم تر ہوتی ہے ۔ برخلاف ان حضرات کے جو یہ کہتے ہیں کہ جس نے حدیث کی پوری سند بیان کر دی، اس نے حدیث کو تمہارے حوالہ کر دیا (کہ سند کو دیکھ کر تم خود فیصلہ کر دو کہ حدیث کیسی ہے) اور جس نے مرسل حدیث بیان کی ہے وہ تو (حدیث کی صحت کا) خود ضامن ہو گیا ہے ۔

.... اور جب مسند اور مرسل میں تعارض ہو جائے تو مسند کو مقدم رکھا جائے گا الا یہ کہ مرسل کی تقویت ان پانچ وجوہ سے ہو رہی ہو جن کا ذکر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے ـــــــ" (قواعد فی علوم الحدیث ص۱۴۷)

مقدمہ اعلاء السنن مطبوعہ مکتب الاسلامیہ حلب)
لہٰذا ایک تیسرے درجہ کی حدیث سے قرآن کے حکم کو منسوخ ماننا کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ ناسخ اور منسوخ دونوں حکم ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں۔ متعارض ہوتے ہیں۔
قرآن کی آیتِ کریمہ صراحت کے ساتھ فرمارہی ہے کہ والدین اور اقربین کے لئے تم پر وصیت کردینا فرض ہے۔(واضح رہے کہ والدین اور اقربین وارث ہی ہوتے ہیں۔ حدیثِ نبوی فرما رہی ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں کی جاسکتی۔ دونوں احکام ایک دوسرے سے متعارض ہیں۔فقہائے حنفیہ خود اس بات کی تصریح فرمارہے ہیں کہ منقطع حدیث متصل اور مسند سے کم تر ہوتی ہے اور جب ایک مسند حدیث اور مرسل حدیث میں تعارض ہوجائے تو مسند حدیث کو مقدم رکھا جائے گا۔ جائے حیرت ہے کہ مرسل حدیث کے مقابلہ میں مسند حدیث کو تو مقدم رکھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی آیتِ کریمہ کو مقدم نہیں رکھا جاتا۔کیا قرآن کی آیتِ کریمہ ایک مسند حدیث کے درجہ سے بھی گئی گذری ہوگئی؟ ہمیں یقین ہے کہ کوئی عالم تو عالم ایک معمولی جاہل مسلمان بھی اس صورت حالات کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔

حدیث کا صحیح مطلب

لَاوَصِيَّةَ لِوَارِثٍ میں ہمارے فقہاء وارث کے معنے مستحقِ وراثت کے کرتے ہیں۔یعنی ان کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص وارث بننے کا حق دار ہو اس کے لئے وصیت نہیں کیجاسکتی۔

زید کے تین بیٹے ہیں:۔ خالد، حامد، شاہد ۔ زید کے یہ تینوں بیٹے زید کے مرنے کے بعد اصولی طور پر اس کے وارث ہونگے۔ یعنی وہ زید کی زندگی میں وارث تو نہیں بنے البتہ وراثت کے حق دار کہلائے جا سکتے ہیں ۔ تو ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ بیٹے وارث ہونے والے ہیں یعنی وراثت کے مستحق ہیں تو زید کے لئے جائز نہیں ہے کہ بیٹوں میں کسی کے لئے اپنی زندگی میں وصیت کر دے ۔ یہی حال ماں، باپ، بیوی اور بھائی بہنوں کا ہے ۔ لیکن اس لفظ وراثت کے یہ معنے نہیں ہیں۔ چونکہ وراثت کا مستحق کسی شخص کی وفات کے بعد مآل کے اعتبار سے ترکہ حاصل کر لینے والا ہے اس لئے اس شخص کی زندگی میں اسے وارث کہہ دیا جاتا ہے ۔ ورنہ درحقیقت وارث تو وہ اس شخص کے مرنے کے بعد بنے گا ______ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنے کسی چیز کا کسی کی ملکیت میں ہونا اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہو جانا ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ وراثتِ حقیقی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے جس میں اس پر نہ تو کوئی ذمہ داری عائد ہو اور نہ ہی اس سے اس پر کوئی محاسبہ کیا جائے ۔ نیز ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے لئے فَقَدْ وَرِثَ كَذَا کہتے ہیں ۔ لہٰذا وَارِثٌ کے حقیقی معنے مستحقِ وراثت کے نہیں ہیں ۔ بلکہ وراثت میں مال وغیرہ حاصل کر لینے والے کے ہیں ۔

لہٰذا اس حدیثِ نبوی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مستحقِ وراثت کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص وراثت حاصل کرچکا ہے اس کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ یعنی زید نے اپنے ایک بیٹے خالد کے لئے یہ وصیت کی ہے کہ اسے اس کے ترکہ سے دس ہزار روپے دیدیئے جائیں۔ یہ وصیت قطعاً جائز اور صحیح ہے لیکن خالد کو یہ حق نہیں کہ قانونِ وراثت کے ماتحت جو کچھ اسے دوسرے بھائیوں کے برابر ملتا وہ بھی حاصل کرے اور ساتھ ہی اس کا مطالبہ بھی کرے کہ وصیت کے مطابق مجھے دس ہزار روپئے مزید دو۔ وراثت حاصل کرنیوالا شخص وصیت کا مال نہیں لے سکتا۔ وہ صرف وصیت پر اکتفاءؔ کرے یا وراثت پر اکتفا کرے دونوں سے فائدہ نہ اُٹھائے مثلاً زید نے پچاس ہزار روپیہ نقد چھوڑا ہے اور اس نے اپنے ایک بیٹے خالد کے لئے وصیت کی ہے کہ اسے بیس ہزار روپئے دیدئے جائیں تو وہ بیس ہزار روپئے وصیت کی مد میں الگ حاصل کرے اور باقی تیس ہزار میں ورثاء کے ساتھ اپنا حصہ الگ بٹانے لگے۔ یہ صورت جائز نہیں ہے۔ اگر وہ وصیت کا مال لیتا ہے تو وراثت سے دست بردار ہو۔ اور اگر وراثت کے ذریعہ سے اپنا حصہ حاصل کرلیتا ہے تو پھر وصیت سے دست بردار ہو۔ یہ صحیح نہیں کہ دس ہزار روپئے وصیت کے بھی وصول کرے اور پھر وراثت کے حصّہ کے مطابق مثلاً دس ہزار روپئے کا مطالبہ کرے۔ اور اس طرح خود تو بیس ہزار روپئے ہتھیالے اور

دوسرے بھائیوں کے حصہ میں مثلاً صرف دس دس ہزار روپئے آئیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے۔ وہ نہیں ہے جو ہمارے فقہاء نے اس سے سمجھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

وصیت ثُلث تک دوسرا مشہور مسئلہ وصیت کے سلسلہ میں یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ہے۔ یعنی غیر وارث کیلئے بھی اگر وصیت کی جائے تو وہ ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ یہ مسئلہ بھی ہمارے فقہاء کے ہاں متفق علیہ ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ـــــــــ

مختلف شہروں کے فقیہ اس پر متفق ہیں۔ مُوَفّق ابن قُدامہ نے "المغنی" میں فرمایا ہے کہ غیر وارث کے لئے وصیت ایک تہائی میں بلا اجازت کے لازم ہوتی ہے اور ایک تہائی سے زیادہ وَرَثہ کی اجازت پر موقوف رہتی ہے۔ اگر وہ اجازت دیدیں تو جائز ہوگی اور اگر وہ اسے رد کردیں تو باطل ہوجائیگی۔ یہ تمام علماء کا قول ہے ـــــــــ (اِعلاء السنن صفحہ ۲۶۱/ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ فریر روڈ کراچی)

اس موضوع پر بھی ہمیں دو مختلف زاویوں سے بحث کرنی ہے۔ ایک تو اصولی بحث ہے اور دوسرے ان دلائل سے بحث کرنی ہوگی جو ہمارے فقہاء اس سلسلہ میں پیش کرتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ہم اصولی بحث کرتے ہیں۔

اُصولی بحث وصیت کے سلسلہ میں قرآنِ کریم کی یہ آیت

ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○

(۲/۱۸۰)

(اے مسلمانو!) جب کسی کو تم میں سے موت آنے لگے اگر وہ کافی مال چھوڑ کر مر رہا ہو تو تم پر والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کر دینا فرض کر دیا گیا ہے۔ یہ تقویٰ شعار لوگوں پر خدا کا فریضہ ہے۔

اس کے بعد آیاتِ میراث میں بھی چار مرتبہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ کا لفظ تکرار کے ساتھ لایا گیا ہے کہ میراث کی یہ تقسیم وصیت کو پورا کرنے اور قرض کے ادا کرنے کے بعد ہوگی۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں ایک ثُلث کی قید کہیں بھی نہیں لگائی گئی۔ قرآنِ کریم کا یہ حکم مُطلَق ہے۔ اور قرآن کریم کا مطلق حکم مطلق ہی رہتا ہے اسے مقید کر لینا جائز نہیں ہے۔ حتّٰی کہ اگر قرآن کریم کا کوئی حکم ایک معاملہ میں مطلق ہے اور اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں اس حکم کے ساتھ کوئی قید بھی لگی ہوئی ہے تو حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ مُطلَق حکم اپنے اِطلاق پر باقی رہے گا اسے مقید حکم پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ حتّٰی کہ اگر دونوں حُکم مطلق اور مُقیّد ایک ہی حادثہ کے متعلق ہوں، تب بھی دونوں حکم الگ

الگ معمول بہا ہوں گے، مُطلق کو مقیّد پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ اس کی مثال ہمارے فقہاء نے یہ دی ہے کہ ظِہار کے کفّارہ میں قرآنِ کریم نے تین صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱) شوہر ایک غلام آزاد کرے

(۲) دو مہینے لگاتار روزے رکھے

(۳) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ان تین کفّاروں میں سے پہلے دو کفّاروں میں یعنی غلام آزاد کرنے اور دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنے میں قرآنِ کریم نے یہ قید لگائی ہے کہ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا یعنی دونوں کفّارے ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کرنے ہوں گے لیکن تیسرے کفّارہ یعنی ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے میں یہ قید نہیں ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

فَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّیۡنَ مِسۡکِیۡنًا

(۵۸ / ۴)

توجو نہ غلام آزاد کر سکے نہ روزے رکھ سکے تو اسے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کِھلانا ہے۔

اس میں یہ قید نہیں کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ یہ حکم مُطلق ہے۔ اور تینوں حکم ایک ہی حادثہ کے متعلق ہیں دو حکم مقیّد ہیں اور ایک تیسرا حکم مطلق ہے۔ مطلق حکم کو مُقیّد حکموں پر محمول کر کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کِھلانے میں بھی اسی قید کی

پیروی کرنی ہوگی ۔ یہ تو ایک حادثہ کی مثال ہوئی ۔اسی طرح دو حادثوں کے متعلق اگر قرآن کے احکام پائے جائیں اور ان میں ایک مطلق ہو اور دوسرا مقیّد تب بھی مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً قتلِ خطار کی صورت میں جو کفّارہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ اور مقتول کے ورثاء کو دِیَت یعنی خوں بہا ادا کرنا ہوگا ۔لیکن قتلِ خطار کے علاوہ ظِہار اور قَسم کے کفّاروں میں بھی غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر انمیں غلام کے مؤمن ہونے کی قید نہیں لگائی گئی ہے ۔ لہٰذا ظِہار اور قَسم کے کفّاروں میں قرآن کی مطلق آیات کو قتلِ خطار کی مُقیّد آیت پر محمول کر کے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان کفّاروں میں بھی غلام کا مؤمن ہونا ضروری ہے ۔ (ملاحظہ فرمائیے نورالانوار صفحہ ۱۵۹)

اسی سلسلہ میں امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں کہ

——— امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، زفرؒ، حسنؒ ابن زیاد، اوزاعیؒ اور شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کفّارۂ قتل میں اگر کسی غلام بچے کو آزاد کر دیا جائے جس کے والدین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو کافی ہو جائے گا۔ عطاء کا بھی یہی قول ہے ۔ ابنِ عباسؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے اور حسن بصریؒ - ابراہیم نخعی اور شعبی کہتے ہیں کہ غلام بچہ کافی نہ ہوگا جب تک وہ روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے نہ لگے ۔ البتہ ظِہار کے کفّارہ میں جو غلام آزاد کیا جاتا ہے اس میں سب بالاتفاق بچہ کے آزاد کر دینے کو کافی سمجھتے

ہیں اور پہلے قول کے صحیح ہونے کی دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ ہے۔ اور بچہ رَقَبَۃٌ مُّؤْمِنَۃٌ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں"۔ تو حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ولادت کے وقت حکمِ فطرت کا اثبات فرما دیا ہے۔ لہٰذا الفاظ کے مطلق ہونے کی وجہ سے اس کا جواز ضروری ہو گیا۔ اس کے جواز کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کے ارشاد وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً جیسا کہ بڑے آدمی کو شامل ہے ایسے ہی بچہ کو بھی شامل ہے (یعنی جو سزا بڑے آدمی کے قتل کی ہوگی وہی بچہ کے قتل کی بھی ہے) تو لازمی بات ہے کہ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ کا عموم بچہ کو بھی شامل ہو۔ اور حق تعالیٰ نے کہیں یہ شرط نہیں لگائی کہ روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے لگا ہو۔ تو اس طرح کی قیدیں بڑھانا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ نص پر کسی بات کا اضافہ کرنا نسخ کا موجب ہوتا ہے (جو ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے) (احکام القرآن للجصاص الرازی صفحہ ۲۷۶ ج ۲ مطبوعہ مطبع بہیۃ مصریہ ۱۳۴۷ھ)

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کسی عام واقعہ کے متعلق قرآنِ کریم کے مطلق حکم کو خود قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے جن میں اس واقعہ کے متعلق کوئی دوسرا حکم بیان کیا جا رہا ہو یا کوئی دوسرا واقعہ بیان کیا جا رہا ہو مقید کر لینا بھی صحیح نہیں ہوتا اور فقہائے

حنفیہ نے اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ ایسی صورت میں قرآنِ کریم کے مطلق حکم کو احادیثِ نبویہ سے مقیّد کرنے کی اجازت کس طرح دی جا سکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے وصیت کی فرضیت اطلاق کے ساتھ بیان کی ہے، اس میں ایک تہائی کی کوئی قید نہیں لگائی تو پھر اس باب میں احادیث کے ذریعہ اسے مُقیّد کرنے کی کوشش سراسر زیادتی ہے۔

حضرت سعدؓ ابن ابی وَقّاص کی حدیث اس سلسلہ میں فیاتح

ایراد حضرت سعد ابن ابی وَقّاص رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک ثُلث سے زیادہ وصیت کرنے سے منع فرمایا تھا۔ حضرت سعد ابن ابی وَقّاص رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے علاوہ تین اور صحابہ ابواُمامہ، ابوذرؓ اور ابوہُریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی اسی کے مطابق مروی ہے لیکن ان تینوں حضرات سے مروی حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ــــــــــ "اور اصل اس بارے میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حضرت سعد رضؓ سے ہے کہ ایک تہائی کی وصیت کرو اور ایک تہائی بہت ہے"۔ اور نبی علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے مرتے وقت تمہارے اَموال کے ایک تہائی کا صدقہ کر دیا ہے۔ اسے دارقطنی نے ابو اُمامہ کی حدیث سے

نقل کیا ہے ۔ مگر اس کی سند میں اسمٰعیل ابن عیاش اور عتبہ ابن حمید ہیں اور وہ دونوں ضعیف ہیں اور اسے احمد نے ابو درداءؓ کی حدیث سے اور ابن ماجہ اور بزار اور بیہقی نے ابوہریرہؓ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے ۔

بحوالہ التلخیص الحبیر ص۲۲۸ (اعلاء السنن ص ۲۶۰/۱۸۷)

لیکن حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث، صحاح ستہ میں سب میں موجود ہے اور اس سند پر کسی نے کلام نہیں کیا ۔ پوری حدیث یوں ہے ـــــــــــــــــ

حضرت سعدؓ حجۃ الوداع میں شریک تھے ابھی وہ مکہ ہی میں تھے کہ بہت سخت بیمار ہو گئے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے ۔ حضرت سعدؓ نے کہا کہ میں بہت سخت بیمار ہوں ۔ میرے پاس کافی مال ہے اور میرا کوئی وارث نہیں سوائے ایک لڑکی کے ۔ کیا میں اپنا دو تہائی مال خیرات کردوں ؟ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں" ۔ انھوں نے کہا " آدھا " آپ نے فرمایا "نہیں" انہوں نے کہا " تہائی " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تہائی کردو ۔ لیکن تہائی بھی بہت ہے " اگر تم اپنے ورثا کو مالدار چھوڑ جاؤ تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں ۔ اگر تم اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ بھی دوگے تو اس کا بھی ثواب ملے گا " ۔ حضرت سعد رضؓ نے کہا " کیا میں اپنے اصحاب سے پیچھے رہ جاؤں گا ؟ " (یعنی

سب چلے جائیں گے اور میں اسی مقام پر مر جاؤں گا جہاں سے ہجرت کر چکا ہوں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ہرگز نہ چھوڑے جاؤ گے (یعنی تم ابھی زندہ رہو گے) تم عمل کرو گے۔ اس سے تمہارے درجات بڑھیں گے۔ بلندی ملے گی۔ بعض لوگوں کو تم سے فائدہ پہنچے گا اور بعض کو تم سے نقصان پہنچے گا۔ یعنی اہلِ اسلام کو فائدہ پہنچے گا اور کافروں کو نقصان اور شکست (یہ ان کے فاتحِ ایران ہونے کی طرف اشارہ ہے) صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ باب رثار النبی صلی اللہ علیہ وسلم سعد ابن خولۃ رضؓ)

اس حدیثِ نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق مروّجہ وصیت سے ہے ہی نہیں۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وصیت کے بارے میں سوال ہی نہیں فرما رہے۔ وہ اپنا مال خیرات کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے صرف ایک بیٹی ہے اور اس کے سوا اور کوئی وارث نہیں ہے۔ بیٹی پرائے گھر کا دھن ہوتی ہے۔ وہ جہاں جائے گی اس کا شوہر اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ ایک تہائی مال اس کے لئے بہت ہے۔ خدا نے مجھے کافی مال دیا ہے۔ میں دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ نہیں۔ وہ پھر عرض کرتے ہیں کہ آدھا مال خیرات کر دوں۔ آپ پھر بھی منع فرماتے ہیں۔ تیسری مرتبہ وہ عرض کرتے ہیں کہ اچھا

ایک تہائی مال خیرات کر دوں۔ اس کی آپ اجازت دیدیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تم اپنے بال بچوں کو مال دار چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تمھاری اولاد تمھارے بعد دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھرے۔ پھر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ خیرات یہی نہیں ہے کہ تم کچھ غریب اور نادار لوگوں کو کچھ دیدو۔ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں رضائے الٰہی کے لئے دیتے ہو وہ بھی صدقہ ہے اور اس کا بھی تو ثواب ملے گا

ہماری کوتاہ نظری

یہ ہماری بہت بڑی کوتاہ نظری ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک حیثیت ہی کے قائل ہیں اور وہ آپ کی نبی اور رسول ہونے کی حیثیت ہے۔ آپ کے تمام ارشادات کو ہم قانون بنا ڈالتے ہیں حالانکہ تمام انسانوں کی طرح آپ بھی ایک انسان ہیں اور متنوع حیثیتوں کے مالک ہیں۔ آپ صاحبزادیوں کے باپ بھی ہیں۔ بیویوں کے شوہر بھی ہیں مخلص اور وفادار بہی خواہوں کے دوست اور غمخوار بھی ہیں۔ مملکت کے سربراہ بھی ہیں۔ شفیق استاد اور معلم بھی ہیں اپنی جماعتِ مؤمنین کے مُصلح و مزکّی بھی ہیں۔ اپنی فوجوں کے کمانڈر بھی ہیں۔ قاضی القضاۃ اور جج بھی ہیں۔ حاکم اور مشیر بھی ہیں۔ آپ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ آپ کی ان تمام متنوع حیثیتوں کا احصار و احاطہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ واقعہ صرف اتنا

ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ
میں سے ہیں اور جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قریبی
عزیز یعنی ماموں ہوتے ہیں حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ کے
ہمراہ حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ یہاں آکر سخت
بیمار ہو گئے ایسے بیمار کہ انھیں اپنی زندگی سے مایوسی ہو گئی۔
اس وقت تک ان کے ایک ہی لڑکی تھی اور تھے صاحب
ثروت۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ میں ایک تہائی مال اپنی لڑکی کے
لئے چھوڑ کر باقی دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔
انھوں نے اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
مشورہ کیا (کوئی شرعی حکم نہیں پوچھا تھا) آپ کو نورِ نبوت
سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت سعدؓ (جو ابھی نوجوان ہیں)
اس مرض میں مریں گے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ نے ان کے ہاتھوں
پر ایران کی فتح لکھی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو ان کی ذات
سے بڑے فوائد حاصل ہوں گے اور ایرانی کفار ان کے ہاتھوں
ہزیمت و رسوائی سے دوچار ہونگے۔ آپ کو یہ بھی نظر آ رہا تھا
کہ آج ان کے صرف ایک بیٹی ہی ہے۔ لیکن وہ مزید اولاد
پیدا کریں گے اور ان کے آئندہ لڑکے بھی ہوں گے۔ لہٰذا
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مشورہ دیا کہ دو تہائی
مال صدقہ نہ کرو۔ انہوں نے آدھے مال کو خیرات کرنیکا ارادہ
فرمایا تو آپ نے اس سے بھی منع فرما دیا۔ اس کے بعد انہوں
نے ایک تہائی مال خیرات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے

اس کی اجازت دیدی اور فرمایا کہ تہائی بھی بہت ہے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو آپ نے ایک تہائی مال خیرات کرنے کی اجازت دی۔ لیکن غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا مال اور گھر کا سارا ساز و سامان راہ الٰہی میں دیدیا تھا۔ نیز حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال راہ خدا میں ڈھیر کر دیا تھا تو ان دونوں حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع نہیں فرمایا۔ کیونکہ آپ خوب سمجھتے تھے کہ انکے حالات، ان کے جذبات اور ان کے مصالح اور مفادات کیا ہیں۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بڑے درجہ کے صحابی ہیں۔ اسلام لانے والوں میں ان کا ساتواں نمبر ہے۔ آنحضرت کے ماموں ہوتے ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ لیکن ان کا درجہ بہرحال وہ نہیں ہے جو صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کا تھا آپ نے ان کو پورا مال اور آدھا مال راہ خدا میں قربان کر دینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تہائی سے زیادہ خیرات کرنے کی اجازت نہیں دی دوسری طرف ایک صاحب کا صدقہ اتنا بھی قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ بعض لوگ جذبہ میں تو صدقہ کر دیتے ہیں مگر اس کے بعد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہتے ہیں (صحاح) غرض یہ کہ نہ وہ شرعی حکم تھا نہ یہ شرعی حکم ہے۔ یہ محض حالات و مصالح کے پیش نظر مختلف شخصیتوں کیلئے مختلف

مشورے تھے۔ کیونکہ سب کے حالات وجذبات، مصالح و مفادات یکساں نہیں تھے۔ نہ ہمیں قانون اُسے بنانا چاہیئے نہ اِسے۔

بہرحال حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو سند بناکر یہ مستقل قانون بنا دینا کہ تہائی مال سے اوپر کی وصیت کرنا ہی جائز نہیں ہے، سراسر زیادتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ ہمارے نزدیک اس روایت کا مطلب و مقصد اس سے بالکل جُدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی اکثر روایات میں افاتصدق بِثلثی مالی؟ قال لاقلت فبا لشطر قال لاقلت فبا لثلث؟ قال الثلث و الثلث کثیر اَوْکبیر (الحدیث) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی کیا میں اپنا دو تہائی مال خیرات کردوں؟" آپ نے فرمایا نہیں" میں نے کہا" تو آدھا؟" آپ نے فرمایا" نہیں" میں نے عرض کیا" تو ایک تہائی؟" آپ نے فرمایا"۔ ایک تہائی، اور ایک تہائی بہت ہے۔" یا یہ مقدار بڑی ہے"

گو بعض روایات میں (جو صحیحین کی نہیں ہیں بلکہ کم درجہ کی ہیں) یہ الفاظ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری عیادت فرمائی، میں بیمار تھا۔ اور فرمایا "تم نے وصیت کردی ہے"؟ میں نے کہا، "ہاں" آپ نے فرمایا" کتنے مال کی"؟ میں نے کہا کہ "پورے مال کی اللہ کی راہ میں" آپ نے فرمایا" تم نے اپنی اولاد کے لئے کیا چھوڑا"؟ میں نے کہا کہ

"وہ سب غنی ہیں"، مالدار ہیں"۔ آپ نے فرمایا۔ "دسویں حصّہ کی وصیت کرو"، میں برابر کم کراتا رہا حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کہ "ایک تہائی مال کی وصیت کر دو۔ اور ایک تہائی بہت ہے"۔

ہمارے حضرات فقہار کو اس کم درجہ کی روایت میں چونکہ وصیت کا لفظ نظر آگیا اس لئے انہوں نے اس روایت کو اصل قرار دے کر صحیحین کی صدقہ والی روایت کو بھی اسی پر محمول کر کے اسے بھی وصیت کی حدیث بنا ڈالا۔ حالانکہ اس روایت میں بھی اس کی تصریح موجود ہے کہ وصیت سے حضرت سعد رضؓ کی مراد وہی صدقہ اور خیرات ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا "تم نے وصیت کر دی ہے؟" تو حضرت سعد رضؓ نے کہا "ہاں" آپ نے پھر پوچھا "کتنے مال کی"؟ تو حضرت سعد رضؓ نے جواب دیا تھا۔ پورے مال کی اللہ کی راہ میں" ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں پورے مال کی وصیت صدقہ اور خیرات ہی تو ہے۔ آپ اپنے کسی عزیز رشتہ دار یا اپنے کسی خادم کو تو کچھ نہیں دلوا رہے ہیں۔ آپ تو اللہ کی راہ میں پورا مال دے رہے ہیں۔ اس واقعہ کا اس سے کیا تعلق ہے کہ آدمی اپنے مرنے کے بعد کسی رشتہ دار عزیز کسی خادم۔ کسی دوست کو کچھ دینے کی وصیت کر جائے۔ لہٰذا اصل حدیث وہی صحیحین والی روایت ہے کہ حضرت سعد رضؓ سارا مال اللہ کی راہ میں خیرات کرنے کا ارادہ فرما رہے تھے حالانکہ ہماری اور فقہار کی

کی بحث صدقہ وخیرات والی وصیت سے نہیں بلکہ وراثت
والی وصیت سے ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت
کریمہ میں آیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝

(۲/۱۸۰)

اے مسلمانو! جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے
اور وہ مال کثیر چھوڑ کر مر رہا ہو تو تم پر والدین اور
قریب تر رشتہ داروں کے لئے وصیت معروف
طریقہ پر فرض کر دی گئی ہے۔ یہ تقویٰ شعار
لوگوں پر ضروری ہے۔

اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ
يُبَدِّلُونَهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(۲/۱۸۱)

پھر جو وصیت کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا
گناہ انہی لوگوں پر ہوگا جو اسے بدل دیتے ہیں۔
یقیناً اللہ سننے والا جاننے والا ہے

قرآن کریم کے ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے "تم پر وصیت
معروف طریقہ پر فرض کر دی گئی ہے" ——— "یہ تقویٰ

شعار لوگوں پر ضروری ہے ؀ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے والے گنہگار ہوں گے ۔ ——— کیا وہ حکم الٰہی جسے کچھ عرصہ کے بعد منسوخ ہی کر دینا ہو ایسی تاکیدات شدید سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ

كُتِبَ عَلَيْكُمْ (تم پر فرض کر دیا گیا)

بِالْمَعْرُوفِ (معروف طریقہ پر)

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (تقویٰ شعار لوگوں پر ضروری)

فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهُ (تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہوگا جو اس میں کوئی تبدیلی کریں)

ہم بڑے افسوس کے ساتھ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حق تعالیٰ خواہ مخواہ ایک جلد ہی منسوخ ہو جانے والے حکم کو اتنی شدید تاکیدات سے بیان فرمائیں گے ۔

رہ گئی وہ وصیت جس کا ذکر حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں آیا ہے یعنی اپنا سارا مال راہ الٰہی میں خیرات کر دینے کی وصیت کہ آدمی اپنے ورثاء کو خالی ہاتھ چھوڑ کر چلا جائے جب کہ اس کے ورثاء خود حاجت مند ہوں اور انھیں میت کے ترکہ کی ضرورت ہو تو ایسی وصیت میں یقیناً پابندیاں عائد ہونی چاہئیں ۔ ایسی وصیتوں میں حاکم مجاز ایک تہائی یا اس سے بھی کم کی پابندی لگانا چاہے تو لگا سکتا ہے ۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں

ہے جنھیں ثواب کمانے کی زیادہ فکر ہوتی ہے اور اپنے بال بچوں کی اتنی فکر نہیں ہوتی ۔ وہ محض اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب ملے گا ۔ بال بچوں کے حقوق و واجبات کو فراموش کر بیٹھتے ہیں ۔ میرے علم میں ایسی بیسیوں مثالیں ہیں کہ بیوی بچے بیمار ہیں ۔ فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں مگر صاحب خانہ نے تبلیغ میں ایک چلّہ دیدیا ہے ۔ وہ جماعت کے ساتھ نکل گئے ہیں اور تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں اور بیوی بچے ان کے چلے جانیکے بعد دوا دارو کو ترسنے کے علاوہ دو وقت کی روٹی سے بھی مجبور ہیں ۔ مگر صاحب خانہ کو تبلیغ میں چونکہ ثواب کی توقع ہے اس لئے اس نے بیوی بچوں کے فرائض و واجبات اس ثواب پر قربان کر دئے

یہی حال دوسری بے شمار نیم سیاسی و مذہبی جماعتوں کا ہے کہ جماعتی مفادات کے لئے ان کے کارکن صبح سے شام تک اور رات کے اندھیریوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور جو اصل واجبات و فرائض ہیں ان سے پہلو تہی کئے ہوئے ہیں ۔ کیونکہ ان کی جماعتوں کے سربراہوں نے اپنے کارکنوں کے دلوں میں یہ جما دیا ہے کہ ان کی جماعت کے لئے کام کرنا جہاد ہے اور اس کے لئے اپنی قوت ، طاقت اور وقت قربان کرنے کا ثواب ہے ۔ اس کا حق تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر ملے گا ۔ چنانچہ نہ انھیں نماز ،

روزے کی فکر ہے نہ اپنے آرام وراحت کا خیال ہے نہ آل اولاد سے غرض۔

ایسے لوگوں کے لئے یقیناً حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق سربراہ مملکت اور حاکم مجاز کو یہی مشورہ دینا ہوگا کہ وہ اپنی اولاد اور گھر والوں کا بھی خیال کریں اور ثواب کمانے کے چکر میں فرائض سے پہلو تہی نہ کریں۔ یہ حکم قرآن کے خلاف نہیں ہوگا بلکہ قرآن کے عین مطابق ہوگا۔ گذشتہ آیات وصیت کے بعد یہ آیت مبارکہ بھی ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَیْنَھُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ۝ (۲/۱۸۲)

تو جسے کسی وصیت کرنے والے سے ایک طرف جھک جانے یا کوتاہی کرنے کا بھی اندیشہ ہو پھر وہ ان کے درمیان درستگی اور اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

عربی زبان میں جَنَفْ کے معنے کسی ایک طرف جھک جانا۔ جانب داری برتنا یا دل کا میلان ہوتے ہیں۔ (تاج العروس ومحیط المحیط) اِثْمٌ کے بنیادی معنوں میں اضمحلال افسردگی، توانائی کی کمی، سست روی اور شکستگی کا پہلو ہوتا

ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے دیر ہونا اور پیچھے رہجانا ہیں (تاج ابن فارس) لہٰذا جَنَفٌ کے مفہوم میں جہاں کسی خاص آدمی کے ساتھ جانب داری برتنے کا پہلو ہے وہیں دین داری اور مذہبیت کا وہ مروجہ تصور بھی اسی میں شامل ہے کہ آدمی اپنے مزعومہ ثواب کے حصول کے عقیدہ پر دوسرے تمام پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور صرف ایک طرف کا ہو کر رہجاتا ہے۔ نیز اِثْمٌ کے مفہوم میں جہاں گناہ اور معصیت کے امور آتے ہیں وہیں حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی، سستی، بیوی اور بچوں دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے بے توجہی بھی اسی میں شامل ہیں۔ لہٰذا حاکم وقت کو ایسی ہدایات جاری کرنے۔ ایسے قوانین بنانے اور اس قسم کی وصیتوں میں تغیر و تبدل کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے وصیت کرنے میں کسی کی کوئی حق تلفی کی ہے۔ کسی سے کوئی طرف داری برتی ہے تو اسے ان غلطیوں کی اصلاح کر کے وصیت کو درست کر دینا چاہیئے۔

وصیت کے متعلق آنحضرتؐ کا اُسوۂ حسنہ
اور
افسانۂ فدکؓ

لفظ وراثت کے معنے وراثت کے معنے نگرانی اور انتظام کے ہیں ملکیت کے نہیں ہیں۔

اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ

(۲۱/۱۰۵)

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ کے صالح بندے زمین کے مالک بنجاتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زمین کا انتظام و انصرام ایسے لوگوں کے حوالے ہوتا ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ

(۷/۱۶۸)

کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اہل کتاب میں سے کچھ ناخلف کتاب الٰہی کی مالک بن گئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کے علماء وصلحاء کے بعد کچھ ناخلف، عالم اور پیشوا بن بیٹھے کہ ہم کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (۲۷/۱۶)

کا یہ مطلب تو نہیں کہ سلطنت اسرائیل داؤد علیہ السلام کی ملکیت تھی جو ان کے بعد سلیمان علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گئی

حالانکہ دونوں نبی ہیں۔ اور نبی دینار و درہم نہیں چھوڑا کرتے وہ وہ کتاب وحکمت چھوڑ کر جایا کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (۴/۱۹)

کا یہ مطلب تو نہیں کہ مسلمانو! تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔ کیونکہ منکوحہ عورتیں لوگوں کی لونڈیاں اور ان کی ملکیت تو نہیں ہوتیں۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۞ (۴۳/۷۲)

کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے تمھیں اس جنت کا مالک بنادیا گیا ہے۔ لہٰذا تم اسے فروخت کرکے پیسے بنالو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ، اسے استعمال کرو۔ قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے وراثت کے معنے اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔ انسانی ملکیت کا تو اسلام میں سرے سے کوئی تصوّر ہی نہیں۔ یہ جو کہا کرتے ہیں کہ یہ مکان میرا ہے۔ یہ زمین تمھاری ہے۔ یہ مال اس کا ہے۔ تو اس کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہمیں ان کے استعمال اور تصرّف کا حق دیا گیا ہے اور وہ بھی کچھ حدود و شرائط کے ساتھ ملکیت کی نسبت انسان کی طرف جب بھی ہو تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا ہے کہ:—

ومعنى الملك في حق الآدمي كونه

احق بالانتفاع من غیرہ یعنی انسان کے حق میں ملکیت کے لفظ کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے اس سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حقدار ہے

(حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۱۱ ج ۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی مع ترجمہ)

پس جب اصل آغاز ہی میں ملکیت کا کوئی وجود نہیں تو مرنے کے بعد جو وراثت تقسیم ہوتی ہے وہ کیسے ملکیت بن جائے گی۔ ساری کائنات صرف خالق کائنات کی ملکیت ہے اور انسان صرف امین کسٹوڈین، منتظم کار، خزانچی اور اپنے حق کے استعمال کا مجاز ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

زمین کے بارے میں قرآن کریم کا حتمی فیصلہ ہے

(۱) اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ (۷/۱۲۸)

یقیناً زمین اللہ ہی کی ملکیت ہے۔

(۲) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ (۵۵/۱۰)

زمین کو اللہ نے ساری نوع انسانی کے فائدہ کے لئے بنایا ہے۔

(۳) وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

(۲/۳۶ نیز ۷/۲۴)

تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔

انسان زندگی بھر زمین سے فائدہ حاصل کرتا رہیگا لیکن وہ اس کی

ملکیت نہ ہوگی۔ ریل میں جو سیٹ ہمارے لئے ریزرو ہو اُسے ہماری اجازت کے بغیر کوئی نہیں لے سکتا۔ نہ رزرویشن سے کے بعد بھی اور ہمارے اتر جانے کے بعد بھی رزرویشن کا مطلب ملکیت نہیں ہوتا۔ صرف حق استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایمرجنسی پیش آجائے تو ہم سے وہ رزرویشن واپس بھی لی جاسکتی ہے۔ سیدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی تو کیا تھا کہ آپ نے حضرت بلال ابن حارث مزنی سے وہ زمین واپس لے لی تھی جو خود حضور نے انھیں مرحمت فرمائی تھی۔ زمین آباد کاری کے لئے ہوتی ہے یا استفادہ کے لئے۔ اگر یہ مقصد پورا نہ ہورہا ہو مگر استحصال کے ساتھ پورا ہو تو زمین کو واپس لے لینا اور بغیر کسی معاوضہ کے واپس لے لینا سنت فاروقی ہی نہیں ارشاد نبوی کے بھی مطابق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

من کانت لہ ارض فلیزرعھا اولیمنحھا اخاہ (یعنی جس کے پاس کوئی قطعہ زمین ہو وہ اسے خود کاشت کرے ورنہ اپنے کسی بھائی کو (بلا معاوضہ) دیدے۔ مَنْح کہتے ہیں بلا معاوضہ مستقلاً یا عارضی طور پر دیدینے کو۔ یہاں حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ: اگر خود کاشت نہ کرتا ہو تو وہ زمین فروخت کردے یا کسی کو بٹائی پر دیدے۔ نعوذ باللہ آنحضرتؐ بٹائی کی اجازت کیسے دے سکتے تھے جبکہ خود ہی بٹائی کو عینِ ربوٰا (سود) قرار دے چکے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے من لم یذر المخابرۃ فلیأذن بحرب من اللہ ورسولہ جو بٹائی کو ترک نہیں کرتا۔ وہ اللہ اور اس کے

رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائے (بعینہ یہی وعید سود خواروں کے لئے قرآن کریم میں آئی ہے) حضرت رافع ابن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کھیت کو پانی دے رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُدھر سے گذرے تو آپ نے سوال فرمایا! لمن الارض ولمن الزرع۔ (زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی ہے) حضرت رافع نے جواب دیا زرعی ببذری وعملی لی الشطر ولبنی فلان الشطر

یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ پیداوار آدھی میری ہے اور آدھی بنی فلاں کی (جسکی زمین ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

اربیتما فرد الارض الی اھلھا وخذ نفقتک

تم دونوں نے سودی کاروبار کیا ہے۔ لہٰذا زمین اس کے مالک کو واپس کر دو اور تم نے جو کچھ خرچ کیا ہے وہ اس سے لے لو

یہاں صاف لفظوں میں حضورؐ نے بٹائی کو سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر نے حضورؐ کا یہ فیصلہ سن کر بٹائی کا کاروبار ترک فرما دیا تھا اور کہا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں اس سے کہیں زیادہ نفع ہے (صحاح ستہ بحوالہ جمع الفوائد صہ ۲۵۷/۱ج مطبوعہ مطبعہ خیریہ میرٹھ)

کیا حضورؐ زمیندار تھے؟

اب ذرا غور فرمایئے کہ کیا حضورؐ کی اپنی کوئی زمین تھی۔ اگر تھی

تو تین صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہو گی۔ (۱) یا تو آپ نے اسے بیکار رکھ چھوڑا ہو گا (۲) یا اس میں خود کاشت فرماتے ہونگے (۳) یا کسی کو بٹائی پر دی ہوئی ہو گی ایک چوتھی صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ آپ نے کسی کو بطور منح (بلا معاوضہ عطا فرمادی ہو۔ اول الذکر تین صورتیں تو ہو ہی نہیں سکتیں جبکہ خود حضور ؐ کے ارشاد کے خلاف ہیں (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) اور خود کاشت کرنے کا کوئی ثبوت تاریخ میں نہیں۔ اور اگر چوتھی صورت ہوئی ہو گی تو زمین اس کی ہو گی جس نے اس پر کاشت کی ہو گی کیونکہ یہ بھی ارشاد نبوی ہے

من احیا ارضا میتۃ فھی لہ

جس نے غیر آباد زمین کو آباد کیا ہو زمین اسی کی ہے۔

(مؤطا امام مالک ترمذی، ابو داؤد بحوالہ جمع الفوائد ص۲۵۵ ج ۱)

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ حضور نے کسی کو کوئی چیز دی ہو اور واپس لے لی ہو جبکہ آپ نے اس کو سخت ناپسند فرمایا ہے آپ کا ارشاد ہے

مثل الذی یرجع فی عطیۃٍ او ھبۃٍ کالکلب یاکل واذا شبع قاء ثم عاد فی قیئہ ـــــــــــــ

جو اپنا عطیہ یا ہبہ واپس لیلے وہ ایسے کتے کی طرح ہے جو کھا کر قے کر دے اور پھر اس کو چاٹ لے۔

"اصحاب سنن عن ابن عمرؓ و ابن عباسؓ بحوالہ جمع الفوائد ص۲۵۸ ج ۱"۔

اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ حضور ؐ کی اپنی کوئی زمین کبھی تھی ہی نہیں اور جب حضور کی اپنی کوئی زمین تھی ہی نہیں تو اس میں وراثت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا تھا جو

جو حضور کے مصرف میں آتا تھا تو اس کی حیثیت ایسے "خالصہ" سے زیادہ کچھ نہیں تھی جو کسی سربراہ مملکت کیلئے اسکی زندگی تک مخصوص ہوتا ہے اور اسکے بعد وہ اسکی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اسکی جگہ سربراہ مملکت بنتا ہے۔ اگر آج کسی صدر مملکت کی کوئی تنخواہ مقرر ہو (واضح رہے کہ ابتداء اسلام میں عمال مملکت کی تنخواہیں مقرر نہیں ہوتی تھیں عموماً اسلامی مملکتوں میں تنخواہوں کی جگہ عرصہ دراز تک عمال کو جاگیریں دیدی جاتی تھیں جن سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتے تھے) تو اس سربراہ کے الگ ہونے یا مرجانیکے بعد اس کی تنخواہ اسکے وارثوں میں بطور ترکہ کے تقسیم نہیں ہوتی بلکہ اس کی جگہ لینے والے دوسرے صدر یا سربراہ کو دیجاتی ہے۔ اس زمانہ میں ایسی "خالصہ" کی زمینیں بطور تنخواہ ہی کے ہوا کرتی تھیں یہ ایسی سیدھی سی بات ہے جس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔

ازواج مطہرات کیلئے

آپ نے اپنی ازواج مطہرات کیلئے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور آپکو اپنی ازواج مطہرات اور اولاد کیلئے کوئی وراثت چھوڑنیکی ضرورت بھی کیا تھی جبکہ پوری امت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھی اور آپکی ازواج مطہرات ساری امت کی مائیں تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ پوری مملکت تھی جسکی مشترک وراثت پوری امت تھی جس مملکت سے ہر فرد کو وظیفہ ملتا ہو، کیا اس سے بیویوں اور بیٹی ہی کو خاص طور پر محروم رکھا گیا ہوگا۔ اگر پیغمبر ؐ کو اپنی اولاد کیلئے کوئی ترکہ ہی چھوڑنا تھا تو کیا درہم و دینار کے ڈھیر نہیں چھوڑ سکتے تھے لیکن عجیب حیرت کی بات ہے کہ جس رسول نے ساری زندگی ایک درہم

یا ایک دینار بھی اپنے گھر کے اندر ایک رات کے لئے بھی نہ کھا

فدک کی کہانی

اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ ہزاروں درہم کی جاگیر اپنی بیٹی کے لئے چھوڑ گئے۔ یہی انتظام کرنا تھا تو اس سے پہلے اپنی ان بے سہارا بیویوں کے لئے کرنا تھا جو آپ کے بعد عقد ثانی سے ہمیشہ کے لئے بحکم الٰہی محروم کی جا چکی تھیں۔ بیٹی تو بقول عامۃ الناس پرائے گھر کا دھن ہوا کرتی ہے۔ اس کا نان نفقہ اس کا شوہر برداشت کرے گا مگر بیویوں کا تو نان نفقہ بھی آپ ہی کے ذمہ تھا۔ اور آپ کی وفات کے بعد بھی وہ آپ ہی کی ازواج مطہرات تھیں، لہٰذا ان کی فکر کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضورؐ ایک ایسا نظام ریاست دے گئے تھے جس میں کوئی بھوکا نہیں مر سکتا تھا۔ اس لئے خاص طور پر کسی کے لئے الگ معاشی سہارا قائم کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ساری مملکت ہی امت کا مشترک سرمایہ تھی۔ اس میں کسی خصوصی امتیاز کی توقع ہی کس طرح کی جا سکتی ہے۔

حضور نے اپنی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر دیکھ کر فرمایا ——
نبی زادی کے ہاتھ میں یہ آگ کی زنجیر؟ (رواہ النسائی عن ثوبانؓ)
جس نے بیٹی کی درخواست پر بھی کوئی خادم نہ دیا اور عطیات میں اپنی لخت جگر پر اصحاب صُفّہ کو ترجیح دی۔ (صحیح بخاری ابواب الفضائل وصحیح مسلم کتاب الذکر)

ایسے رسول سے یہ توقع ہی کس طرح کی جاتی ہے کہ امت کے کسی فرد حتّٰی کہ اپنی اہل بیت (گھر والیوں) تک کے لئے کوئی ترکہ نہ چھوڑا

وہ صرف ایک بیٹی کے لئے یہ امتیازی خصوصیت قائم کرے گا۔ نبی کی پاک سیرت پر اس سے زیادہ بدنما داغ اور کیا لگایا جا سکتا ہے۔؟

حقیقت یہ ہے کہ نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ترکہ چھوڑا اور نہ کبھی جناب فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے اس کا اشارۃً بھی کوئی مطالبہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا چھوڑا تھا اسے خود خاندان نبوت کے عظیم فرد اور فرقۂ امامیہ کے ایک امام جناب ابو عبداللہ جعفر صادقؒ کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما ولکن ورثوا العلم فمن اخذ منه اخذ بحظ وافر۔ (انبیاء نے ایک دینار و درہم بھی وراثت میں نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے وراثت میں علم ہی چھوڑا ہے۔ پس جس نے نبی سے علم حاصل کر لیا اس نے وافر حصّہ پالیا۔)

یہ روایت مشہور شیعی محدث شیخ ابو جعفر محمد ابن یعقوب کلینی (متوفی ۳۲۹ھ) کی اصول الکافی میں بھی ہے اور شیخ ابو جعفر محمد ابن علی حسین قمی (متوفی ۳۸۱ھ) کی من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی

ے یہاں شیعہ علماء کے حوالے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ وہ حقائق ہیں کہ جن کا اعتراف باوجود صحابۂ کرام سے دشمنی کے خود شیعہ حضرات کو بھی ہے ان حوالوں کی وہی حیثیت ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں ہم غیر مسلموں کے اعترافات کو الزام کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

شامل ہے۔ اور پھر بالکل انہی الفاظ سے یہ روایت بخاری۔ ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی بزبانِ رسالت ابو درداءؓ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے۔

بحوالہ جمع الفوائد جلد ۱ صفحہ ۳۰ کتاب العلم

گویا یہ مسلم اکثریت اور اثنا عشری شیعہ دونوں کی متفق علیہ روایت ہے۔ مذکورۃ الصدر دونوں کتابیں فرقۂ اثنا عشریہ کی اصول اربعہ میں داخل ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ امہات المومنین تو دین اور اسلامی ریاست کے نظام اور اس کی روح کو اس قدر سمجھ چکی ہوں اور اتنی فراخ دل ہوں کہ بے سہارا ہونے اور عقد ثانی سے محروم ہونے کے باوجود، وراثت رسول کا کوئی مطالبہ نہ کریں اور بالکل خاموش رہیں۔ اور رسولؐ کی آغوش تربیت میں پلنے والی بیٹی معاذ اللہ اتنی بے خبر اور تنگ دل ہو کہ ایک حقیر قطعہ زمین حاصل کرنے کے لئے بے چین رہے۔ گھر گھر جاکر فریاد کرتی پھرے اور ناکام ہونے کے بعد زندگی بھر ذمہ دارانِ وقت سے سلام و کلام ترک کر دے اور اس غم میں گھل گھل کر جان دیدے اور اس پر طرہ یہ کہ شوہر بھی اس کا ساتھ دیتا رہے اور خود باختیار سربراہِ مملکت ہونے کے بعد بھی اس غاصبانہ اقدام کی کوئی اصلاح نہ کرے اور اس پر مزید طرفہ تماشا یہ کہ رسولؐ کے سارے تربیت یافتہ جاں نثار اس ظلم عظیم کو خاموشی سے دیکھتے رہے اور ایک نے بھی وراثت کے موقف کی تائید نہ کی۔ فرمائیے نفسیات کا علم اس روایت کے بارے میں کیا فیصلہ دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے پیغمبر کا صحیح موقف یہی ہے کہ لانورث ۔ ماترکنا صدقۃ ہم وراثت نہیں چھوڑتے ۔ہم نے جو کچھ چھوڑا، وہ کار خیر کے لئے ہے ۔ یعنی سب میں مشترک ہے ۔یہاں صدقۃ ہر کار خیر کے معنے میں ہے ۔ ورنہ خاص معنوں میں یوں بھی ہمارے تمام فقہاء کے نزدیک آل ہاشم کے لئے ممنوع ہے

دراصل فدک کی ساری داستان ایک خاص مقصد کے لئے گھڑی گئی تھی اور تاریخ میں ایسی بے شمار بے سروپا باتیں اور روایات پائی جاتی ہیں ۔ ۵

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم افسانے کا مکمل تجزیہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا اسوۂ حسنہ قرآنی معیار کے مطابق صحیح روایات کی روشنی میں پیش کر دیں ۔

افسانۂ فدک

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کس انداز سے گزاری اور اپنے اہل وعیال کے لئے کس طرح کی زندگی کو پسند فرمایا۔ یہ اسلامی تاریخ کا درخشاں باب ہے ۔احادیث اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں اس کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تاہم چند روایات پیش خدمت ہیں جن سے آپ کی حیات طیبہ کا اندازہ ہو سکے گا۔ بخاری مسلم اور ترمذی کی مندرجہ تمام روایات بحوالہ جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۷۴-۲۷۵ پیش کی گئی ہیں۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ۔ہم پر ایک ایک مہینہ گذر جاتا تھا کہ ہم گھر میں آگ نہیں جلاتے تھے، کھجور اور پانی پر گزارہ ہوا کرتا تھا، کبھی کبھی گوشت آجایا کرتا تھا۔

(۲) حضرت عائشہ رضؓ ہی کی روایت ہے کہ ہم آل محمدؐ نے گیہوں کی روٹی سے کبھی مسلسل تین دن پیٹ نہیں بھرا حتیٰ کہ آپؐ اس جہاں سے تشریف لے گئے۔

(۳) دوسری روایت میں ہے کہ ہم آل محمدؐ نے جو کی روٹی سے مسلسل تین دن پیٹ بھر کر نہیں کھایا حتیٰ کہ آپؐ اٹھا لئے گئے۔

(۴) ایک اور روایت میں ہے کہ ہم آل محمدؐ نے کبھی ایک دن میں دو کھانے ایسے نہیں کھائے جن میں ایک کھجور نہ ہو۔

(۵) ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت عروہ بن زبیر رضؓ سے کہا کہ بھانجے! ہم ایک مہینے کا چاند، پھر تیسرے مہینے کا چاند دیکھ لیتے تھے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی۔ عروہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ خالہ جان پھر آپ لوگ کس طرح زندہ رہتے تھے تو حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی پر۔ البتہ حضورؐ کے کچھ انصاری پڑوسی تھے ان کی اونٹنیاں ہوتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی ان کا دودھ بھیج دیا کرتے تھے تو حضورؐ ہمیں دیدیا کرتے تھے۔

(۶) ایک اور روایت میں ہے کہ جب لوگوں کو پیٹ بھر کر پانی اور کھجور میسر آنے لگے تھے (یعنی فراخی کا زمانہ آگیا تھا) تو آنحضرت صلی علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

(۷) دوسری روایت میں ہے کہ ہم کبھی پانی اور کھجور سے بھی شکم سیر نہ ہوسکے۔

(۸) ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات ہوگئی اور آپ نے کبھی ایک دن میں دو مرتبہ روٹی اور زیتون سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

(۹) حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں مسلسل کئی کئی راتیں گذر جاتی تھیں کہ آپ کے گھر والے بھوکے سوتے تھے۔ انھیں شام کو کھانا میسر نہیں آتا تھا اور ان کے ہاں روٹی اکثر جو کی ہوا کرتی تھی۔ (ترمذی)

(۱۰) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرمارہے تھے کہ

دنیا میں لوگوں نے کیا کیا مصائب برداشت کئے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ پورا دن بھوک میں گذر گیا اور آپ کو کوئی ردّی کھجور بھی میسر نہ آسکی جسے پیٹ میں ڈال لیں۔ (صحیح مسلم)

(۱۱) حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو ہم نے کہا کہ اب ہم شکم سیر ہو کر کھجوریں کھا سکیں گے۔

(۱۲) ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ جبتک خیبر فتح نہیں ہو گیا، ہمیں پیٹ بھر کھجور بھی میسر نہ آسکی۔ (بخاری)

(جیسا عرض کیا گیا یہ تمام حدیثیں جمع الفوائد صفحہ ۲۷۴-۲۷۵ سے نقل کیگئی ہے)

ان روایات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری وقت تک کس طرح زندگی گذاری ہے۔ اب کچھ روایات ایسی پیش خدمت ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ آپ اپنے اہل وعیال کے لئے کس قسم کی زندگی پسند فرماتے تھے اور ان کے لئے کس انداز کی زندگی کی آرزو فرمایا کرتے تھے۔

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم چاہتی ہو کہ جلدی مجھ سے ملو اور میرے پاس پہنچ جاؤ تو دنیا سے اتنی مقدار پر کفایت کرنا جتنا ایک مسافر زادِ راہ کے طور پر ساتھ لے لیتا ہے۔ اور مال دار لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے دور رہنا اور کپڑے کو اس وقت تک پرانا سمجھ کر چھوڑ نہ دینا جب تک اس میں پیوند نہ لگا لینا۔ کیوں کہ ازواج مطہرات کی زندگی وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ (سورۂ احزاب) کے ارشاد الٰہی کے تحت تبلیغ اسلام کے لئے وقف

تھی اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بس بنیادی ضروریات کی حد تک دنیا کے استعمال کی اجازت دی اور اسی کے مطابق ازواج مطہرات نے اپنی زندگی بسر کی اسی روایت میں ہے کہ) ایک دن ان کے پاس حضرت معاویہ رضؓ کے پاس سے اسی ہزار دینار یا درہم آئے تو شام تک ان کے پاس ایک درہم بھی نہیں رہا۔ تو حضرت عائشہ رضؓ کی خادمہ نے ان سے کہا کہ آپ نے ہمارے لیئے ان میں سے ایک درہم کا گوشت تو منگا لیا ہوتا تو حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ تم مجھ سے پہلے سے کہتیں تو میں ضرور منگا لیتی (جامع ترمذی)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! آل محمد کو اتنا رزق دے کہ وہ بھوکے نہ رہیں۔ ایک دوسری روایت میں قُوْتًا کے بجائے کَفَافًا کا لفظ ہے یعنی آل محمد کو اتنا رزق دے کہ وہ دوسروں کے محتاج نہ ہوں۔ (یعنی باقی اوقات وہ انسانیت کی خدمت میں مصروف رہیں) (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی)

صرف ازواج مطہرات واقربائے رسول ہی کا یہ حال نہ تھا بلکہ آنحضرتؐ نے جن فقرائے مہاجرین کو بھی تبلیغ اسلام اور ملّی خدمات کے لیئے مقرر فرمایا ان کا بھی یہی حال تھا۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ ہم فقراء مہاجرین میں سے نہیں ہیں (مقصد یہ تھا کہ میرے وظیفے میں اضافہ کروادیں) تو حضرت عبداللہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہاری بیوی ہے جس کے پاس تم آرام کرنے کے لیئے لوٹتے ہو؟

اس نے جواب دیا کہ ہاں بیوی تو ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی گھر ہے جس میں تم سکونت رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں گھر بھی ہے تو حضرت عبداللہ نے فرمایا۔ پھر تو تم اغنیاء میں سے ہو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک خادم بھی ہے تو حضرت عبداللہ رض نے فرمایا پھر تو تم بادشاہوں میں سے ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز زندگی یہ تھا جو آپ نے ملاحظہ فرمایا اور اسی کے مطابق آپ نے اپنی اہل و اولاد کی تربیت فرمائی تھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا۔ جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و شفقت شک و شبہ کی محتاج نہیں، ان کی تربیت جیسی کچھ آپ نے فرمائی ہوگی ظاہر ہے، لیکن ان جیسی دین دار اور نیک خاتون کے متعلق جب ہم بعض روایتوں میں دیکھتے ہیں کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خیبر فدک اور عوالی مدینہ منورہ میں جو فئے کی کچھ زمینیں تھیں اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے آپ کی تحویل میں تھیں۔ ان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وراثت کا دعویٰ کر دیا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب انھیں بتایا کہ وہ زمینیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت نہیں تھیں بلکہ ریاست کی ملکیت تھیں اور ان کا مصرف وہی رہے گا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور اسی کے مطابق میں اس کا انتظام کروں گا اور اس میں وہی تصرفات کروں گا۔ تو حضرت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ان سے ناراض ہوگئیں اور ان سے سلام و کلام بند کر دیا حتیٰ کہ چھ مہینے کے بعد جب ان کا انتقال

ہوا تو وہ وصیت فرما گئیں کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ان کی وفات کی اطلاع نہ دی جائے۔ کہیں وہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھ دیں۔ چنانچہ حضرت علی رضؓ نے خود ہی ان کی نماز جنازہ پڑھ دی اور راتوں رات ان کو دفن بھی کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مال فیئ کی حقیقت

جہاد کے نتیجہ میں جو کفار کے اموال مسلمانوں کے قبضے میں آئیں

قرآن کریم نے ان کی دو قسمیں کی ہیں ایک مال غنیمت جسے انفال بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ مال ہوتا ہے جو جنگ وجدال کے نتیجہ میں کفار کے ہزیمت کھا جانے کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے۔ دوسرا مال فئے کہلاتا ہے یہ وہ مال ہوتا ہے جو بغیر کسی جنگ وجدل کے کفار خود ہی مسلمانوں سے صلح کر کے حوالے کر دیں۔ ان کے احکام قرآن نے الگ الگ واضح طور پر بیان فرما دیئے ہیں۔ اموال غنیمت یا انفال کے متعلق ارشاد آلہی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ
وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ ۔

(۸/۴۱)

اور خوب جان لو کہ جو چیزیں تمھیں بطور مال غنیمت کے حاصل ہوں تو ان میں پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے اور قرابت داروں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے

(باقی چار حصّے مجاہدین میں تقسیم ہو جائیں گے) اگر تمھارا اللہ پر ایمان ہے۔

مال غنیمت کے پانچ حصّے کر کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں گے جنھوں نے اس جنگ میں حصّہ لیا ہو (بشرطیکہ یہ مجاہدین تنخواہ دار نہ ہوں بلکہ آنریری والنٹیر ہوں جیساکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہ جہاد میں آنریری طور پر حصہ لیا کرتے تھے) اور پانچواں حصّہ اللہ اور رسول کے نام سے الگ کر لیا جائے گا۔ جو سربراہ کی تحویل میں رہے گا اور وہ انھیں اپنی صواب دید کے مطابق قرابت داروں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرے گا۔ لیکن یہ خمس (پانچواں حصّہ) سربراہ کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ ریاست کی ملکیت ہوتا ہے۔ البتہ سربراہ کی تحویل میں ہوتا ہے۔

احکام القرآن میں امام رازی جصاص نے یہ روایت دو سندوں سے بیان فرمائی ہے

حدثنا محمد بن بکر قال حدثنا ابوداؤد قال حدثنا الولید بن عتبة قال حدثنا الولید قال حدثنا عبداللہ بن العلاء انّہ سمع ابا سلام بن الاسود یقول سمعت عمرو بن عبسة قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بعیر من المغنم فلما سلم اخذ وبرة من جنب البعیر ثم قال ولا یحل لی من غنائمکم مثل ھذا الا

الخمس والخمس مردود فیکم

ہم سے محمد بن بکر نے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سے ابو داؤد نے، انھوں نے کہا ہم سے ولید بن عتبہ نے۔ انہوں نے کہا ہم سے ولید نے انھوں نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن علار نے حدیث بیان کی انھوں نے ابو سلام بن الاسود کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عمرو بن عبسہ سے سنا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت سے نماز پڑھائی، مال غنیمت کا ایک اونٹ آپ کے سامنے کھڑا تھا۔ آپ نے سلام پھیرا تو اونٹ کے پہلو سے ذرا سی اون پکڑی اور فرمایا کہ تمہارے اموال غنیمت سے میرے لئے اتنا بھی حلال نہیں ہے بجز خمس کے اور وہ خمس بھی خود تمہارے (مستحق لوگوں کے) اوپر ہی لوٹایا جاتا ہے

یہی روایت دوسری سند سے یوں ہے

حدثنا محمد بن بکر قال حدثنا ابو داؤد قال حدثنا موسیٰ بن اسماعیل قال حدثنا حماد عن محمد بن اسحق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، ذکر غنائم ھوازن وقال ثم دنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بعیر فاخذ وبرۃ من سنامہ ثم قال: ایھا الناس انہ لیس لی من ھذا الفیئ شئ ولا ھذا ورفع اصبعیہ الا

الخمس والخمس مردود عليكم فادوا الخيط والمخيط فقام رجل فی يدہ کبة من شعر فقال اخذت هذه لاصلح بها بردة فقال رسول الله صلی الله عليه وسلم اما ما کان لی ولبنی عبد المطلب فهو لك فقال اما اذ ابلغت ما اری فلا ارب لی فيها ونبذها۔

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۶۴ - ۶۵ ج - ۳

ہم سے محمد بن بکر نے، انھوں نے کہا ہم سے ابو داؤد نے، انھوں نے کہا کہ ہم سے موسیٰ بن اسماعیل نے، انھوں نے کہا کہ ہم سے حماد نے، محمد بن اسحٰق سے انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے ان کے دادا سے حدیث بیان کی، انھوں نے جنگ ہوازن کی غنیمتوں کا بیان کیا اور اس سلسلے میں کہا کہ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اونٹ کے قریب گئے اور اس کے کوہان سے کچھ اون پکڑی، پھر فرمایا: اے لوگو! اس فۓ میں سے میرے لئے کچھ نہیں ہے اور یہ ذرا سی اون بھی نہیں ہے۔ اور اپنی دونوں انگلیاں اٹھائیں، بجز پانچویں حصے کے اور وہ پانچواں حصہ بھی تم پر ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔ لہذا سوئی اور دھاگا بھی کسی کے پاس ہو تو جمع کرادو۔ تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس کے ہاتھ میں بالوں کی ایک

گچھی تھی اور اُسنے کہا کہ میں نے یہ گچھی اس لئے لیلی تھی کہ اس سے چادر کو ٹھیک کر لوں گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کچھ میرے اور اولاد عبد المطلب کے حصہ میں آئے گا وہ تمہارا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ جب بات یہاں تک پہنچ گئی جو میں دیکھ رہا ہوں تو مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں اور اس نے اسے پھینک دیا۔

ان دونوں روایتوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی ہے کہ مال غنیمت کا خمس بھی سربراہ کا ذاتی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ قوم یا ریاست کی ملکیت ہوتا ہے اور قومی یا مملکتی معاملات میں ہی خرچ ہوتا ہے۔ البتہ سربراہ کی اپنی ذاتی ضروریات بھی اسی شامل ہیں۔ وہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے بھی اس سے بقدر ضرورت لے سکتا ہے۔

دوسری قسم، اموال فئے کی ہے جو بغیر کسی جنگ وجدال کے کفار صلح کر کے خود ہی پیش کر دیں اور مسلمانوں کے قبضے میں آجائے۔ اس کے احکام سورہ حشر میں تفصیل سے بیان فرما دیئے گئے ہیں۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً
بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ط وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ
فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ
الْمُهٰجِرِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ
قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ لَا يَجِدُوْنَ
فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ قف وَمَنْ
يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ
سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا
غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۵۹ / ۱۰-۷)

جو کچھ اللہ تعالیٰ کافروں سے اپنے رسول کو مال فئے
عطا فرما دے تو چونکہ تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے
نہ اونٹ دوڑائے لیکن (بغیر جنگ و جدال کے) اللہ
جن لوگوں پر چاہے اپنے رسولوں کو مسلط کر دیتا ہے

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ اللہ اپنے رسول
کو آبادیوں سے بطور فئے کے دلادے تو وہ اللہؐ
اور رسولؐ اور قرابتؐ داروں، یتیموںؐ، مسکینوںؐ اور
مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ تمہارے دولت مندوں
ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔ اس میں سے رسول جو
کچھ تمھیں دیدے اسے لے لو اور جو کچھ نہ دے
اس سے باز رہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ
سخت عذاب دینے والا ہے۔ نیز یہ مال فئے ان
فقرار و مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور مالوں
سے بیدخل کر دیئے گئے ہیں، وہ اللہ سے اس کے
فضل اور رضا کے طلبگار ہیں اور اللہ اور اس کے
دین کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں اور
ان لوگوں کا حقؐ ہے جنھوں نے ان سے پہلے اس
دارالاسلام اور ایمان کو اپنا وطن بنا لیا تھا (یعنی انصار
مدینہ) وہ ان لوگوں سے جو ان کی طرف ہجرت کر کے
آرہے ہیں محبت کرتے ہیں سینوں میں کوئی تنگی نہیں
پاتے اور مہاجرین کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں
خواہ خود فاقہ میں ہوں۔ جو لوگ نفسانی طمع سے
بچا دیئے جائیں وہی فلاح پاتے ہیں۔ مال فئے ان
لوگوں کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئیں گے۔ وہ
کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے

ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گذر چکے
بخش دے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے
جو ایمان لائے کوئی کینہ نہ رکھ اے ہمارے پروردگار
یقیناً تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

مال غنیمت کے خمس کے متعلق حق تعالیٰ نے جیساکہ وضاحت سے بتا دیا تھا کہ خمس [1] اللہ کے لئے، رسولؐ کے لئے، ذی القربیٰ کے لئے، یتامیٰ کے لئے، مساکین کے لئے اور مسافروں کے لئے ہوتا ہے یعنی اسے ان چھ مصارف میں خرچ کیا جائے گا اور وہ ان کا حق ہے۔ اسی طرح مال فئے کے لئے بھی حق تعالےٰ نے اتنی ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ مال فئے کے حق داروں کا بیان بھی فرما دیا ہے۔ اس کے مصارف چھ کے بجائے ۹ بیان فرمائے ہیں۔ [1] اللہ، [2] رسولؐ، [3] ذی القربیٰ، [4] یتامیٰ، [5] مساکین، [6] مسافرین، [7] فقراء مہاجرین، [8] ضرورت مند انصار مدینہ، [9] آئندہ نسلوں میں پیدا ہونے والے ضرورت مند۔ سورہ حشر کی یہ آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان کا مطلب سمجھنے میں ایک عامی آدمی کو بھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ ہماری عقل قطعًا اس کی تائید نہیں کرتی کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی زیرک عاقلہ بالغہ خاتون جنت سورہ حشر کی ان واضح آیات کا مطلب نہیں سمجھ سکیں اور انہوں نے فدک کی میراث کا دعویٰ فرما دیا۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔

حدثنی عبد اللہ بن محمد قال حدثنا ھشام
قال اخبرنا معمر عن الزھری عن عروۃ عن
عائشۃ ان فاطمۃ والعباس اتیا ابا بکر
یلتمسان میراثھما عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم وھما یومئذٍ یطلبان ارضیھما
من فدک وسھمہ من خیبر فقال لھما
ابوبکر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یقول لا نورث ما ترکنا صدقۃ انما یاکل
آل محمد من ھذا المال قال ابوبکر واللہ لا
ادع امراً رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یصنعہ فیہ الا صنعتہ قال فھجرتہ
فاطمۃ فلم تکلمہ حتی ماتت

(ج ۲ صفحہ ۹۹۵ - ۹۹۶)

(صحیح بخاری کتاب الفرائض مطبوعہ مطبعہ مجتبائی دہلی)

ہم سے عبد اللہ بن محمد نے حدیث بیان کی، انہوں
نے کہا کہ ہم سے ہشام نے حدیث بیان کی۔ انہوں
نے کہا کہ ہمیں معمر نے زہری سے خبر دی، انہوں نے
عروہ سے، انہوں نے عائشہؓ سے کہ حضرت فاطمہؓ
اور عباسؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے، وہ دونوں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی میراث کا مطالبہ
کر رہے تھے۔ اور وہ دونوں اس دن اپنی وہ دونوں

زمینیں طلب کر رہے تھے جو فدک میں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ خیبر میں تھا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوگا۔ البتہ اس مال فئے میں سے محمد کی آل (بیویاں اور بچے) کھا سکتے ہیں۔ ابو بکر رضؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم میں اس طرز عمل کو نہیں چھوڑوں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھا ہے میں بھی وہی کرتا رہوں گا۔ زہری نے کہا کہ اس پر حضرت فاطمہ رضؓ نے ابو بکر صدیق رضؓ سے قطع تعلق کر لیا۔ اور پھر ان سے کوئی بات نہیں کی حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سن کر حضرت فاطمہ رضؓ کا ناراض ہو جانا اور حضرت صدیق اکبر رضؓ سے قطع تعلق کر لینا ہماری ناقص عقل میں نہیں آتا۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی صرف حضرت صدیق اکبر رضؓ ہی بیان نہیں کر رہے بلکہ یہی ارشاد گرامی دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے۔

خود امام بخاری اسی کتاب الفرائض باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکنا صدقہ ج ۲ ص۹۹۶ میں بتاتے ہیں کہ صدیق

اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے علاوہ حضرت عثمانؓ و عبدالرحمٰن و زبیرؓ و سعدؓ بن ابی وقاصؓ نے بھی آنحضرتؐ سے یہ ارشاد سنا تھا' اور ان سب کے سامنے جب حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ و حضرت علیؓ کو قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے بھی اس کے ارشاد نبوی ہونے کا اعتراف کیا۔ پھر اسی باب میں حضرت ابو ہریرہ کی بھی یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا لا یقتسم ورثتی دینارا۔ ماترکت بعد نفقۃ نسائی ومؤنۃ عاملی فھو صدقہ یعنی میرے ورثہ پر مال تقسیم نہیں ہوگا بلکہ میری ازواج اور خادم کے خرچہ کے بعد جو کچھ بچے گا وہ صدقہ ہے اور بخاری ہی کی جلد اول ص۳۸۴ کتاب الوصایا میں حضرت جویریہ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی حضرت عمرؓ بن حارث سے بھی یہ روایت موجود ہے۔ اس طرح اس روایت کے کل راوی بارہ صحابہ ہوئے جن میں دس کے متعلق خود بخاری میں ذکر موجود ہے باقی دو حضرت ابوالدرداء اور حضرت حذیفہؓ کا ذکر دوسری کتابوں میں ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی "اپنی کتاب احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ ان ھذا الخبر قد رواہ ایضا حذیفۃ ابن الیمان والزبیر بن العوام وابو الدرداء وابوھریرہ والعباس وعلی وعثمان وعبدالرحمٰن بن عوف وسعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم (احکام القرآن ص۱۰ ج۳) مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی

اس خبر کو حضرت حذیفہ بن الیمان رضؓ نے زبیر بن العوام نے اور ابو درداء رضؓ نے، ابوہریرہ رضؓ نے اور حضرت عباس رضؓ نے اور حضرت علی رضؓ نے اور حضرت عثمان رضؓ نے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی بیان کیا ہے۔

یعنے پورے نو صحابۂ کرام نے بیان فرمایا ہے اور حضرت صدیق اکبر رضؓ کو شامل کر کے یہ تعداد پوری دس ہو جاتی ہے (تلك عشرة كاملة) جن میں سے چھ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسی روایت کو حضرت علی رضؓ اور حضرت عباس رضؓ بھی بیان فرما رہے ہیں اور اس کے باوجود حضرت عباس رضؓ بذات خود مطالبہ کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں اور حضرت علی رضؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مطالبہ کرنے کے لئے بھیج رہے ہیں۔ اور اگر شیعی روایات پر اعتبار کیا جائے تو حضرت فاطمہ رضؓ کے بے نیل مرام واپس آجانے کے بعد حضرت علیؓ انھیں دوبارہ صدیق اکبر رضؓ کے پاس بھیجتے ہیں کہ ان سے جاکر کہو کہ سلیمان علیہ السلام بھی تو حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے تھے وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ (۲۷/۱۶) اور زکریا علیہ السلام نے بھی تو دعا کی تھی کہ مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث ہو فهب لى من لدنك وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (۱۹/۶) لہذا آپ یہ کیسے

کہتے ہیں کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ حضرت علامہ شیخ الاسلام عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

وما ذكروه من دلالة الآيتين على كذب الخبر، فى غايت الوهن لان الوراثة فيهما وراثة العلم والنبوة والكمالات النفسانية لا وراثة العروض والاموال يدل على ذلك مارواه الكليني عن ابى عبد الله ان سليمان ورث داؤد وان محمد اورث سليمان فان وراثة المال بين نبينا صلى الله عليه وسلم و سليمان غير متصورة بوجه وايضا ان داؤد عليه السلام على ماذكره اهل التاريخ كان له تسعة عشر ابنا وكلهم كانوا ورثة بالمعنى الذى يزعمه الخصم فلا معنى التخصيص بعضهم بالذكر دون بعض فى وراثة المال لاشتراكهم فيهما من غير خصوصية لسليمان عليه السلام بها بخلاف وراثة العلم والنبوة وايضا توصيف سليمان بتلك الوراثة مما لا يوجب كمالا ولا يستدعى امتيازاً لان البر والفاجر يرث اباه فاى داع لذكر هذه الوراثه العامة فى بيان فضائل هذا النبى ومناقبه عليه السلام ومما

يدل على ان الوراثة فى الأية الثانية كذلك ايضا لانه لو كان المراد بالوراثة فيها وراثة المال كان الكلام اشبه شيئ بالسفسطة لان المراد بآل يعقوب حينئذٍ ان كان نفسه الشريفة يلزم منه ان مال يعقوب عليه السلام كان باقيا غير مقسوم الى عهد زكريا وبينهما نحو الفى سنة وهو كما ترى وان كان المراد جميع اولاده يلزم ان يكون يحيى وارثا جميع بنى اسرائيل احياءً وامواتا وهذا افحش من الاول ـ الخ

(احکام القرآن ج۲ ص۱۰۱ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

شیعہ جو کہتے ہیں کہ دونوں آیتیں اس روایت کے جھوٹے ہونے پر دلالت کر رہی ہیں وہ نہایت ہی کمزور ہے کیوں کہ ان دونوں میں وراثت سے مراد علم نبوت اور کمالات نفسانیہ کی وراثت ہے ۔ گھریلو سامان و اسباب اور اموال کی وراثت مراد نہیں ہے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محدث کلینی نے ابو عبداللہ (جعفر صادق) سے بیان کی ہے کہ سلیمان عبدالسلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے کیونکہ ہمارے نبی اور سلیمان علیہما السلام کے درمیان مالی وراثت کسی طور

بھی متصور نہیں ہو سکتی ۔ نیز داؤد علیہ السلام کے جیساکہ مؤرخین نے بیان کیا ہے انیس[19] لڑکے ہوئے تھے اور جس معنے میں شیعہ وراثت کو لے رہے ہیں اس معنے میں وہ سب کے سب وارث تھے ۔ لہذا کسی ایک کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کے کوئی معنے نہیں ہیں کہ ایک کو بیان کیا جائے اور دوسروں کو چھوڑ دیا جائے ۔ کیوں کہ مالی وراثت میں سارے شریک ہیں ۔ اس میں سلیمان علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہیں ہے ۔ برخلاف علم اور نبوت کی وراثت کے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کیلئے ہی مخصوص تھی نیز مالی وراثت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام کو موصوف کرنے میں نہ سلیمان علیہ السلام کا کوئی کمال ہے اور نہ یہ ان کا کوئی امتیاز ہے ۔ کیونکہ ہر نیک وبد اپنے باپ کا وارث ہوتا ہی ہے ۔ تو اس وراثت عامہ کے بیان کرنے کا اس نبی کے فضائل و مناقب میں کونسا داعیہ ہو سکتا تھا؟ دوسری آیت میں بھی وراثت سے مراد وہی علم اور نبوت کی وراثت ہے ۔ کیونکہ اگر اس آیت میں وراثت سے مراد مالی وراثت ہو تو بحث فلسفیانہ فریب اور مغالطہ سے زیادہ مشابہہ ہوگی ۔ کیوں کہ اگر آل یعقوب سے مراد خود

حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذات شریف ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ یعقوب علیہ السلام کا مال و دولت زکریا علیہ السلام کے عہد تک باقی تھا اور تقسیم نہیں ہوا تھا حالانکہ دونوں حضرات کے درمیان دو ہزار سال کا عرصہ ہے ۔ اور اگر یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد مراد ہے تو لازم آتا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے، زندوں کے بھی، مُردوں کے بھی سب کے مالی وارث ہوں یہ صورت پہلی صورت سے بھی زیادہ غلط اور بیہودہ ہے ۔

حضرت علی رضی کی مالی حیثیت

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے تمام اخراجات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھے اور وہ ماشاء اللہ بقید حیات تھے ۔ حضرت فاطمہ رضی کو پریشانی کس بات کی تھی ۔ حضرت علی رضی کچھ ایسے بھوکے ننگے بھی نہیں تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ضروریات پوری نہ کر سکتے ہوں ۔ اور انھیں اپنے والد سے وراثت کے حصّہ کی ضرورت ہو ۔ حضرت علی رض کے متعلق بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے کہ

مجھ سے حدیث بیان کی حسین بن الاسود نے انھوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی وکیع بن الجراح نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی حسین بن صالح بن حیی نے اور ان سے جعفر بن محمد نے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو چار جاگیریں عطا فرمائی تھیں۔ دو الفقیرین میں، ایک بنو قیس میں اور ایک الشجرہ میں (اردو ترجمہ فتوح البلدان ص۳۵ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

ہم سے حدیث بیان کی حسین نے یحیی بن آدم سے، انہوں نے حسن بن صالح سے کہ مجھ سے حدیث بیان کی جعفر بن محمد نے .... (مندرجہ بالا روایت کے مثل (ایضاً ص۳۶)

مجھ سے حدیث بیان کی عمرو بن محمد بن الناقد نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی حفص بن غیاث نے، ان سے جعفر بن محمد نے اور ان سے ان کے والد نے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علیؓ کو پورا ینبوع کا علاقہ جاگیر میں دیا تھا اور پھر اس پر ایک اور جاگیر کا اضافہ کیا (ایضاً ص۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو چار جاگیریں عطا فرمائی تھیں۔ ان میں سے ذو الفقیرین میں اور ایک الشجرہ میں اور ایک بنو قیس میں جس میں ایک کنواں بھی تھا پھر حضرت عمرؓ نے انھیں دو جاگیریں عطا فرمائیں۔ ینبوع کا سارا علاقہ انھیں جاگیر میں دیا اور پھر ایک اور کا اضافہ کیا۔ (ایضاً ص۳۵)

یہ چھ جاگیریں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں

تھیں، وہ کس قیمت کی تھیں اور ان سے سالانہ کتنی آمدنی ہوتی تھی اس کا ایک سرسری اندازہ مسند امام احمدؒ بن حنبل کی مندرجہ ذیل روایات سے لگایا جا سکتا ہے جو کسی اور سے نہیں بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی نقل کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

حدثنا عبد الله قال حدثنی ابی قال حدثنا حجاج قال حدثنا شریک عن عاصم بن کلیب عن محمد بن کعب القرظیؒ ان علیا رضی الله عنه قال لقد رأیتنی مع رسول الله صلی الله علیه وسلم و انی لاربط الحجر علی بطنی من الجوع و ان صدقتی الیوم اربعون الفاً۔

حدثنا عبد الله قال حدثنی ابی قال حدثنا اسود قال حدثنا شریکؒ عن عاصم بن کلیب عن محمد بن کعب القرظی عن علی رضی الله عنه فذکر الحدیث وقال فیه و ان صدقة مالی تبلغ اربعین الف دینار

مسند امام احمد بن حنبل ص ۱۵۹ ج ۱

ہم سے عبداللہ نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے میرے والد نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے حجاج نے حدیث بیان کی،

انھوں نے کہا کہ ہم سے شریک نے حدیث بیان کی عاصم بن کلیب سے انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھا ہے کہ میں بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ اور آج میری زکوٰۃ ہی چالیس ہزار ہوتی ہے۔

ہم سے حدیث بیان کی عبد اللہ نے، انہوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی میرے والد نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی اسود نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی شریک نے، عاصم بن کلیب سے۔ انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے چنانچہ انہوں نے وہی حدیث (جو اوپر مذکور ہوئی ہے) بیان کی اور اس میں فرمایا کہ میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار دینار تک پہونچتی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس روایت میں یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی سالانہ زکوٰۃ چالیس ہزار دینار بنتی ہے۔ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جو سال بھر کے اپنے سالانہ اخراجات پورے ہونے کے بعد بچ رہے۔ چالیس ہزار سالانہ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس

سارے سال کے اخراجات پورے کر لینے کے بعد سولہ لاکھ دینار یعنی ایک کرڑ وڑ ساٹھ لاکھ درہم سالانہ کی بچت ہوتی تھی۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جوں جوں آدمی کی آمدنی بڑھتی ہے اس کے اخراجات بھی اسی تناسب سے بڑھ جاتے ہیں۔ آپ تصور ہی کر سکتے ہیں کہ جس شخص کی سالانہ بچت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ درہم ہوتی تھی اس کی کل آمدنی کیا ہوتی ہوگی۔ اگر حضرت عمرؓ کی عطا کردہ جاگیر سے قطع نظر بھی کر لی جائے جو حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں انھیں عطا کی ہوگی جب کہ حضرت فاطمہؓ انتقال فرما چکی تھیں تب بھی عہد نبوی کی جاگیریں تو بہر حال حضرت علی کے پاس تھیں یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک صاحبِ حیثیت آدمی کی بیوی تھیں۔ پتہ نہیں انھیں کا ہے کا اتنا فکر تھا۔ آپ کو حیرت بالائے حیرت ہوگی کہ اس کے ساتھ ساتھ خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی خالی ہاتھ نہیں تھیں۔ فروع کافی جلد سوم ص۲۷ مطبوعہ لکھنؤ میں شیعہ محدث کلینی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وصیت نامہ نقل فرمایا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما اوصت به فاطمة بنت محمد صلی اللہ علیه وآله وسلم اوصت بحوائطها السبعة العفاف۔ والدلال۔ والبرقة والمبیت والحسنی والصافیة ومال ام ابراهیم الی علی بن ابی

طالب فان مضی فالی الحسن فان مضی فالی الحسین فان مضی الحسین فالی الاکبر من ولدی۔ شہد اللہ علی ذلک والمقداد بن الاسود والزبیر بن العوام وکتب علی بن ابی طالب (فروع کافی ج ۳ ۲۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وصیت نامہ ہے جس کی وصیت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اس میں فاطمہ رض نے اپنے سات باغات کی وصیت کی ہے جس کے نام یہ ہیں۔ عفاف۔ دلال۔ برقہ مبیت حُسنیٰ۔ صافیہ اور مال ام ابراہیم۔ اس وصیت نامہ کے وصی علی ابن ابی طالب ہوں گے پھر جب وہ گذر جائیں، یعنی وفات پا جائیں تو اس کے وصی حسن رض ہوں گے، پھر جب وہ بھی گذر جائیں تو اسکے وصی حسین رض ہوں گے، پھر جب وہ بھی گذر جائیں تو میری اولاد میں سے جو سب سے بڑا ہوگا وہ وصی ہوگا۔ اس وصیت نامہ پر اللہ کی گواہی ہے اور مقداد بن الاسود اور زبیر بن العوام کی۔ اسے علی بن ابی طالب نے لکھا۔

یہ وصیت نامہ غالباً وقف کے لئے ہے ورنہ کئی آدمیوں کو یکے بعد دیگرے وصی بنانے کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ غالباً وصی بنانے سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وقف کا

متولی بنانے سے ہے۔ ایک طرف شیعہ روایات کا وہ بیان ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ کا اصرار ہے کہ انھیں ان کے والد کے ترکہ سے ان کا حصہ دیا جائے۔ اور جب حضرت ابوبکر صدیق رض ان کے مطالبہ کو تسلیم نہیں فرماتے تو وہ ان سے ناراض ہوجاتی ہیں اور سلام وکلام بند کردیتی ہیں حتیٰ کہ مرتے وقت وہ اس کی روادار بھی نہیں ہوتیں کہ حضرت صدیق اکبر رض اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں اور انکی تکفین وتدفین میں شریک ہوسکیں۔ لیکن دوسری طرف وہ خود اپنے والد ماجد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کی پیروی فرمارہی ہیں کہ نہ اپنے سات باغات میں سے اپنی اولاد کے لئے کچھ چھوڑ رہی ہیں نہ اپنے شوہر کے لئے بلکہ ساتوں باغات وقف کررہی ہیں۔

واضح رہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چھ ماہ بعد ہی ہوگیا تھا۔ لہٰذا یہ سات باغات حضرت فاطمہ رض کو کسی اور ذریعہ سے حاصل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باغات انھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے عطا فرمائے تھے۔

ہماری عقل واقعی یہ کام نہیں کرتی کہ اس قدر زہد وقناعت تقویٰ و طہارت اور دیانت وامانت کی پیکر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وہ تصویر جو ہمارے راویوں نے بنائی ہے وہ انھوں نے کس شوق

یں بنائی ہے جو ان کے حالات وکوائف اور اخلاق کریمانہ سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی۔ جن کے والد ماجد خود ان کو سات باغات اور شوہر نامدار کو چار جاگیریں عطا فرما گئے۔ اور وہ ساتوں باغات کو بھی اللہ کی راہ میں وقف فرما گئیں وہ فدک، خیبر اور عوالی مدینہ کی چند زمینوں کا اس اصرار و تکرار کیساتھ ہرگز مطالبہ نہیں فرما سکتی تھیں۔ یہ ہمارے راویوں ہی کی کار فرمائی ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

بعض متعصب راویوں نے ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ تصویر بنائی ہے جو وہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کیخلاف پیش کرتے ہیں کہ وہ بار بار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وراثت کی طلب کے لئے صدیق اکبر رضؓ کی خدمت میں بھیج رہے ہیں اور دوسری طرف ان کے زہد و قناعت کی یہ تصویر بھی ہے جو حضرت رسول اکرم ؐ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے طرز عمل کے عین مطابق ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ وصیت نامہ فروع کافی میں شیعہ محدث کلینی صاحب نے نقل فرمایا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما اوصٰی بہ وقضٰی بہ فی مالہ عبد اللہ علی ابتغاء لوجہ اللہ تعالٰی لیدخلنی بہ الجنۃ ویصرفنی بہ عن النار ویصرف النار عنی یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ ان ماکان لی من ینبع من مال یعرف لی فیھا وما حولھا صدقۃ ..

.... (اس کے بعد کچھ دوسری زمینوں

کو شمار کرا کے فرماتے ہیں)

هذه الصدقة واجبة البتة حيا او ميتا ينفق فی كل نفقة يبتغی بها وجه الله تعالیٰ فی سبيل الله ووجهه وذوی الرحم من بنی هاشم وبنی المطلب والقريب والبعيد فانه يقوم علی ذلك الحسن ابن علی ....

وانه يشترط علی الذی يجعله اليه ان يترك المال علی اصوله وينفق ثمره حيث امرته به فی سبيل الله ووجهه وذوی الرحم من بنی هاشم وبنی المطلب والقريب والبعيد لا يباع منه شیٔ ولا يوهب ولا يورث ۔

(فروع کافی ص ۲۸ مطبوعہ لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم :- یہ وہ فیصلہ ہے جس کی وصیت اور جس کا فیصلہ اللہ کے بندے علی رضؓ نے اپنے مال کے بارے میں محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے کیا ہے تاکہ اس کے عوض وہ مجھے جنت میں داخل کر دے اور مجھے جہنم کی آگ سے اور جہنم کی آگ کو مجھ سے دور کر دے (قیامت کے دن) جبکہ کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے

سیاہ پڑھائیں گے کہ جو کچھ میرے اموال ینبوع میں
جو وہاں میرے نام سے معروف ہیں اور جو اس
کے آس پاس ہیں سب صدقہ ہیں۔ (اس کے بعد
دوسرے علاقوں کی زمینیں گنائی ہیں) یہ صدقہ واجب
ہو چکا ہے اور میری ملکیت سے الگ ہو چکا ہے،
میں چاہے زندہ رہوں یا مر جاؤں۔ یہ
وہاں خرچ کیا جائے گا جس میں اللہ کی رضامندی ہو
اور خرچ کیا جائے گا میرے رشتہ داروں میں بنو ہاشم
اور بنو عبد المطلب میں سے اور خرچ کیا جائے گا قریبی
اور دور کے رشتہ داروں میں اور اس وقف کے
متولی حسن بن علیؓ ہوں گے ....
اور علیؓ شرط کرتا ہے اس شخص پر جو اس وقف کا
متولی ہوگا کہ اس زمین کو اپنے اصل پر رہنے دے
یعنی خدا کی ملکیت میں اور اس کی پیداوار سے اخراجات
کرے جہاں خرچ کرنے کا میں نے فیصلہ کیا ہے
یعنی اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی میں، ہاشمی اور
مطلبی رشتہ داروں میں، قریب کے ہوں یا دور کے
ہوں اور اس زمین کا کوئی ٹکڑا نہ فروخت کیا جا سکے
گا نہ ہبہ کیا جا سکے گا۔ اور نہ ہی میراث میں دیا
جا سکے گا۔
یہ حدیث شیعہ محدث کلینی نے حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ

علیہ سے نقل کی ہے اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حضرت علی رضؓ نے اپنی ساری جائداد اللہ کی راہ میں وقف فرمادی تھی اور اپنے بڑے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو وقف کا متولی بنا دیا تھا اور ان کی وفات کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی کوئی جائداد میراث کے لئے نہیں چھوڑی۔ سب کی سب اراضی وقف فرمادی تھیں۔ اس کارروائی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں اپنی اولاد کی دنیوی آسودگی کا کوئی خیال نہیں تھا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اللہ کا ہوجاتا ہے اور خاصان بارگاہِ الٰہی میں سے ہوجاتا ہے اس کے توکل اور قناعت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ اپنی اولاد کو اللہ کے حوالے کر دیتا اور خود تمام تر محنت اور کوشش حق تعالیٰ کے حضور قیامت کے دن کی سرخروئی کے لئے کرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور نمونۂ زندگی ان کے سامنے تھا کہ وہ اپنے گھر والوں اور اولاد واحفاد کے لئے کوئی مال و دولت چھوڑنے کے بجائے پوری امت کیلئے (جسمیں انکی ازواج و اولاد بھی شامل ہیں صرف قرآن اور اپنی سنت) چھوڑ کر گئے۔ لامحالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی سنت نبوی پر عمل فرمایا اور اپنی اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہی ایک اور وقف کا

تذکرہ شیعہ محدث کلینی نے فروع کافی میں ان الفاظ سے فرمایا ہے۔

ایوب بن عطیۃ قال سمعت ابا عبد اللہ علیہ السلام یقول قسم نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الفیئ فاصاب علی ارضا فاحتفر فیھا عینا فخرج ماء ینبع فی الماء کھیئۃ عنق البعیر فسماھا ینبع فجاء البشیر یبشر فقال علیہ السلام بشر الوارث ھی صدقۃ فی حجیج بیت اللہ وعابری سبیل اللہ لا تباع ولا توھب ولا تورث فمن باعھا او وھبھا فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین لا یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا۔

(فروع کافی ج ۳ صـ۱۳ مطبوعہ لکھنؤ)

ایوب بن عطیہ کا بیان ہے کہ میں نے ابو عبداللہ (جعفر صادق) علیہ السلام سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فئے کی زمینیں تقسیم فرمائیں چنانچہ زمین کا ایک ٹکڑا حضرت علی رض کے حصہ میں آیا۔ انھوں نے وہاں ایک چشمہ کی کھدائی کرائی اس میں پانی نکلا جو اونٹ کی گردن کی طرح فوارے مار رہا تھا۔ حضرت علی رض نے اس کا نام ینبع رکھدیا۔ ایک آدمی خوشخبری لے کر آیا کہ حضرت علی رض کو بشارت

دے تو انھوں نے فرمایا، اسے خوشخبری دو جس کے
قبضہ میں یہ جانے والا ہے۔ یہ تو بیت اللہ کا حج
کرنے والوں۔ اللہ کی راہ میں سفر کرنے والوں کے
لئے صدقہ (وقف) ہے۔ نہ اسے فروخت کیا
جا سکتا ہے نہ یہ کسی کی وراثت ہو سکتا ہے۔ جو
اسے فروخت یا ہبہ کرے اس پر اللہ کی، فرشتوں
کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔ اللہ اس سے
نہ قیمت قبول فرمائے نہ بدلہ۔ اور عوض۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مال فیئے کو اس انداز سے اپنے لئے مخصوص نہیں فرمایا کرتے تھے کہ سب کچھ خود ہی اپنے قبضہ میں رکھ لیں اور کسی کو کچھ نہ دیں بلکہ حق تعالیٰ کے صریح حکم کے مطابق جو قرآن نے اس فیئے کے مصارف بیان فرمائے ہیں ان کے ضرورت مندوں اور مستحقوں میں آپ اسے تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔
چنانچہ حضرت علی رضؓ کو بھی اس میں سے حصّہ ملتا تھا۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اتنے سیر چشم اور کار خیر میں حصہ لینے والے تھے کہ وہ ان عطیات کو اپنے ذاتی مصارف میں لانے کے بجائے اسے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے وقف کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ آخرت میں ان کے لئے ذخیرہ بن سکے۔ ان میں مال و دولت، زمینداری اور جاگیر داری کی قطعاً طمع اور حرص و ہوس نہیں تھی جیسا کہ فدک کے نام نہاد افسانے

میں اس افسانے کے راوی حضرات نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ بھی شیعہ امامیہ کے ساتویں امام ہیں مؤرخین نے ان کی اولاد کی تعداد سینتیس ۳۷ بتائی ہے، ان کے متعلق بھی شیعی مذہب کی مستند کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنی جائداد وقف فرمادی تھی اور اپنی اولاد کے لئے وراثت میں قطعًا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ ان سینتیس ۳۷ بیٹوں میں سے انھوں نے صرف اپنے دو صاحبزادگان یعنی آٹھویں شیعہ امام حضرت علیؒ رضا اور حضرت ابراہیم کو اپنے اس وقف کا متولی نامزد فرمایا تھا چنانچہ مذہب شیعہ کی دوسری مستند کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھذا ما تصدق به موسیٰ بن جعفر تصدق بارضه فی مکان کذا وکذا کلھا وحد الارض کذا وکذا۔ تصدق بھا کلھا.......................

(من لا یحضرہ الفقیہ ص ۲۹۳ ج ۲ مطبوعہ طہران)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ تحریر ہے جس کے ذریعہ سے موسیٰ بن جعفر نے وہ تمام زمینیں جو فلاں فلاں مقام پر واقع ہیں اور جن کی حدود اربعہ میں فلاں مقامات آتے ہیں وہ سب کی سب صدقہ وخیرات

(یعنی اللہ کی راہ میں وقف) ہیں۔
شیعہ فقہ کی کتاب شرح لمعہ ص ۲۲۴ ج ۱ کے حاشیہ پر حضرت جابر انصاری کی مندرجہ ذیل روایت نقل کی گئی ہے۔

قال جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، لم یکن احدا
من الصحابۃ ذو مقدرۃ الا وقف

(شرح لمعہ ص ۲۹۳ ج ۱

حضرت جابر انصاری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ صحابہ کرام میں کوئی صاحب مقدرت صحابی نہیں تھا جس نے کوئی نہ کوئی وقف نہ کیا ہو۔

صحابۂ کرام نے اور شیعہ ائمہ نے سب نے اپنی جائدادیں اور زمینیں وقف فرمائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کرنے میں سب سے آگے تھے۔ جیساکہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔ قدم قدم اس کی پیروی کرتے تھے حضور کا اسوۂ حسنہ چونکہ یہی تھا کہ آپ وہ سب کچھ جو آپ کے تصرف اور قبضہ میں تھا وہ سب اللہ کی راہ میں صدقہ یعنی وقف فرما گئے تھے لہٰذا صحابہ کرام نے بھی اسی سنت نبوی کی پیروی فرمائی۔ اور جو صحابہ کرام ذرا خوش حال تھے اور انھیں حق تعالیٰ نے کچھ دے رکھا تھا یعنی صاحب مقدرت تھے۔ انھوں نے بھی اس کی پیروی فرمائی۔ اس کے بعد کوئی شبہ نہیں رہتا کہ جن متعصب راویوں نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما

کی طرف منسوب کر کے مطاعن والزامات کے افسانے بنائے ہیں ۔ وہ خود ان کے دماغوں کی اختراع ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا عمل خود اسی کے مطابق تھا اور ان کے ارشادات بھی اسی طرز عمل کے داعی ہیں ۔ ملاحظہ ہوں مستند شیعی کتابوں کے حوالے ۔

عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان العلماء ورثۃ الانبیاء، ان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھما ولکن اورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر

ابو عبداللہ علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یقیناً علماء انبیا علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں یقیناً انبیاء دینار اور درہم وراثت میں نہیں چھوڑتے ۔ البتہ وہ وراثت میں علم چھوڑتے ہیں ۔ تو جس نے علم سے کچھ حاصل کرلیا اس نے وراثت کا بڑا حصہ حاصل کرلیا ۔

(اصول کافی باب العلم والمتعلم ص۸)

مزید ملاحظہ ہو ۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان العلماء ورثۃ الانبیاء وذلک ان الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینارا واتما اورثوا احادیث من

احادیثھم فمن اخذ بشیٔ منھا فقد اخذ حظا وافرا۔

ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یقیناً علماء ہی انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام وراثت میں درہم اور دینار نہیں چھوڑا کرتے بلکہ وہ اپنی احادیث میں سے کچھ احادیث چھوڑ جاتے ہیں تو جس نے ان احادیث میں سے کچھ حاصل کر لیا اس نے وراثت کا بڑا حصہ حاصل کر لیا۔

اصول کافی باب صفۃ العلم وفضلہ ص جو جنگ نامہ حنیف کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تیسرے صاحبزادے حضرت محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کو جو جنگ نامہ حنیف کے حوالے سے بہت مشہور ہیں وصیت فرمائی تھی۔

وتفقہ فی الدین فان الفقھاء ورثۃ الانبیاء ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکنھم ورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر

اور دین میں سمجھ حاصل کر کیونکہ فقہاء ہی انبیاء کے وارث ہوا کرتے ہیں یقیناً انبیاء اپنی وراثت میں دینار اور درہم نہیں چھوڑا کرتے بلکہ وہ وراثت میں علم ہی چھوڑا کرتے ہیں۔ لہذا جو شخص علم سے کچھ حاصل کر لے اس نے وراثت کا

بڑا حصہ حاصل کر لیا۔

من لا یحضرہ الفقیہ ص۳۴۶ ج۲۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس وصیت کا اثر یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد حضرت محمد بن الحنفیہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ان علیا لما قبض اتی محمد ابنہ حسنا و حسینا علیہما السلام فقال لہما اعطیانی میراثی من ابی فقالا لہ قد علمت ان اباک لم یترک صفراء ولا بیضاء فقال قد علمت ولیس میراث المال اطلب، انما اطلب میراث العلم۔

جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوگئی تو انکے صاحبزادے محمد (ابن الحنفیہ) حسن اور حسین علیہما السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں سے کہا کہ میرے والد سے میری میراث مجھے عطا کیجئے تو ان دونوں نے کہا کہ تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے والد نے نہ سونا چھوڑا ہے نہ چاندی۔ تو حضرت محمدؒ نے کہا کہ مجھے معلوم ہے۔ میں مال کی میراث طلب نہیں کر رہا۔ میں تو صرف علم کی میراث مانگ رہا ہوں۔

(شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید ص۲۹۳ ج۱ جزو ہفتم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری لمحات میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور اپنے دونوں صاحبزادگان یعنی حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو آپ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ

یا رسول اللہ ھذان ابناك فورثھما شیئا۔ فقال اما الحسن فان لہ ھیبتی و سوددی واما الحسین فان لہ جرأتی و جودی۔

اے رسول اللہ! یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں۔ انھیں اپنی وراثت میں سے کچھ عطا فرمائیے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ دیکھو حسن رض کو (میری وراثت میں سے) میری ہیبت اور سرداری ملے گی اور حسین کو (میری وراثت میں سے) میری جرأت اور میری سخاوت ملے گی۔

الامامۃ لابن جریر الطبری ص ۳ و شرح نہج البلاغۃ حدیدی ص ۲۶۱/۲۷۰ جزو ۱۶۔

اس روایت میں سفارش کرنے والی حضرت فاطمہ زہرا ہیں جو حضور اکرم کی چہیتی صاحبزادی ہیں ان کی خاطر داری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر عزیز تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے شیعہ اور اہل سنت کی کتب حدیث اس سلسلہ کی احادیث و

روایات سے بھری پڑی ہیں اور حضرت فاطمہ لخت جگر رسول جن دو صاحبزادوں کے لئے سفارش فرما رہی ہیں ان سے جو کچھ آپ کو تعلق خاطر تھا وہ بھی محتاج بیان نہیں ہے۔ پھر جس رحمت عالم سے سفارش فرما رہی ہیں اس کی جود و سخا اور شفقت و رحمت بھی محتاج بیان نہیں ہے جب کہ خود حق تعالےٰ نے اسے رحمۃ للعٰلمین کا خطاب عطا فرما کر وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کی شہادت دیدی ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں کہ یا رسول اللہ! یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں۔ انھیں اپنی وراثت میں سے کچھ حصّہ عطا فرما دیجئے۔ اس سفارش کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن رضؓ کو میری ہیبت و رعب اور میری سرداری ملے گی۔ اور حسین رضؓ کو میری جرأت و ہمت اور سخاوت ملے گی۔

اس پر حضرت فاطمہ رضؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں تو جاگیر مانگ رہی ہوں یا دنیوی مال و متاع کو طلب کر رہی ہوں، بلکہ وہ خوش ہو کر چلی جاتی ہیں۔ یعنی خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک میں وراثت کی فرمائش سے معنوی وراثت یعنی اخلاقی کمالات اور ذاتی فضائل ہی کا تصور پیدا ہوا۔ اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے زہد آشنا ذہن میں بھی یہی کچھ تھا۔ مانگنے والی نے بھی یہی کچھ مانگا تھا اور دینے والے نے بھی یہی کچھ عطا فرمایا۔ اللهم صل علی محمد وآله واصحابه وسلم۔

یہ سب اسی وجہ سے تو تھا کہ مانگنے والی بھی خوب جانتی تھی کہ

میں کس سے مانگ رہی ہوں اور مجھے اس سے کیا مانگنا چاہیئے۔ وہ جانتی تھیں کہ میں جس سے مانگ رہی ہوں اس کی وراثت دنیوی مال و متاع نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی وراثت ذاتی فضائل، کمالاتِ اخلاقیہ، حسن عمل اور خوش کرداری اور بلندیٔ حوصلہ اور جود وسخا اور تقوٰی و طہارت ہی ہوسکتی ہے۔ اُدھر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بھی خوب جانتے تھے کہ مجھے اپنی اولاد اور نواسوں کو کیا دینا چاہیئے اور فاطمہ رضؓ کی کیا فرمائش اور کیا سوال ہے اور وہ مجھ سے کیا مانگ رہی ہیں ورنہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس مادّی مال و متاع کا بھی فقدان نہیں تھا۔ آپ مادّی مال و متاع میں سے بھی کچھ دے سکتے تھے۔ اور بھی کچھ نہیں تو وہ زمینیں تو موجود ہی تھیں جن کے بارے میں (بقول ہمارے متعصب راویوں کے) آپ کی وفات کے بعد حضرت عباسؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما نے جھگڑا اٹھایا یعنی فدک، خیبر اور عوالیٔ مدینہ میں خمس اور فیٔ کی زمینیں جو حضور اکرم کی تحویل میں تھیں۔

اس قضیے کی تحقیق

یہ تو ہوسکتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فدک، خیبر وغیرہ کی اراضی سے جو فیٔ کا حصہ تھیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھیں اپنے حصّہ میراث کا مطالبہ اس لئے کیا

ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کو ان اراضی کی واقعی صورت حالات کا علم نہ ہو اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ذہول ہو گیا ہو۔ لیکن جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان اراضی کی حقیقی صورت حال بیان فرما دی تو دونوں حضرات کا اطمینان ہو گیا۔ ان دونوں حضرات کا صحابہ کرام میں جو درجہ ہے وہ کسی مسلمان سے مخفی نہیں۔ ان میں سے ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر ہیں اور دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند پایہ عم محترم ہیں۔ ان دونوں حضرات کے متعلق اس کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضور اکرم کا ارشاد گرامی سننے کے بعد کسی قسم کی تلخی یا ناگواری کا اظہار فرمائیں گے۔ وہ تو وہ ایسا اظہار تو کسی معمولی درجہ کے مسلمان سے بھی ممکن نہیں ہے جب کہ حق تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

(۴/۶۵)

پس (دیکھو) تمہارے پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی بھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے

خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں اور وہ جو کسی بات کو پوری طرح مان لینا ہوتا ہے اسی طرح ٹھیک ٹھیک مان لیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سننے کے بعد سر تسلیم خم کر دینا اور کسی طرح کی تنگی محسوس نہ کرنا تو تقاضائے ایمان ہے۔ یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک ارشاد نبوی پیش کیا اور اس پر حضرت فاطمہ رض صدیق اکبر رض سے ناراض ہو گئیں اور ان سے سلام کلام بند کر دیا اور مرتے وقت تک اس پر قائم رہیں۔ شیعہ عالم ابن میثم بحرانی کی شرح نہج البلاغۃ میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب حقیقی صورت حال بیان فرمائی کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاخذ من فدک قوتکم ویقسم الباقی و یحمل منہ فی سبیل اللہ ولکِ عَلَیَّ ان اصنع بھا کما کان یصنع فرضیت بذلک واخذت العھد علیہ بہ وکان یاخذ غلتھا فیدفع الیھم منھا ما یکفیھم ثم فعلت الخلفاء بعدہ کذلک الی ان ولی معاویۃ

(شرح نہج البلاغۃ علامہ ابن میثم بحرانی ص۵۴۳ مطبوعہ ایران)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدک کی پیداوار سے تمہارے سب کے کھانے پینے کے بقدر لے لیا کرتے تھے اور

جو باقی بچتا تھا اُسے مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اسی کی آمدنی سے آپ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) سواریاں مہیا کیا کرتے تھے اور یہ میرا تم سے عہد ہے کہ میں اس میں وہی کچھ کروں گا جو رسول اللہ کیا کرتے تھے۔ تو حضرت فاطمہ رض اس پر راضی ہوگئیں اور اسی کا ان سے عہد لیا اور صدیق اکبر رض فدک کی پیداوار لے کر ان کو اتنا بھیج دیا کرتے تھے جو انھیں کافی ہو جائے۔ حضرت ابوبکر رض کے بعد دوسرے تمام خلفاء نے بھی اسی کے مطابق عمل کیا تا آنکہ خلافت حضرت معاویہ رض تک پہنچ گئی۔

یہ کسی سنی مصنف کا بیان نہیں ہے بلکہ مشہور شیعہ عالم ابن میثم بحرانی کا بیان نہج البلاغۃ کی شرح میں ہے اس میں وہ تصریح فرما رہے ہیں کہ حضرت فاطمہ رض اس پر راضی ہو گئی تھیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس عہد کے مطابق برابر انھیں سال بھر کا غلّہ اتنی مقدار میں بھیجتے رہے جو انھیں کافی ہو جائے اور ان کے بعد دیگر خلفاء حضرت عمر رض حضرت عثمان رض حضرت علی رض حضرت حسن رض اور حضرت معاویہ رض تک تمام خلفاء حضرت فاطمہ رض کی اولاد کو اسی طرح بھیجتے رہے۔ اگر خدانخواستہ کسی طرح کی ناراضگی اور ناگواری ہوتی تو یہ حضرات غلہ وصول ہی نہ کرتے۔ ان حضرات کا برابر اس غلّہ کو وصول کرتے رہنا اس

بات کی واضح دلیل ہے کہ ناراضگی اور ناگواری کے افسانے سب بعد والوں کے دماغوں کی اختراع ہیں۔ ان حضرات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت علیؓ کا عمل

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام سربراہ اور امیر کے فرائض و واجبات پانچ شمار کرائے ہیں جن کی ادائیگی سربراہ کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ مستند شیعہ کتاب نہج البلاغہ میں ہے کہ۔

انہ لیس علی الامام الا ما حمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظۃ والاجتہاد فی النصیحۃ والاحیاء للسنۃ واقامۃ الحدود علی مستحقیہا واصدار السہمان علی اہلہا (نہج البلاغۃ ج ۱ ص ۲۰۲ مطبوعہ مصر)

امام پر واجب ہے کہ اپنے پروردگار کے احکام کو ادا کرنے کی جو ذمہ داری اس نے اٹھائی ہے اسے پورا کرے۔ یعنی ۱ وعظ و نصیحت کو لوگوں تک خوب پہنچانا، لوگوں کی ۲ خیر خواہی میں پوری کوشش کرنا، نبی ۳ کی سنت کو زندہ کرنا مستحقین پر حدود کو قائم کرنا، حق داروں کو ان کے حصے اور حقوق ادا کرنا۔

ان فرائض و واجبات کو ادا کئے بغیر کوئی امام۔ برحق امام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سربرآرائے خلافت ہوئے

تو انھوں نے بھی فدک اور خیبر وغیرہ اور اراضیٔ فیٔ کے بارے میں کوئی نئی کارروائی نہیں فرمائی۔ اگر فدک وغیرہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حق تھا تو حضرت علیؓ کا فریضہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو فدک وغیرہ کا قبضہ دلا دیتے لیکن انھوں نے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد سے جو معمول چلا آرہا تھا وہ بھی اسی کی پیروی فرماتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسا اس لئے نہیں کیا کہ

لورددت فدك الى ورثة فاطمة عليها السلام لتفرقوا عني

(فروع کافی ج ۳ ص ۲۹ کتاب روضہ)

اگر میں نے فدک کو فاطمہ رضؓ کے وارثوں کو لوٹا دیا تو لوگ مجھ سے الگ ہو جائیں گے۔

لیکن یہ روایت اس لئے قابل تسلیم نہیں کیونکہ اس حد تک گری ہوئی مصلحت اندیشی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افتاد طبع تھی ہی نہیں۔ انھوں نے زندگی بھر جو کچھ حق جانا اور صحیح سمجھا ہمیشہ اس کے مطابق عمل کیا مصلحت کے مطابق دور اندیشی اور درگذر ان کی فطرت ہی نہیں تھی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بلوائیوں کی شورش کے موقعہ پر حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے انھیں برابر مشورے دیئے کہ وہ مدینہ منورہ سے ہٹ کر ینبوع وغیرہ کہیں چلے جائیں ورنہ شہادت حضرت عثمان رضؓ کا الزام ان کے ذمہ لگ جائے گا مگر انھوں نے ان تمام مشوروں

کو قطعاً قبول نہیں فرمایا۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ خلیفہ ہوتے ہی حضرت عثمان رضؓ کے مقرر کردہ گورنروں کو بیک قلم معزول کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ میں مصلحت پسند نہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

لہٰذا یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ لوگوں کی مخالفت کے اندیشے سے حضرت علی رضؓ نے فدک کا قبضہ حضرت فاطمہ رضؓ کی اولاد کو نہیں دلایا بلکہ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ خود بھی حضرت فاطمہ رضؓ کے دعوائے فدک کو صحیح نہیں سمجھتے تھے (بشرطیکہ حضرت فاطمہ رضؓ نے کوئی دعویٰ کیا بھی ہو)

حضرت فاطمہ رضؓ کی ناراضگی

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی عرض کیا تھا اس کا امکان ہے کہ صحیح صورتِ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی بنا پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے سلسلہ میں فدک وغیرہ کا مطالبہ فرمایا ہو لیکن ہمارے نزدیک اس کا امکان قطعاً نہیں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وضاحت کے بعد وہ ناراض ہو گئی ہوں اور حضرت صدیق اکبر رضؓ سے انھوں نے قطع تعلق کر لیا ہو اور اس سلسلہ میں جو تفصیلات روایات میں بیان کی گئی ہیں وہ سب متعصب راویوں کے اپنے دماغوں کی اختراع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضؓ کے اس دعوے اور حضرت صدیق اکبر رضؓ کے جواب کو تین صحابۂ کرام نے بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔
ان میں سے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہما کی روایتوں میں ان باتوں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت

ترمذی نے دو جگہ نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ہم مع سند کے پیش کئے دیتے ہیں۔

حدثنا محمد بن المثنیٰ ثنا ابو الولید ثنا حماد بن سلمة عن محمد بن عمرو عن ابی سلمة عن ابی هریرةؓ قال جاءت فاطمة الیٰ ابی بکر فقالت من یرثك قال اهلی و ولدی فقالت مالی لا ارث ابی فقال ابو بکر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول لا نورث ولکن اعول من کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یعوله وانفق علی من کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ینفق علیه (جامع ترمذی باب ماجاء فی ترکۃ النبی صلی اللہ علیه وسلم صـ۲۱۸ ج ۱ مطبوعہ قرآن محل کراچی مع اردو ترجمہ)

ہم سے محمد بن المثنیٰ نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم سے ابو الولید نے حدیث بیان کی، انہوں نے

کہا کہ ہم سے محمد بن عمرو نے ابوسلمہ سے انہوں
نے ابوہریرہ رضؓ سے حدیث بیان کی انہوں نے کہا
کہ حضرت فاطمہ رضؓ حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس آئیں
اور انہوں نے کہا کہ تمھارا وارث کون ہوگا ؟ ابوبکرؓ
نے کہا کہ میرے گھر والے اور میری اولاد تو حضرت
فاطمہ رضؓ نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ میں اپنے باپ کی وارث
نہیں ہوسکتی تو ابوبکر رضؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا
کوئی وارث نہیں ہوگا۔ البتہ میں ان کی خبرگیری کرتا
رہوں گا جن کی خبرگیری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کیا کرتے تھے اور میں ان پر خرچ کرتا رہوں گا جن پر
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے۔

بعینہ یہی حدیث انہی الفاظ کے ساتھ امام ترمذی نے
"شمائل ترمذی" باب ماجاء فی میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم شمائل ترمذی صـ ۹۴۸ ج ۲ مطبوعہ قرآن محل کراچی میں سند
کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ اس میں
آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضؓ نے صورت واقعہ
بیان فرمائی اور مسئلہ کی حقیقت واضح کی تو حضرت فاطمہ رضی
اللہ عنہا کی طرف سے اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی نقل
نہیں کیا گیا۔

دوسرے صحابی اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنے والے

حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ ہیں جن کی حدیث کو امام ابو داؤد نے باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بیان فرمایا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ۔

حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ نا محمد بن الفُضَیل عن الولید بن جُمَیع عن ابی الطفیل رضؓ قال جاءت فاطمۃ الی ابی بکر تطلب میراثھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فقال ابو بکر سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ اذا اطعم نبیًّا طعمۃ فھی للذی یقوم من بعدہ

(سنن ابو داؤد مع شرح عون المعبود ص۲۰۵ ج۲ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن فضیل نے ولید بن جُمیع سے، انہوں نے ابو الطفیل رضؓ سے حدیث بیان کی کہ فاطمہ رضؓ ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس آئیں وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی میراث مانگ رہی تھیں ۔

ابو الطفیل رضؓ کہتے ہیں کہ ابوبکر رضؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کسی نبی کو کچھ کھانے پینے کے لئے عطا فرماتے ہیں تو وہ اس کا حق ہے

جو اس کے بعد اس کا قائم مقام ہو۔

اس حدیث میں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ارشاد نبوی حضرت فاطمہ رضؓ کے سامنے نقل کیا ہے تو حضرت فاطمہ رضؓ کی طرف سے اس کے خلاف کسی مخالفانہ ردعمل کا اظہار نہیں ہوا اور انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔ نہ حضرت فاطمہ رضؓ ناراض ہوئیں اور نہ کسی ناگواری کا اظہار فرمایا۔

حضرت عائشہ رضؓ صحابہ میں سے تیسری شخصیت اس واقعہ کو نقل کرنے والی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ہیں حضرت عائشہ رضؓ کی روایات صحیح بخاری، مسلم سنن ابوداؤد اور تاریخ ابن جریر طبری میں نقل ہوئی ہیں۔

بخاری شریف میں یہ روایت چار جگہ آئی ہے (۱) جلد اول، کتاب الجہاد، باب فرض الخمس ص۴۳۵ بسند صالح بن ابی الاخضر عن الزہری۔ (۲) کتاب المناقب، باب مناقب قرابتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسند شعیب عن زہری ص۵۲۶ کتاب المغازی باب غزوۂ خیبر، بسند عقیل بن خالد عن زہری ص۶۰۹۔ (۴) کتاب الفرائض، باب لا نورث ما ترکناہ صدقۃ بسند معمر عن زہری ص۵۹۹ ج۲ سنن ابوداؤد میں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی روایت تین سندوں سے باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بیان ہوئی ہیں (۱) بسند عقیل بن خالد عن زہری۔

(۲) شعیب بن ابی حمزہ عن زہری (۳) صالح بن ابی الاخضر عن زہری۔ یہ سب ایک ہی باب میں ص۴۰۴-۴۰۵ ج ۲ میں مذکور ہیں، صحیح مسلم میں بھی یہی روایت تین سندوں سے موجود ہے (۱) معمر بن راشد عن زہری (۲) عقیل بن خالد عن زہری (۳) صالح بن ابی الاخضر عن زہری۔ تاریخ ابن جریر طبری میں بھی یہ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اس کی سند معمر بن راشد عن زہری ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت گیارہ سندوں سے ان کتابوں میں نقل ہوئی ہے اور گیارہ کی گیارہ سندوں کا مدار محض ابن شہاب زہری پر ہے سب راوی اس روایت کو انہی سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے چار مقامات پر صراحۃً حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ناراضگی بیان ہوئی ہے۔ باقی روایات میں اگرچہ صراحۃً ناراضگی کا بیان نہیں ہے مگر انداز بیان رضا مندی کا بھی نہیں ہے۔

محمد بن مسلم بن شہاب زہری

محمد بن مسلم بن شہاب زہری ائمہ حدیث میں بہت بڑے امام مانے جاتے ہیں لیکن میں فقہ القرآن میں بار بار متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ یہ حضرت شیعہ ہیں اور فقہ القرآن جلد چہارم میں میں نے اس پر تفصیلی بحث کی تھی چنانچہ شیعہ اسماء رجال کی کتابوں میں سے میں نے (۱) تتمۃ المنتہی ص۱۲۸ (۲) عین الغزال فی اسماء الرجال (۳) الکنی والالقاب

للشیخ عباس قمی (۴۰) امام محمد باقر بن الحاجی میر زین الدین موسوی الخوانساری کی کتاب روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات صفحہ ۶۸۹ ج ۱ کے حوالے دیئے تھے۔ روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات کا طویل عربی اقتباس بھی میں نے پیش کر دیا تھا۔ ان سب حضرات نے ان کے شیعہ ہونے کی تصریحات فرمائی ہیں فی الحال ہم یہاں شیخ عباس قمی کی کتاب "تتمۃ المنتہی" کا عربی اقتباس مزید پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی ان کے شیعہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

واختلفت کلمات علمائنا فی مدحه وقدحه وقد فصّل صاحب الروضات فقال انه کان فی بدء امره من جملة علماء اهل السنة وندماء حزب الشیطان ثم ان علیه وادراکه ادرکاه وارشداه الی الحق المبین فصیراه فی آخر عمره من الراجعین الی الامام زین العابدین علیه السلام وفی زمرة المستفیدین من برکات انفاسه الشریفة ثم ذکر شواهد قوله ولیس له مقام ذکره فراجع ثمه

(تتمة المنتهی صفحہ ۴۸)

ابن شہاب زہری کی مدح اور قدح میں ہمارے

علمائے شیعہ کے اقوال مختلف ہیں۔ صاحب روضات نے تفصیل کرتے ہوئے اپنی کتاب روضات میں لکھا ہے کہ وہ ابتداء میں تو سنی علماء میں سے تھا اور شیطانی پارٹی کے ہم نشینوں میں سے تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے علم و فہم نے اسے کھلے ہوئے حق کی راہ نمائی کی اور زندگی کے آخری لمحوں میں اسے ان لوگوں میں سے بنا دیا جو کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی طرف رجوع کرنے والے اور آپ کی خدمت شریف سے فیض حاصل کرنے والے تھے۔ اس کے بعد اپنے اس قول کے شواہد بیان کئے ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ مقام نہیں ہے لہٰذا ان شواہد کو ان کی کتاب میں دیکھ لیا جائے۔

شیخ عباس قمی علمائے شیعہ میں بہت مشہور اور مستند عالم تسلیم کئے جاتے ہیں جن کا علمائے اسماء رجال میں بڑا مرتبہ ہے اور ان کی کتاب "تتمۃ المنتہیٰ" شیعہ اسمائے رجال میں بہت مشہور اور مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ شیخ عباس قمی نے اسی "روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات" کے حوالہ سے بات کی جس کا اقتباس میں نے فقہ القرآن جلد چہارم ص ۱۳۱-۱۳۲ پر پیش کیا تھا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شیعہ اسماء الرجال میں "روضات الجنات" کی مصنف

امام محمد باقر ابن الحاجی میر زین الدین موسوی الخوانساری کا کیا مرتبہ اور مقام ہے۔

الکافی شیعہ امامیہ کی مستند ترین کتاب ہے

علاوہ ازیں محمد بن مسلم بن شہاب زہری، اصول کافی اور فروع کافی مصنفہ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی کے رُواۃ میں سے ہیں جو شیعی فن حدیث کے اصول اربعہ میں سے ہے اس کا مرتبہ شیعہ کتب حدیث میں اس سے کہیں زیادہ ہے جو سنیوں میں بخاری کا ہے کیونکہ یہ کتاب بارھویں شیعہ امام مہدی علیہ السلام کی غیبت صغری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے اور انہوں نے اس پر تنقید نہیں فرمائی بلکہ بعض روایات کی رو سے ان کی خدمت اقدس میں پیش ہو چکی ہے۔ آپ نے اس کتاب کو اول سے آخر تک دیکھا ہے پھر اس کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے۔ آپ کے الفاظ یہ بتائے جاتے ہیں کہ ھذا کافٍ لشیعتنا۔ بہر حال بارھویں امام کے زمانہ میں اس کتاب کا مرتب ہونا اور امام یا ان کے نمائندوں کی طرف سے اس پر تنقید نہ ہونا اس کی اہمیت واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر کوئی کتاب حضور اکرم کے ارشادات کے متعلق آپ کی حیات طیبہ میں آپ کا کوئی معتقد لکھتا اور وہ ہمارے پاس محفوظ ہوتی تو جو مقام اس کتاب کو حاصل ہوتا وہی حیثیت شیعہ حضرات کے نزدیک الکافی

کی ہے۔

اس وقت میرے سامنے کافی کا وہ نسخہ ہے جو تہران سے چھپا ہوا ہے۔ سب سے پہلے ورق کی داہنی جانب ترجمۃ المصنف لکھا ہے جس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ "الذی سماہ حجۃ العصر صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ بالکافی" (یہ وہ کتاب ہے جس کو امام مہدی علیہ السلام نے کافی کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ نیز کتاب کافی کے متعلق شیعہ حضرات کے شہید اول فرماتے ہیں

"کتاب الکافی فی الحدیث الذی لم یعمل مثلہ فی الامامیۃ"

(علم حدیث میں کتاب کافی وہ کتاب ہے کہ فرقہ امامیہ میں اس کی مثل کوئی کتاب نہیں بنائی گئی۔

نیز شہید ثانی کے پوتے شیخ علی اپنی کتاب درمنظوم میں فرماتے ہیں کہ

"فلعمری لم ینسج ناسج علی منوالہ
ومنہ یعلم قدر منزلتہ وجلالۃ حالہ"

(مجھے میری زندگی کی قسم کسی کاریگر نے اس انداز پر کپڑا نہیں بنا یعنی کسی محدث نے اس طرح کی کتاب نہیں لکھی اور اس کتاب سے مصنّف کی منزلت کی مقدار اور شان کی بلندی کا پتہ چلتا ہے۔

نیز کتاب روضۃ المتقین شرح الفقیہ کے مصنف نے اصول کافی پر

محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سب مصنفین میں سے ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی پر زیادہ اعتماد ہے۔ اس لئے کہ کلینی نے اپنی کتاب الکافی بیس۲۰ برس میں تیار کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی لمبی مدّت زیادہ احتیاط کی وجہ سے صرف ہوئی ہے۔ جس قدر احتیاط کلینی سے صادر ہوئی ہے صدوق اور شیخ طوسی سے نہیں ہوئی۔ ان کتابوں میں سہو پایا گیا ہے مگر کلینی کی کتاب کافی میں سہو نہیں پایا گیا۔"

نیز کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کی فارسی شرح کے مقدمہ میں گیارہویں فائدے کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"وہم چنیں احادیث مرسلۂ محمد بن یعقوب کلینی و محمد بن بابویہ قمی بلکہ جمیع احادیث ایشان کہ در کافی و من لا یحضرہٗ است ہمہ را صحیح می تواں خواند زیراکہ شہادت ایں دو شیخ بزرگوار کمتر از شہادات اصحاب رجال نیست یقینا بلکہ بہتر است۔"

(اسی طرح کلینی اور ابن بابویہ قمی کی مرسلہ حدیثیں جو کہ کتاب کافی اور من لا یحضرہ الفقیہ میں ہیں سب کو صحیح لکھنا چاہئے اسلئے کہ ان دو بزرگوں کی گواہی علمائے رجال کی گواہی سے کم نہیں بلکہ بہتر ہی ہے)

(مندرجہ بالا چاروں اقوال میں نے شیعہ کتاب عین الغزال فی فہرس اسماء الرجال ص۲ سے نقل کئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب شیعہ امامیہ کے نزدیک اس قدر صحیح اور مستند ہو اور بارہویں شیعہ امام مہدی علیہ السلام کی طرف سے توثیق شدہ ہو اس کے راویوں میں بقول شیخ ابو علی رجالی یا بقول صاحب الروضات کوئی راوی علمائے اہل السنت اور ندمائے حزب الشیطان میں سے تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اصول کافی اور فروع کافی میں بیشمار حدیثیں ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی نے محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہی سے نقل فرمائی ہیں۔ بطور مشتے نمونہ از خروارے چند احادیث کا حوالہ پیش خدمت ہے جو ہم احمد شاہ بخاری کی کتاب "تحقیق فدک" سے پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں "باب الدنیا والزہد فیہا۔ اصول کافی صـــ۱۸۵ "باب الاستغناً عن الناس" اصول کافی صـــ۱۸۹۔ "باب العصبیۃ" اصول کافی صـــ۲۲۳۔ "باب حب الدنیا" اصول کافی صـــ۲۲۵۔ "باب الطمع" اصول کافی صـــ۲۲۶۔ "باب الکذب" اصول کافی صـــ۲۲۹۔ "باب ذی اللسانین" اصول کافی صـــ۲۳۰۔ "باب فضل القرآن" اصول کافی صـــ۳۸۵۔ اور "کتاب النکاح باب النوادر" فروع کافی صـــ۲۴۷ ج۲۔ "باب فی القاتل یرید التوبۃ" فروع کافی صـــ۱۶۳ ج۳۔ یقیناً اگر مزید تلاش کیا جائے تو دیگر ابواب میں بھی ان کی روایات مل جائیں گی۔

فقہ القرآن جلد چہارم میں بریلوی مکتب فکر کے مشہور عالم مولانا قمر الدین سیالوی مرحوم کی کتاب "مذہب شیعہ"

سے ان کی یہ تحقیق میں نقل کر چکا ہوں کہ الکافی میں محمد بن شہاب زہری کی سیکڑوں روایات ہیں غرض جو شخصیت اصول کافی اور فروع کافی میں اس کثرت سے روایات نقل کر رہی ہو اس کے شیعہ ہونے میں کیا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو روایتیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بہ سند ابن شہاب زہری بیان ہوئی ہیں خواہ وہ صحیح بخاری میں، صحیح مسلم میں، سنن ابو داؤد میں یا تاریخ ابن جریر طبری میں ہوں وہ محدثین کے مسلّمہ اصول کے مطابق قابل قبول نہیں ہیں۔ وہ درحقیقت شیعی پروپیگنڈے پر مبنی اور صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی دشمنی اور عداوت کے زیر اثر انھیں بدنام کرنے کی ایک کوشش ہیں۔

حقیقت واقعہ

حقیقت یہ ہے کہ اموال فئے یعنی اراضیٔ فدک اور اراضیٔ خیبر نیز عوالی مدینہ کے کچھ باغات مال فئے ہونے کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی ملکیت اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی تحویل میں تھے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغت میں ابوبکر جوہری سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ایک روایت اس طرح ہے۔

قالت فاطمۃ ان ام ایمن تشھد ان رسول اللہ
اعطانی فدک فقال لہا یا بنت رسول اللہ
واللہ ما خلق اللہ خلقا احب الی من رسول اللہ

ابيك ولوددت ان السماء تقع على الارض يوم مامات ابوك الى ان قال ان هذا المال لم يكن للنبيّ، انما كان من اموال المسلمين يحمل به الرجل و ينفقه فى سبيل الله فلما توفى رسول الله وليته كما كان يوليه قالت والله لا كلمتك ابدا قال لا هجرتك ابداً قالت والله لا دعون الله عليك قال والله لا دعون الله لكِ فلما حضرتها الوفاة اوصت ان لا يصلى عليها فدفنت ليلا انتهى على مانقله ابن ابى الحديد

(بحواله آیات بینات صـ ۲۹۷/ ج۲ مؤلفہ نواب محسن الملک مرحوم)

حضرت فاطمہ رضی نے (صدیق اکبر رضی سے) کہا کہ ام ایمن اِسی بات کی گواہی دیتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک مجھے عطا فرمادیا تھا تو ابو بکر صدیق رضی نے کہا اے رسول اللہ کی دختر نیک اختر! اللہ کی قسم اللہ نے کسی مخلوق کو پیدا نہیں کیا جو آپ کے والد، رسول اللہ سے مجھے زیادہ محبوب ہو اور جس دن آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا اس دن میری تمنا یہ تھی کہ کاش آسمان زمین پر گر پڑتا (وغیرہ وغیرہ) یہاں تک کہ انھوں نے کہا کہ یہ مال نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا تھا ہی نہیں۔ یہ تو مسلمانوں

کا مال تھا۔ اس کے ذریعہ سے آپ لوگوں کے
لیئے (جہاد وغیرہ میں) سواریوں کا انتظام فرماتے
تھے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے ،
پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
ہوگئی تو وہ میری تحویل میں آگیا جیسا کہ پہلے رسول
اللہ کی تحویل میں تھا۔ حضرت فاطمہ رضؓ نے فرمایا
اللہ کی قسم میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔
حضرت ابو بکر رضؓ نے کہا کہ لیکن میں تم سے کبھی قطع
تعلق نہیں کروں گا۔ حضرت فاطمہ رضؓ نے کہا۔ اللہ
کی قسم میں تمھارے لیئے بد دعا کرونگی ، حضرت
صدیق رضؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم لیکن میں تمھارے لیئے
دعائے خیر ہی کروں گا تو جب حضرت فاطمہ رضؓ کی
وفات کا وقت آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ
ابو بکر رضؓ ان کی نماز نہ پڑھیں ، چنانچہ انھیں رات ہی
کو دفن کر دیا گیا۔ ابن ابی الحدید نے جو کچھ نقل کیا تھا وہ
ختم ہوا۔ بحوالہ آیات بینات ص ۲۹۷ ج ۲ مؤلفہ نواب محسن الملک مرحوم

اس روایت میں ان تمام باتوں سے ہمیں غرض نہیں جو
اس میں بیان ہوئی ہیں۔ ہمیں صرف خط کشیدہ الفاظ کیطرف
توجہ دلانا ہے یعنی حضرت صدیق اکبر رضؓ کے ان الفاظ کی طرف
کہ : "یہ مال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا ہی نہیں - یہ
تو مسلمانوں کا مال تھا۔ اس کے ذریعہ سے آپ لوگوں کے لیئے

(جہاد وغیرہ میں) سواریوں کا انتظام فرماتے تھے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو وہ میری تحویل میں آ گیا جیسا کہ پہلے رسول اللہ کی تحویل میں تھا۔" فدک اور خیبر کی زمینیں مال فئے تھیں۔ ان کا حکم یہی ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ حشر کی آیات سے واضح کیا تھا۔ یہ شیعی روایت ہے۔ یہی کچھ سنی روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً امام زہری حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب روایت میں یہ الفاظ لائے ہیں۔

ان فاطمة سألت ابا بکر ان یقسم لها میراثها مما ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم مما افاء اللہ علیہ فقال لها ابو بکر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نورث مما ترکنا صدقة فغضبت فهجرته فلم تزل بذلک حتی توفیت وعاشت بعده صلی اللہ علیہ وسلم ستة اشهر الا لیالی وکانت تسأله ان یقسم لها نصیبها مما افاء اللہ علی رسوله من خیبر وفدک ومن صدقته بالمدینة فقال لها ابو بکر لست بالذی اقسم من ذلک شیئا ولست تارکا شیئا کان صلی اللہ علیہ وسلم یعمل به

فیھا الا عملته فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ ثم فعل ذلك عمر فاما صدقته بالمدینة فدفعها عمر الی علی وعباس وامسك خیبر وفدك وقال هما صدقه رسول الله صلی الله علیه وسلم کانت لحقوقه التی تعروه ونوائبه وامرهما الی من ولی الامر فهما علی ذلك الی الیوم وفی روایة: لا نورث ما ترکنا صدقة وانما یأکل آل محمد فی هذا المال یعنی مال الله لیس لهم ان یزیدوا علی المأکل۔

لمسلم وابی داؤد والنسائی

(بحوالہ جمع الفوائد ص ۲۷۳/۱ج)

حضرت فاطمہ رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ سے سوال کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ سے ان کی میراث تقسیم کردی جائے یعنی اس ترکہ سے جو حق تعالےٰ نے بطور فیئ کے آپ کو عطا فرمایا تھا تو ابوبکر رضؓ نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضؓ ناراض ہوگئیں اور ابوبکر صدیق رضؓ

سے قطع تعلق کر لیا۔ وہ اس پر قائم رہیں حتی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ کچھ دن کم چھ مہینے زندہ رہیں اور ان کا سوال یہ تھا کہ جو حق تعالیٰ نے فدک اور خیبر سے بطور فئے کے آپؐ کو عطا فرمایا تھا اور جو مدینہ منورہ میں آپ کا صدقہ تھا اس سے ان کا حصہ تقسیم کر دیا جائے تو حضرت ابو بکر رضؓ نے حضرت فاطمہ رضؓ سے کہا کہ میں اس میں سے کسی چیز کو بھی تقسیم نہیں کر سکتا اور جیسا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کیا کرتے تھے اس میں سے کسی بات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اسی کے مطابق عمل کروں گا۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے اس میں سے کسی بات کو بھی چھوڑ دیا تو میں جادۂ حق سے ہٹ جاؤں گا۔ پھر اس کے بعد حضرت عمر رضؓ نے بھی (اپنے عہد میں) اس پر عمل کیا۔ رہا آپؐ کا وہ صدقہ جو مدینہ منورہ میں تھا تو اسے حضرت عمر رضؓ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو دیدیا اور خیبر اور فدک کی زمینوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہیں جو ان حقوق کے لئے تھیں جو آپ کو پیش آتے تھے اور آپ کی ضروریات کے لئے تھیں۔ اور ان کا معاملہ

اس شخص کے ہاتھ میں رہے گا جو حکومت کا والی ہوگا۔ چنانچہ دونوں آج تک اسی صورت پر چلی آتی ہیں۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا۔ ہماری وراثت نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ البتہ آل محمد (گھر والے) اس مال میں سے یعنی اللہ کے مال میں سے (ازواج مطہرات اقربا) بقدر کھانے کے لے سکتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے کھانے سے زیادہ لیں۔

نیز حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کا حوالہ پہلے بھی آچکا ہے کہ

جاءت فاطمة تطلب ميراثها من ابيها الى ابى بكر فقال لها سمعت رسول صلى الله عليه وسلم يقول ان الله تعالى اذا اطعم نبيا طعمة فهو للذى يقوم من بعده لابى داؤد (جمع الفوائد ص ۲۷۳/17)

حضرت فاطمہ رضؓ اپنی میراث طلب کرنے لئے ابو بکر صدیق رضؓ کے پاس آئیں تو انہوں نے حضرت فاطمہ رضؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی نبی کو کچھ کھانے کے لئے عطا فرماتے ہیں تو اس کا

متولی وہ شخص ہوتا ہے جو نبی کے بعد اس کا قائم مقام ہو۔

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوسری روایت ہے۔

ان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین توفی اردن ان یبعثن عثمان الی ابی بکر یسئلنہ میراثھن فقالت عائشۃ الیس قد قال صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ وفی روایۃ: قلت الا تتقین اللہ الم تسمعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ وانما ھذا المال لآل محمد لنائبتھم وضیفھم فاذا مت فھو الی ولی الامر من بعدی

(لمالک والشیخین وابی داؤد)

(بحوالہ جمع الفوائد ص۲۷۳ ج ۱)

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو حضور اکرم کی ازواج مطہرات نے حضرت ابو بکر صدیق رض کی خدمت میں حضرات عثمان رض کو بھیجنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ آپ سے اپنی میراث کا سوال کریں تو حضرت عائشہ رض نے ان سے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ ہماری میراث تقسیم نہیں ہو گی، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ

صدقہ ہوگا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ
میں نے کہا: کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتیں کیا تم نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے
نہیں سنا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا جو کچھ ہم
چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوگا؟ اور یہ مال آل محمدؐ
کے لئے صرف اس حد تک ہے کہ ان کی ضروریات
زندگی کے لئے اور ان کے مہمانوں کے لئے ہے
اور جب میں مر جاؤں تو اس کی تولیت اس کے ہاتھ
میں ہوگی جو میرے بعد حکومت کا والی ہوگا۔

ایک اور روایت حضرت عمر بن الحارث الخزاعی سے
ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

ما ترك النبی صلی اللہ علیہ وسلم دینارا
ولا درهما ولا عبدا ولا امة ولا شیئا
الا بغلته البیضاء التی کان یرکبها وسلاحه
وارضا جعلها لابن السبیل صدقة

(بخاری ونسائی۔ بحوالہ جمع الفوائد ص۲۷۳ ج۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ نے نہ دینار و درہم چھوڑا
اور نہ کوئی غلام اور باندی چھوڑا اور نہ اور کوئی
چیز چھوڑی البتہ ایک اپنا وہ سفید خچر چھوڑا تھا
جس پر آپ سوار ہوا کرتے تھے اور اپنے ہتھیار
چھوڑے اور وہ زمین چھوڑی تھی جسے مسافروں

کے لیے آپ نے وقف فرما دیا تھا۔

نیز حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

ماترك النبی صلی اللہ علیہ وسلم من شیئ الا ما بین الدفتین۔

(بخاری بحوالہ جمع الفوائد ص۲۷۳ ج۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں چھوڑا بجز اس صحیفۂ قرآنی کے جو دو دفتین کے درمیان محفوظ ہے۔

ان تمام روایات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اموال فئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں تھے بلکہ معاشرہ یا سوسائٹی یا بقول دیگر ریاست کی ملکیت تھے اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھے ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالے عنہا کو یہ غلط فہمی ہو کہ وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت تھے اور اسی غلط فہمی کی بناء پر انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اپنا وراثتی حصہ طلب فرمایا ہو۔ لیکن جب حضرت صدیق اکبر رض نے مسئلہ کی صحیح صورت واضح فرمادی تو آپ اپنے مطالبہ سے دست بردار ہو گئیں نہ صرف دست بردار ہو گئیں بلکہ اس پر راضی ہو گئیں۔ شیعہ عالم ابن میثم بحرانی کی

شرح نہج البلاغۃ (ص ۵۴۳) سے ہم نے جو گذشتہ صفحات میں روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ

فرضیت بذالک واخذت العھد علیہ بہ

تو اس پر حضرت فاطمہ رضؓ راضی ہوگئیں اور انھوں نے صدیق اکبر رضؓ سے اس پر اس بات کا عہد لیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کی روایات سب کی سب متعصب راوی حضرات کی اپنی اختراع ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اس کا امکان ہی نہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا جائے اور وہ اس پر ناراضگی کا اظہار فرمائیں حضرت فاطمہ رضؓ کی تو بڑی شان ہے۔ یہ بات تو ایک معمولی مسلمان سے بھی ممکن نہیں ہے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اموال فئے کے سلسلہ میں سورۂ حشر میں حق تعالےٰ نے اموال فئے کے تو مصارف پوری وضاحت اور تفصیل سے بیان فرما دیئے ہیں۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وضاحت سے صاف صاف بیان فرما دیا ہے جیسا کہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ

یاایھا الناس انہ لیس من ھذا الفیئ شیئ ولاھذا اورفع اصبعیہ الا الخمس والخمس

مردود علیکم

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۶۴ تا ۶۵ ج ۳)

یہ روایت دو سندوں سے پوری تفصیل کے ساتھ ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں۔

کیا حضور اکرم کے پاس فیئ کے علاوہ کچھ نہیں تھا

یہ بحث تو اموال فیئ کے متعلق تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن شہروں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کرنے کے بعد عنوۃً فتح کیا تھا مثلاً خیبر اور بنو قریظہ اور بنو نضیر کی اراضی وغیرہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین صحابہ میں تقسیم فرما دیا تھا اور افواج مسلمین کے کمانڈر ہونے کی حیثیت سے ان زمینوں میں خمس کے علاوہ محض ایک مجاہد کی حیثیت سے آپ کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ وہ زمینیں یقیناً آپ کی ذاتی ملکیت تھیں۔ اور ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور اولاد اور دیگر اعزا کا حصہ ہونا چاہئے تھا۔ اور یقیناً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انہی زمینوں سے اپنی وراثت کا مطالبہ کیا ہوگا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اراضی یا جو اموال آپکی ذاتی ملکیت تھے ان میں بھی وراثت جاری نہیں کی گئی اور ایک حدیث نبوی کی وجہ سے جو زیادہ سے زیادہ خبر واحد تھی (خبر متواتر نہیں تھی) کتاب اللہ کے ایک عام حکم میں جو وراثت کے سلسلہ میں وارد ہوا تھا اور جس میں تمام

امت کے علاوہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے تخصیص کیسے کر لی گئی۔ حالانکہ قرآن کریم کے عام حکم کو خبر واحد سے خاص نہیں کیا جا سکتا اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت علامہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رح فرماتے ہیں۔

اعلم انه لاخلاف بين المسلمين ان قوله تعالىٰ يوصيكم الله فى اولادكم وما عطف عليه من قسمة الميراث خاص فى بعض المذكورين دون بعض فبعض ذلك متفق عليه وبعضه مختلف فيه فما اتفق عليه ان الكافر لايرث المسلم وان العبد لايرث وان قاتل العمد لا يرث واختلف فى ميراث المسلم من الكافر وميراث المرتد۔ فاما ميراث المسلم فان الائمة من الصحابة متفقون على نفى التوارث بينهما وهوقول عامة التابعين وفقهاء الامصار .. ..

.... واذا ثبت ان اٰية المواريث خاصة بالاتفاق واخبار الاحاد مقبولة فى تخصيص مثلها،

انداحض بذلك ادعاء الشيعة عمومها

الميراث من النبي صلى الله عليه وسلم
بناء على القول بدخوله صلى الله عليه وسلم
في العمومات الواردة على لسانه صلى الله
عليه وسلم المتناولة له لغةً وطعنوا
بذلك على ابي بكر الصديق رضي الله عنه
حيث لم يورث الزهراء رضي الله عنها
من تركة ابيها صلى الله عليه وسلم
وقالوا ان حديث نحن معاشر الانبياء لا
نورث لم يروه غيره وبتسليم انه
رواه غيره ايضا فهو غير متواتر بل
آحاد ولا يجوز تخصيص الكتاب بخبر
الآحاد بدليل ان عمر بن الخطاب رضي
الله عنه رد خبر فاطمة بنت قيس انه
صلى الله عليه وسلم لم يجعل لها سكنى
ولا نفقة لما كان مخصّصا لقوله تعالى
اسكنوهن فقال كيف نترك كتاب ربنا
وسنة نبينا صلى الله عليه وسلم بقول
امرأة فلو جاز تخصيص الكتاب بخبر الآحاد
لخصّص به ولم يرده وايضا العام وهو
الكتاب قطعي والخاص وهو خبر الآحاد
ظني فيلزم ترك القطعي بالظني الخ.

(احکام القرآن ص۱۰۴ تا ۱۰۶ ج ۲ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریر روڈ - کراچی)

معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں میں اس میں اختلاف نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد یوصیکم اللہ فی اولادکم اور میراث کی تقسیم میں جن کا اس پر عطف کیا گیا ہے وہ بعض مذکورین کے بارے میں دوسرے بعض کے برخلاف خاص ہے۔ تو اس سے بعض تو متفق علیہ ہیں اور بعض مختلف فیہ ہیں۔ چنانچہ متفق علیہ مسائل میں سے یہ مسائل ہیں کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اور غلام وارث نہیں ہو سکتا اور عمداً قتل کرنے والا وارث نہیں ہو سکتا اور اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان، کافر کا وارث ہو سکتا ہے اور مرتد کی میراث میں بھی اختلاف ہے۔ جہاں تک مسلمان کی میراث کا تعلق ہے تو تمام ائمہ صحابہ ان کے درمیان وراثت نہ چلنے پر متفق ہیں اور عام تابعین اور فقہائے امصار کا یہی قول ہے ....

.... اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مواریث کی آیت بالاتفاق مخصوص شدہ ہے اور اخبار آحاد ان جیسی مخصوص شدہ آیات کو مزید مخصوص کر لینے میں مقبول ہوتی ہیں تو اس سے شیعوں کا یہ دعویٰ

باطل ہو گیا کہ آیت کے عموم میں حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی اپنی میراث بھی شامل تھی۔ کیونکہ
علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو عمومات وارد
ہوں اور وہ لغت کے اعتبار سے آپ کو بھی شامل
ہوتے ہوں تو ان عمومات میں حضورؐ بھی داخل
ہوتے ہیں اور اس وجہ سے انھوں نے حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن کیا ہے کہ انہوں
نے حضرت فاطمہ زہراء کو ان کے والد صلے اللہ
علیہ وسلم کے ترکہ سے وراثت نہیں دی اور وہ
کہتے ہیں کہ نحن معاشر الانبیاء لانورث
کو سوائے ابوبکر صدیق رضؓ کے کسی اور نے بیان نہیں
کیا اور اگر مان لیا جائے کہ اسے دوسروں نے بھی
بیان کیا ہے وہ تب بھی غیر متواتر ہے بلکہ خبر واحد
ہے اور اخبار احاد سے کتاب اللہ کی تخصیص جائز
نہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت
فاطمہ بنت قیس رضؓ کی روایت رد فرما دی تھی کہ حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے عدت میں انھیں نفقہ اور مکان
نہیں دلوایا تھا۔ کیونکہ اس سے حق تعالےٰ کے قول
اسکنوھن کی تخصیص لازم آتی ہے۔ حضرت عمر رضؓ
نے کہا تھا کہ ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی

سنت کو ایک عورت کے کہنے سے کیسے چھوڑ دیں۔
اگر خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص جائز ہوتی تو حضرت عمرؓ تخصیص کر دیتے اور فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو رد نہ فرماتے۔ علاوہ ازیں عام اور وہ کتاب اللہ ہے قطعی ہوتا ہے اور خاص اور وہ خبر واحد ہے ظنی ہوتا ہے۔ اس سے ظنی کی وجہ سے قطعی کو ترک کر دینا بھی لازم آتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میراث مخصوص شدہ ہے۔ چنانچہ ورثاء میں سے کچھ وارث، بالاتفاق محروم الارث ہوتے ہیں اور کچھ میں اختلاف ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک وہ محروم الارث ہوتے ہیں اور بعض ائمہ کے نزدیک محروم الارث نہیں ہوتے۔ جو بالاتفاق محروم الارث ہوتے ہیں ان میں سے مثلاً ایک تو یہ ہے کہ کافر وارث مسلمان مورث کے ترکہ سے حصہ نہیں پا سکتا۔ ایسے ہی غلام اپنے آزاد باپ کے ترکہ سے حصہ نہیں پا سکتا۔

نیز اگر بیٹے نے اپنے باپ کو عمداً قتل کر دیا ہو تو قاتل اپنے باپ کے ترکہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ بعض مسائل میں اختلاف ہے۔ مثلاً اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان وارث اپنے کافر مورث کے ترکہ سے حصہ پائے گا یا نہیں۔ نیز مرتد کی میراث میں سے اس کے مسلمان وارثوں کو حصہ ملے گا

یا نہیں۔ بہر حال آیت میراث چونکہ پہلے ہی مخصوص منہ البعض ہے اس لئے اس کا عموم اب باقی نہیں رہا اور اصول فقہ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو عام، مخصوص منہ البعض ہو، وہ قطعی نہیں ہوتا اس کی مزید تخصیص خبر واحد اور قیاس وغیرہ سے کی جا سکتی ہے۔ لہذا اگرچہ حدیث "نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ" خبر واحد ہے۔ لیکن چونکہ آیت میراث پہلے ہی مخصوص منہ البعض ہے اس لئے خبر واحد سے اس کی تخصیص مزید جائز ہے۔ نیز چونکہ اس کی تخصیص پہلے ہی ہو چکی ہے اس لئے اس کا عموم بھی قطعی نہیں رہا۔

ہمارا موقف ہمیں افسوس ہے کہ باوجودیکہ ہمیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہم ان کے اس فیصلے کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ترکہ سے آپ کے ورثار کو جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، چچا حضرت عباس رضؓ اور صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں کوئی حصہ نہیں ملنا چاہئے تھا، لیکن ہمارے متأخر علمائے کرام نے اسکی جو توجیہ فرمائی ہے۔ ہمیں اس سے اختلاف ہے۔

ہمارے خیال میں متقدمین کا یہ نقطۂ نظر صحیح ہے کہ

یہ مسئلہ خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص، عام تخصیص کا ہے ہی نہیں۔ یہ مسئلہ وصیت کا ہے حضور اکرم صلی اللہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جو کچھ میں چھوڑ جاؤں وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہوگا۔ اور اس وصیت کے گواہ، ایک دو نہیں، متعدد صحابۂ کرام موجود تھے۔ جبکہ وصیت کے ثبوت کیلئے شرعاً صرف دو گواہ ضروری ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وصیت فرمائی اور متعدد صحابہ رضؓ کی شہادت سے وصیت ثابت ہوگئی۔ خود حضرت صدیق اکبر رضؓ بھی اس کے شاہد تھے، لہٰذا انہوں نے آپ کی اس وصیت کو نافذ فرمادیا۔

متأخرین کا یہ نقطۂ نظر کہ کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد سے بھی ہوسکتی ہے احناف کے اصول کی رو سے بھی غلط ہے۔ کیونکہ حنفیہ کا یہ اصول ہے کہ قرآن کریم کے عام کو خبر واحد سے خاص نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے نزدیک حنفیہ کا یہ اصول عظمت قرآنی کے عین مطابق ہے حضرت علامہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے صلوٰۃ میں سورۂ فاتحہ کی قرأت فرض نہ ہونے پر اپنی مایۂ ناز تصنیف اعلاء السنن میں فرمایا ہے کہ

واحتجوا علی رکنیۃ الفاتحۃ ایضا بما رواہ اصحاب الصحاح والامام احمد کما فی العزیزی (۲/ ۴۳۸) عن عبادۃ ابن الصامت

رضی الله عنه مرفوعًا: "لاصلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب" آه وقال البخاری فی جزء القراءة (ص ٣) وتواتر الخبر عن رسول الله صلی الله عليه وسلم" لاصلوة الا بقراءة ام القرآن" وجعله فی خلق افعال العباد "ص - ٩١) مستفيضًا عند اهل الحجاز واهل العراق واهل الشام واهل الامصار اه واستدلال اصحابنا علی مسلكهم وهو عدم فرضية خصوص الفاتحة بقوله تعالیٰ "فاقرؤا ما تيسر من القرآن" فان لفظة "ما" عامة شاملة لكل ما تيسر سواء كان فاتحة الكتاب اوغيرها وخبر الواحد لايصلح مخصصا لعام الكتاب علی ما تقرر فی اصولنا انه قطعی فيما يتناوله والظنی لا يعارض القطعی - ولو قال الخصم ان لفظه "ما" ليست بعامة علی انها ليست محكمة فی العموم بل ظاهرة فيه ، نقول : فلفظ الاية مطلق عن قيد الخصوص فاتحة كانت اوغيرها فالخبر لا يصلح مقيد المطلق الكتاب لانه زيادة علی القطعی بالظنی الخ اعلاء

السنن صہ ۲۰۲ ج ۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

فاتحہ کی رکنیت پر مخالفین نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے اصحاب صحاح اور امام احمدؒ نے، جیساکہ تفسیر عزیزی میں ہے حضرت عبادہ ابن الصامت سے بیان کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی اس کی صلوۃ نہیں ہوئی الخ اور امام بخاری نے جزء القراءت (صہ ۴) میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث متواتر ہے کہ بغیر امّ القرآن (فاتحہ) پڑھے نماز نہیں ہوتی اور اپنے رسالے "خلق افعال العباد" صہ ۹۱ میں امام بخاری نے اسے اہل حجاز، اہل عراق، اہل شام اور اہل امصار کے نزدیک مشہور قرار دیا ہے الخ اور ہمارے اصحاب یعنی حنفیہ نے اپنے اس مسلک پر کہ خصوصیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھنا ہی فرض نہیں ہے حق تعالےٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے "فاقرؤا ما تیسر من القرآن" (قرآن سے جو کچھ آسانی سے ہو سکے پڑھ لو) تو اس آیت میں "ما" کا لفظ عام ہے جو ہر اس قرأت کو شامل ہے

جو آسانی سے ہو سکے وہ سورۂ فاتحہ بھی ہو سکتی ہے اور کوئی دوسری آیت بھی۔ اور خبر واحد اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ کتاب اللہ کے عام کو خاص کر سکے جیساکہ ہمارے اصول میں طے پا چکا ہے کہ عام ان تمام افراد کے لئے قطعی ہوتا ہے جنھیں وہ شامل ہو۔ اور ظنی، قطعی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر مخالفین یہ کہیں کہ لفظ "ما" عام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عموم میں محکم نہیں ہے بلکہ عموم میں ظاہر ہے تو ہم جواب میں کہیں گے کہ آیت کریمہ کے الفاظ خصوصیت کی قید سے مطلق ہیں۔ وہ سورۂ فاتحہ بھی ہو سکتی ہے اور غیر فاتحہ بھی ہو سکتی ہے۔ تو یہ حدیث اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ کتاب اللہ کے مطلق حکم کو مقید کر سکے کیونکہ ایسا کرنے سے، ظنی سے قطعی پر زیادتی کرنا لازم آتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قرأت فاتحہ کی رکنیت کے خلاف جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ حنفی اصول کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا معترضین کے جواب میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کا یہ فرمانا کہ "حدیث "لانورث" سے آیۂ وراثت کی تخصیص ہو گئی، ہمارے حلق سے نہیں اتر سکا۔ رہی حضرت مولانا کی توجیہ کہ "عام مخصوص منہ البعض چونکہ قطعی نہیں ہوتا اس لئے خبر واحد سے اس کی تخصیص ہو سکتی

ہے تو اس توجیہ سے اگرچہ معترض کا منہ بند ہو جائیگا (کیونکہ وہ خود اس اصول کا قائل ہے بلکہ وہ تو خبر واحد سے بھی کتاب اللہ کی تخصیص کا قائل ہے۔ وہ مخصوص منہ البعض ہو یا نہ ہو) لیکن اس سے اصول احناف کی عمارت متزلزل ہو جائے گی۔ کیونکہ عام مخصوص منہ البعض کے ظنی ہونے کا اگر یہ اصول مان لیا جائے تو قرآن کریم کا کوئی حکم بھی قطعی نہیں رہتا۔ کیونکہ بقول امام شافعی رحمہ کے ما من عام الاخص منہ البعض فیحتمل ان یکون مخصصا منہ البعض وان لم نقف علیہ (نور الانوار ص۹۸ مطبوعہ سعید کمپنی کراچی) یعنی کوئی عام ایسا نہیں ہے جس کے بعض افراد کو خاص نہ کیا گیا ہو، تو اس کا احتمال تو موجود ہے کہ یہ عام بھی مخصوص منہ البعض ہو اگرچہ ہمیں اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ قرآن کریم میں بار بار حکم دیا گیا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو) لیکن کون نہیں جانتا کہ حائضہ اور نفساء (حیض اور نفاس والی عورتیں) نابالغ اور مجنون آدمی پر نماز فرض نہیں ہے۔ ایسے ہی مقروض اور نابالغ پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ تو کیا یہ کہدیا جائے کہ چونکہ یہ احکام قرآنی مخصوص منہ البعض ہیں۔ اس لئے قطعی نہیں رہے۔ ظنی ہو گئے ہیں اور کسی ظنی دلیل سے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہذا صلوٰۃ وزکوٰۃ فرض نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ مستحب، سنت یا واجب ہو سکتے ہیں جن کے

انکار سے کفر بھی لازم نہیں آتا۔ یا مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً (۳/۹۷)

اور لوگوں پر اللہ کے لئے بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جسے وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو

یہ آیت فرضیت حج پر نص صریح ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ اس عورت پر حج فرض نہیں ہے جسے کوئی محرم میسر نہ ہو یا جو محرم کا خرچہ برداشت نہ کر سکے۔ اسی طرح نابالغ اور مجنون بھی اس حکم سے خارج ہیں۔ لہٰذا یہ حکم بھی مخصوص منہ البعض ہو گیا تو کیا یہ بھی قطعی نہیں رہا، محض ظنی رہ گیا۔ جبکہ ظنی حکم سے فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ میں نے بالکل ہی سامنے کی مثالیں دی ہیں، جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس اصول کی رو سے تو خود احناف (شکر اللہ سعیہم) نے فاتحہ خلف الامام کی بحث میں جو استدلال کیا ہے وہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کی جو آیت اس بحث میں احناف پیش کرتے ہیں، وہ بھی عام مخصوص منہ البعض ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت میں خود احناف نے یہ بات تسلیم کی ہے۔

اعلاء السنن ہی میں ہے کہ

قلت فیہ دلالۃ علی ان العاجز عن قراءۃ

القرآن تسقط عنه القراءة مادام عاجزا ویکفیه الذکر عوضا عنها، ولا یخفی ان الذکر لا یتقید بالعربیة، ولا ینحصر فیها، بل یحصل بای لسان کان کالایمان فانه لو آمن بغیر العربیة جاز اجماعا لحصول المقصود۔ کما فی البحر (۱: ۲۰۷) وفی الوجیز للغزالی: اما حکم التکبیر فتعین کلمته علی القادر، فلا تجزئ ترجمته، واما العاجز فیلزمه ترجمته ولا تجزیه ذکر آخر لا یؤدی معناه انتهی ملخصا۔ (اعلاء السنن ص۲۵ ج۱۲)

——— میں کہتا ہوں کہ اس میں اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ جو قرآن کریم کی قراءت سے عاجز ہو، اس سے جب تک وہ عاجز رہے قراءت ساقط ہو جاتی ہے اور اسے قراءت کے بجائے صرف ذکر الٰہی کافی ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی خفا نہیں کہ ذکر الٰہی، عربی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں، نہ اس میں منحصر ہے۔ بلکہ وہ ہر زبان میں ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ایمان۔ کیونکہ اگر کوئی عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں ایمان لاتا ہے تو بالاجماع جائز ہے۔ کیونکہ مقصد تو حاصل ہو گیا۔

(بحر الرائق ص۲۰۷ ج۱)

اور امام غزالی کی " الوجیز " میں ہے ——— رہا تکبیر تحریمہ کا حکم تو متعین طور پر "اللہ اکبر" کہنا اس کیلئے ہے

جو اس پر قدرت رکھتا ہو۔ اس کے لئے اسکا ترجمہ کافی نہیں۔ رہ گیا عاجز آدمی تو اس کا ترجمہ ادا کرنا ضروری ہے اور کوئی ایسا ذکر کافی نہیں جو تکبیر کے معنے ادا نہ کرتا ہو مختصراً ختم ہوا۔

حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں۔

ومعلوم ان التكبير للاحرام ركن من اركان الصلوة، داخل فيها عند الشافعية كما صرح به في الوجيز (۱: ۲۴) وفي رحمة الامة (ص: ۱۵) ومع ذلك الزموا على العاجز عن العربية الاتيان بترجمتها، والحال ان تكبيرة الاحرام ركن لايقبل السقوط عن المصلى ابداً والقراءة تسقط عن المقتدى اذا ادرك الامام راكعا اجماعا، فلما جاز للعاجز ان يأتي بترجمة التكبير عند الاحرام۔ فجواز ترجمة القراءة له اولى وهذا هو قول ابى حنيفة وحاصله ان من سقط عنه فرض القراءة لعجزه عنها واقيم له الذكر مقامها يجوز له ان يكبر الله ويهلله ويحمده بالعربية او ياتي بترجمتها في الفارسية ونحوها لحصول الذكر وهو المطلوب ولما جاز للعاجز الاتيان بترجمة التكبير والحمد

والتسبیح ونحوھما، فلان یجوز له الاتیان بترجمة الفاتحة ونحوھا من آیات القرآن اولٰی، لکون الثانی اقرب الی القرآن من الاول، وھو ظاھر، ومن ادعی الفرق بین القراء وتکبیرة الاحرام فمنع الترجمة فی الاول واجازھا فی الثانیة مطالب بالبیان، وعلیه ان یأتی علی ذلک ببرھان۔ (اعلاء السنن ص ۱۳۰-۱۳۱ ج ۴

مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

اور معلوم ہے کہ تکبیر تحریمہ ارکان صلوٰۃ میں سے ایک رکن ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اس میں داخل ہے۔ جیسا کہ امام غزالی نے الوجیز (۱: ۲۴) میں تصریح کی ہے اور رحمۃ الامتہ (ص: ۱۵) میں ہے کہ باوجودیکہ علماء نے اس شخص پر جو تکبیر تحریمہ عربی میں ادا نہ کر سکتا ہو۔ اسے ترجمہ سے ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ حالانکہ تکبیر تحریمہ تو رکن ہی جو کسی حال میں بھی مصلی سے ساقط نہیں ہوتی اور قراءت تو مقتدی سے جب وہ جماعت میں امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوا ہو بالاجماع ساقط ہو جاتی ہے۔ تو جب عاجز آدمی کے لئے تکبیر تحریمہ کا ترجمہ ادا کرنا کافی ہو جاتا ہے تو قراءہ قرآن کا

ترجمہ بطریق اولیٰ کافی ہو جانا چاہیئے۔ امام ابو حنیفہ اور صاحبین یعنی امام ابو یوسف رح و امام محمد رح کا یہی قول ہے کہ جس سے عجز کی وجہ سے قرآن کی قرارت، ساقط ہو جائے اور اس کی جگہ ذکر الٰہی جائز ہو جائے تو اسے حق تعالیٰ کی تکبیر و تہلیل اور تسبیح عربی میں بھی جائز ہو سکتی ہے اور فارسی وغیرہ میں ان کا ترجمہ بھی جائز ہو سکتا ہے کیونکہ مقصود حاصل ہو گیا اور وہ ذکر الٰہی تھا۔ اور جب عاجز کے لئے تکبیر، تحمید اور تسبیح وغیرہ کا ترجمہ ادا کر دینا جائز ہے تو سورۂ فاتحہ وغیرہ آیات قرآنی کا ترجمہ ادا کر دینا بطریق اولیٰ جائز ہونا چاہیئے کیونکہ قرآنی آیات کا ترجمہ قرآن سے بہ نسبت تکبیر، تحمید اور تہلیل کے زیادہ قریب ہے۔ اور جو شخص اس کا مدعی ہو کہ قرارت فاتحہ اور تکبیر تحریمہ میں فرق ہے اور اس بناء پر پہلی صورت کو ناجائز قرار دے رہا ہو تو اس سے یقیناً اس کی وضاحت کا مطالبہ کیا جائے گا اور اس کے ذمے ضروری ہو گا کہ وہ اس کی کوئی دلیل پیش کرے۔

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ سادات حنفیہ، شکر اللہ سعیھم کے نزدیک آیات قرآنی فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ بھی مخصوص منہ البعض ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک

ان عجمی لوگوں سے جو قرآن کریم کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکتے ہوں، قرارت قرآن کا حکم ساقط ہے۔ نیز اس مقتدی سے بھی جو جماعت میں امام کے ساتھ رکوع میں شریک ہوا ہو، قرارت کا حکم ساقط ہے۔ تو حضرات حنفیہ رحمہم اللہ کی اس ساری تقریر کا وزن کیا باقی رہ جاتا ہے جو ہم نے پچھلے اقتباس میں اعلاء السنن سے پیش کی تھی کہ جب فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا حکم مخصوص منہ البعض ہے تو اس میں حدیث نبوی لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِقِرَاءَةِ اُمِّ الْقُرْاٰنِ (ام القران کی قرارت کے بغیر صلوٰۃ نہیں ہوتی) سے مزید تخصیص کیوں نہیں کی جا سکتی جسے امام بخاریؒ نے متواتر یا بدرجۂ آخر مستفیض یعنی مشہور قرار دیا ہے

دوسرا اعتراض اسی ضمن میں ایک دوسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ کسی آیت قرآنی کے مخصوص منہ البعض ہونے کے لئے بھی کچھ اصول مقرر ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جس آیت کو چاہیں مخصوص منہ البعض قرار دیدیں۔ اس سلسلہ میں علامہ شوکانیؒ ارشاد الفحول میں لکھتے ہیں کہ

واختلفوا فی تخصیص الکتاب العزیز بخبر الواحد فذهب الجمهور الی جوازه مطلقا وذهب بعض الحنابلة الی المنع مطلقا وحكاه الغزالی فی المنخول عن المعتزلة وابن برهان عن طائفة من المتكلمين

والفقهاء ونقله ابو الحسين ابن القطان عن طائفة من اهل العراق وذهب عيسیٰ بن ابان الی الجواز اذا كان العام قد خص من قبل بدليل قطعی متصلاً كان او منفصلاً. كذا احكاه صاحب المحصول وابن الحاجب فی مختصر المنتهی عنه - وقد سبق الی حكاية ذلك عنه امام الحرمين الجوينی فی التلخيص -

(ارشاد الفحول ص۱۵۸ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی بمصر ۱۳۵٦ھ)

خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص میں علماء نے اختلاف کیا ہے - جمہور اس کے مطلقاً جواز کے قائل ہیں اور بعض حنابلہ اس کے مطلقاً ناجائز ہونیکے قائل ہیں اور امام غزالیؒ نے منخول میں معتزلہ سے بھی اس کا عدم جواز ہی نقل کیا ہے اور ابن برہان نے متکلمین اور فقہاء کی ایک جماعت کا یہی مسلک نقل کیا ہے اور ابوالحسین ابن القطان نے اہل عراق کی ایک جماعت (مثلاً فقہائے حنفیہ وغیرہ) سے بھی یہی نقل کیا ہے اور عیسیٰ بن ابان تخصیص کے جواز کی طرف گئے ہیں جبکہ عام کی تخصیص پہلے ہی کسی دلیل قطعی سے ہو چکی ہو، وہ دلیل قطعی متصلاً آئی ہو

یا منفصلاً آئی ہو۔ صاحب محصول اور ابن الحاجب نے بھی "مختصر المنتہی" میں عیسیٰ بن ابان سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور امام الحرمین جوینی ان سے بھی "تلخیص" میں ان کا یہی قول نقل فرما چکے ہیں۔

یعنی حضرات فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ کا مسلک یہی ہے کہ کتاب اللہ کے عام کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔ البتہ حسب بیان علامہ عیسیٰ ابن ابان کتاب اللہ کے عام کی تخصیص صرف اس وقت جائز ہے جبکہ اس کی تخصیص پہلے ہی کسی دلیل قطعی سے ہو چکی ہو۔ اس مسئلہ پر علامہ محمد معروف دوالیبی مدظلہ نے ذرا وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ۔

۲۹۔ واما تخصیص الکتاب بخبر الاحاد فقد اختلفت فیه ایضا المذاهب کما یلی:
اولاً۔ ذهب الاحناف الی عدم جواز تخصیص الکتاب بخبر الواحد ما لم یخصّص بدلیل قطعی۔

---

(۱) مسلم الثبوت، الجزء الاول الصفحة ۳۴۹ المطبعة الامیریة اولیٰ مصر ۱۳۲۲ھ

والحجة فی ذلک، ان عام الکتاب قطعی ثبوتاً و

دلالة، وحديث الآحاد الخاص ظني ثبوتا وقطعي دلالة، اى ان خبر الاحاد هو دون الكتاب فى القوة، ولذلك لا يجوز تخصيص الكتاب به۔

اما اذا خصص عام الكتاب بدليل قطعي فقد اصبح بعد التخصيص ظنيًا دلالة، فيجوز عندئذ تخصيصهٗ، بخبر الاحاد الخاص وهو قطعي دلالة ۔ لان الدلالة القطعية ترجح على الدلالة الظنية

ولا بد هنا من ابداء ملاحظة على ما نقله الآمدى فى كتاب" الاحكام فى اصول الاحكام" فى قوله ان تخصيص عام القرآن بخبر الاحاد جائز عند الائمة الاربعة (۲) فقد علمت ان مذهب الاحناف عدم جواز ذلك مالم يخصص بدليل قطعي، وهذا خلافا للائمة الثلاثة كما سيأتى الخ (المدخل الى علم اصول الفقه" ص ۲۳۲-۲۳۳ الطبعة الخامسة مطابع دار العلم للملائين ۱۳۸۵ھ

(۲) الجزء الثانى منه ۔ الصفحة ۱۰۲ مطبعه صبيح، مصر۔

۲۹۔ رہ گئی اخبار احاد سے کتاب اللہ کی تخصیص تو اسمیں بھی علمائے فقہ نے اختلاف کیا ہے جیساکہ آرہا ہے

اولاً - احناف، خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص کے عدم جواز کی طرف گئے ہیں جب تک اس کی تخصیص کسی دلیل قطعی سے نہ ہو چکی ہو۔
اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کتاب اللہ کا عام ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی ہوتا ہے۔ اور حدیث آحاد خاص ثبوت کے اعتبار سے ظنی اور دلالت کے اعتبار سے قطعی ہوتی ہے، یعنی یہ کہ خبر آحاد کتاب اللہ سے قوت میں کمزور درجہ کی ہوتی ہے اسی لئے کتاب اللہ کی تخصیص اس سے جائز نہیں۔ البتہ جب کتاب اللہ کے عام کی تخصیص کسی دلیل قطعی سے ہو چکی ہو تو تخصیص کے بعد کتاب اللہ دلالت کے اعتبار سے ظنی ہو چکی ہے، تو اب اس کی تخصیص خبر آحاد خاص سے جائز ہو جائے گی جب کہ دلالت کے اعتبار سے قطعی ہو۔ کیونکہ دلالت قطعیہ، دلالت ظنیہ پر قابل ترجیح ہوتی ہے۔
اور یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے جو علامہ آمدیؒ نے کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اپنے اس قول میں کیا ہے کہ قرآن کریم کے عام کی تخصیص خبر آحاد سے چاروں ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ ائمہ احناف کا مذہب صرف اس وقت جواز کا ہے جب اس کی تخصیص

دلیل قطعی سے ہو چکی ہو۔ اور یہ مسلک ائمہ ثلاثہ کے خلاف ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مخصوص منہ البعض ہونے کے لئے حنفیہ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی یہ تخصیص کسی دلیل قطعی سے ہوئی ہو۔ وراثت کی یہ آیات اگر مخصوص منہ البعض ہیں تو بتایا جائے کہ وہ کونسی دلیل قطعی ہے جس سے ان کی تخصیص ہو چکی ہے

واضح رہے کہ دلیل قطعی یا تو قرآن کریم کی کوئی آیت کریمہ ہو سکتی ہے یا سنت متواترہ ہو سکتی ہے۔

کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔ کوئی غلام یا کنیز آزاد آدمی کا وارث نہیں ہو سکتا۔ قاتل بیٹا اپنے باپ کا وارث نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام مسائل آخر کونسی قرآنی آیت یا کونسی سنت متواترہ سے ثابت ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تمام مسائل اخبار آحاد ہی سے ثابت ہیں۔ اور آحاد قطعاً اس کی صلاحیت نہیں رکھتیں کہ قرآن کے عام کو خاص کر سکیں تو آیات میراث مخصوص منہ البعض کہاں سے ہو گئیں

اجماع کا سہارا

ایسے موقعوں پر ہمارے علمائے متأخرین کرام جا بیجا اجماع کا سہارا لینے کے عادی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مشکل سے نکلنے کے لئے بھی یہ حضرات پھر وہی اجماع کا سہارا لیں کہ کافر مسلمان کا اور

مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا ۔ غلام اور کنیز، آزاد آدمی کی وارث نہیں ہوتے، قاتل بیٹا اپنے مقتول باپ کا وارث نہیں ہوتا ان مسائل پر اجماع ہو چکا ہے اور اجماع حجت قطعی ہوتا ہے ۔ اجماع نے آیات میراث کو مخصوص کردیا۔ اور آیات قرآنی مخصوص منہ البعض ہوگئیں اور اس تخصیص کی وجہ سے وہ ظنی ہوگئیں ۔ لہذا نحن معشر الانبیاء لا نرث ولا نورث اگرچہ خبر واحد ہے لیکن اب اس سے آیات وراثت کی مزید تخصیص ہوسکتی ہے ۔ لیکن یہ سہارا کچھ زیادہ مفید نہیں ہے کیونکہ (الف) جیسا کہ میں اجماع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اپنے مقالہ اجماع میں بتا چکا ہوں' ہمارے علماء و فقہاء کے نزدیک یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ دین مکمل ہوچکا ۔ لوگوں کو اپنی رائے سے دین میں اضافہ کرنے یا کمی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے ۔ اجماع کے لئے ضروری ہے کہ کتاب وسنت سے اس کی کوئی نہ کوئی سند موجود ہو ۔ بغیر کتاب وسنت کی سند کے اجماع' صریح گمراہی ہے ۔ لہذا ہر اجماع کے قطعی اور ظنی ہونے کا فیصلہ اس کی سند کے قطعی یا ظنی ہونے کی بناء پر کیا جائے گا ۔ اگر وہ سند، کتاب الٰہی یا سنت متواترہ ہے جو قطعی ہیں تو ان پر مبنی اجماع بھی قطعی ہوگا اور اگر وہ خبر واحد ہے جو متفقہ طور پر ظنی ہوتی ہے تو اجماع بھی ظنی ہوگا ۔

(ب) اجماع کے سلسلہ میں خود فقہائے حنفیہ نے تصریحاً

بتایا ہے کہ ہر اجماع قطعی نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اجماع قطعی ہوتے ہیں، اور بعض اجماع ظنی بھی ہوتے ہیں۔ علامہ ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ "نور الانوار" میں تحریر فرماتے ہیں جو درس نظامی کی مستند اور مشہور کتاب ہے کہ

ثم هو على مراتب اى الاجماع فى نفسه مع قطع النظر عن نقله له فى القوة والضعف واليقين والظن فالاقوى اجماع الصحابة نصا مثل ان يقولوا جميعا اجمعنا على كذا. فانه مثل الاية والخبر المتواتر حتى يكفر جاحده ومنه الاجماع على خلافة الى بكر رض ثم الذى نص البعض وسكت الباقون من الصحابة وهو المسمى بالاجماع السكوتى ولا يكفر جاحده وان كان من الادلة القطعية ثم اجماع من بعدهم اى بعد الصحابة من اهل كل عصر على حكم لم يظهر فيه خلاف من سبقهم من الصحابة فهو بمنزلة الخبر المشهور يفيد الطمانينة دون اليقين الخ

(نور الانوار ص ۲۲۲-۲۲۳ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی۔ کراچی)

پھر اس کے یعنی اجماع کے فی نفسہ قطع نظر اس کے طریقۂ نقل سے، قوت اور ضعف اور یقین وظن کے اعتبار سے کئی مرتبے ہوتے ہیں تو قوی ترین حضرات صحابہ رض کا اجماع ہے جو صراحۃً ہو، مثلاً وہ سب یوں کہیں کہ ہم نے فلاں معاملہ پر اجماع کر لیا ہے تو اس کا مرتبہ قرآن کریم کی آیت اور خبر متواتر کی طرح ہے حتی کہ اس کا انکار کرنے والے کی تکفیر کی جا سکتی ہے۔ اس کی مثال وہ اجماع ہے جو صحابہ رض نے حضرت ابو بکر رض کی خلافت پر کر لیا تھا، اسکے بعد اس اجماع کا مرتبہ ہے جس پر بعض صحابہ رض نے اجماع کی تصریح کی ہو اور باقی صحابہ رض خاموش رہے ہوں، یہی وہ اجماع ہے جسے اجماع سکوتی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے منکر کی تکفیر نہیں کی جا سکتی اگرچہ یہ اجماع بھی ادلۂ قطعیہ میں شمار ہوتا ہے۔ پھر صحابہ کے بعد کے لوگوں یعنی تابعین کا اجماع ہے یعنی ہر عہد کے لوگوں کا کسی ایک حکم پر اتفاق جسکے خلاف صحابہ سے کچھ منقول نہ ہو تو اس کا درجۂ خبر مشہور کا ہوتا ہے جس سے صرف اطمینان حاصل ہو سکتا ہے، یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ الخ

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا مسائل، کہ قاتل بیٹا اپنے مقتول باپ کا وارث نہیں ہوتا۔ کافر باپ کا مسلمان بیٹا اور مسلمان

باپ کا کافر بیٹا اور غلام بیٹا آزاد باپ کا وارث نہیں ہو سکتا، یہ سب ایسے مسائل ہیں کہ ان پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی بھی صراحتاً اس کا اعلان نہیں فرمایا کہ ہم نے ان مسائل پر اجماع کر لیا ہے۔ تو ان مسائل سے قطعی اجماع کا ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ فرمانا کہ آیات میراث پہلے ہی مخصوص منہ البعض ہو چکی تھیں اور وہ اجماع صحابہ رضؓ سے مخصوص منہ البعض ہوئی تھیں محض زبردستی ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے یہ مسائل اخبار احاد ہی سے مستنبط ہیں اور تمام فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ انہیں سے کونسا مسئلہ کس حدیث نبوی سے مستنبط ہے کسی نے بھی آج تک صحابۂ کرام کے اجماع کی بات نہیں کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ صرف ہم نے ہی اس آیت قرآنی کو خاص نہیں کیا بلکہ سب نے ہی کیا ہے، تمام فقہاء کا مسلک یہی ہے تو ہمیں بڑے ادب کے ساتھ عرض کرنے دیجئے کہ ہم دیگر فقہاء کرام کی بات نہیں کر رہے، ان کے نزدیک تو قرآن کریم کی آیت کو خبر واحد سے خاص کر لینے میں کوئی مضائقہ ہی نہیں ہے۔ وہ اگر مخصوص کر لیتے ہیں تو اپنے مسلک کے مطابق صحیح کرتے ہیں۔ لیکن احناف کا مسلک تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے عام حکم کو خبر واحد سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا جب کہ یہاں احناف نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس صورت میں رکنیت فاتحہ کے خلاف احناف کی بحث بیکار ہو جاتی ہے جو ہم پیش کر چکے ہیں۔

اصل حقیقت خلاصہ یہ کہ فدک کی بحث میں علمائے متاخرین کا انداز استدلال ہمیں پسند نہیں۔ ہمارے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ (ہم انبیاء کی جماعت ہیں۔ ہم نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے) وراثت کے باب کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وصیت کے باب کا مسئلہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے ترکہ میں میراث جاری نہ کی جائے۔ بلکہ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ راہ الٰہی میں دیدیا جائے۔ کیونکہ میرا تعلق انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت سے ہے۔ ان کی میراث دینار و درہم نہیں ہوا کرتی بلکہ ان کی میراث علم اور کتاب آلٰہی ہوتی ہے۔ اگر ہم تھوڑا بہت چھوڑیں تو وہ صدقہ ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چونکہ آپ کے بعد منصب خلافت پر فائز تھے اس لئے آپ کا فرض تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کی وصیت کو بعینہ نافذ فرمائیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ فریضہ حسن و خوبی کے ساتھ ادا فرمایا۔

اصل غلطی بات یہ ہے کہ جب آدمی ایک غلطی کر لیتا ہے تو اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نہ جانے

کتنی مزید غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اصل غلطی وہ ہوئی ہے جس کی نشاندہی ہم نے شروع میں کر دی تھی کہ ہم نے وصیت کے سلسلہ میں خبر واحد کی بنا پر یہ قدغن لگادی کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہیں کی جا سکتی اور یہ کہ وارث کے لئے وصیت نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ ہمارا یہ فیصلہ قرآن کریم کے قطعاً خلاف ہے اور جب ایک مرتبہ ہم نے یہ غلط فیصلہ کر لیا کہ خبر واحد کی بنار پر قرآن کریم کے عام کو مخصوص کیا جا سکتا ہے، تو اس غلطی کو نبھانے کے لئے ہم مزید غلطیاں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک صحیح حل

قرآن کریم نے پوری وضاحت سے فرما دیا تھا کہ

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ
فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ○ (۴/۳۲-۳۳)

اور (دیکھو) جو کچھ ترکہ ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں تو ان میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے حق دار ٹھہرا دیئے ہیں۔ نیز جن سے تمہارا کوئی عہد و پیماں ہو چکا ہو (ان کا حصہ بھی ہم نے ٹھہرا دیا ہے) پس چاہیئے کہ جو جس کا حصہ ہو وہ اس کے

حوالے کر دو۔ اور (یاد رکھو) اللہ حاضر و ناظر ہے۔
اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔
نیز سورۂ احزاب میں بھی حق تعالے نے ارشاد فرمایا ہے
کہ۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ
وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ
بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِكُمْ
مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

(۳۳/۶)

نبی مومنین پر ان کے نفسوں سے زیادہ حق رکھتے
ہیں اور نبی کی بیویاں مؤمنوں کی مائیں ہیں۔ اور قرابت
دار تو اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کی میراث
کے زیادہ حق دار ہیں بہ نسبت دوسرے مؤمنین
اور مہاجرین کے مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کیطرف
کچھ نیکی کرنا چاہو (تو کر سکتے ہو) یہ اللہ کے قانون
میں لکھا ہوا ہے۔

پہلی آیت سورۂ نساء کی ہے اور دوسری آیت سورۂ
احزاب کی ہے۔ ان دونوں آیتوں میں یہ بات اچھی طرح جتلا
دینے کے بعد کہ والدین اور قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں ان
میں وراثت کے حق دار ہم نے مقرر کر دئیے ہیں اور یہ کہ اللہ

کے قانون میں قرابت دار اور میراث کے ایک دوسرے سے زیادہ حق دار ہیں، لیکن اس کے باوجود قانون الٰہی اس کا حق بھی دیتا ہے کہ آدمی کچھ لوگوں کے لئے عہد اور وعدہ کر سکتا ہے اور جو کچھ اس نے وعدہ کیا ہے وہ ان کا حصّہ ہو چکا ہے اور وہ ان کو ادا کرنا چاہئے اور یہ بھی قانون الٰہی میں ہی لکھا ہوا ہے لہٰذ دونوں کی پابندی ضروری ہے اور ان دونوں کی پابندی کی جائیگی۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ ایک پر عمل دوسرے کے خلاف ہو اس کی مفصل بحث ہم وصیت والے عنوان میں کر چکے ہیں۔ گفتگو میں تسلسل کے لئے اس کے اہم نکات یہاں بھی پیش کر دئے جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

کیا آدمی اپنی زندگی میں تصرف نہیں کر سکتا ؟

کہا جاتا ہے کہ آدمی کو اپنی زندگی میں ہر تصرف کا حق ہے وہ جسے چاہے اور جتنا چاہے دے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنے ایک بیٹے۔ بیٹی۔ یا کسی غیر آدمی کو اپنی ساری دولت بخش دے شریعت اور قانون اس پر کوئی قدغن عائد نہیں کرتے۔ لیکن وہ یہ نہیں کر سکتا کہ کل کو اپنے مرنے کے بعد ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کر دے۔ اور وارث کیلئے تو اس تہائی کی وصیت بھی نہیں کر سکتا یعنی اس میں ایک تو تہائی کی شرط لگائی جاتی ہے دوسرے اس کی کہ یہ شخص

وارث نہ ہو حالانکہ مال اپنے مالک کا ہے چاہے وہ کسی کو آج دیدے یا کل دیدے اس میں فرق کیا ہے۔

زمانہ چونکہ خراب ہے اور اعتماد کا فقدان ہے۔ خلوص، خدمت پاسداری اور وفاداری کا بھی فقدان ہے ایک آدمی دیانتداری کے ساتھ اپنی اولاد میں کسی لڑکے یا لڑکی کو زیادہ ضرورتمند سمجھتا ہے اور وہ اس کی امداد کرنا چاہتا ہے لیکن بے اعتمادی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی وجہ سے اسے یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی زمین جائداد نقد اندوختہ اور ساز و سامان اپنی زندگی میں ہبہ کر دے۔ کیونکہ اسے اندیشہ ہے کہ اولاد کل کو اسے گھر سے نکال دے اور اسے بڑھاپے میں دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ یہ محض فرضی بات نہیں ہے بلکہ ہمارے علم میں ایسے واقعات ہیں کہ بیٹے نے باپ کو مارا پیٹا اور گھر سے نکال دیا۔ اولاد میں خدمت، عزت اور پاسداری کا وہ جذبہ نہیں رہا جو ہونا چاہئے تھا۔ والدین میں وہ اعتماد و اعتبار نہیں رہا جو اولاد پر ہونا چاہئے تھا۔ لہذا وہ اپنی کسی اولاد کی مدد کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے "وقف علی الاولاد" کا حیلہ نکال لیا ہے کہ جائداد کو وقف کر دیا۔ زندگی بھر خود متولی رہے اور اپنے مرنے کے بعد اولاد کو متولی بنا دیا۔ ہمارے علماء و فقہاء اس صورت کو جائز سمجھتے ہیں اور قانون بھی اس کو جائز قرار دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شریعت کے ہر حکم کی کوئی مصلحت اور علت ہوتی ہے۔ لہذا بتایا جائے کہ ثلث سے زیادہ وصیت کے ناجائز ہونے کی وجہ، علت اور مصلحت کیا ہے؟

کیا مالک کو غیر منقولہ جائداد میں تصرف کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہندو لاء میں ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو آپ زندگی میں ہبہ کرنے کا حق مالک کو کیسے دیتے ہیں؟

کیا اس کی وجہ یہ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، کہ حق تعالٰی نے حق داروں کے حصے مقرر کر دیئے ہیں، مسلمانوں کو اس کے خلاف نہیں کرنا چاہیئے؟ اگر یہی وجہ ہے تو ہبہ کی صورت میں بھی ایک مسلمان حق تعالٰی کے مقرر کردہ حصوں کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے بھی ناجائز قرار دیجیئے نیز وقف علی الاولاد کی صورت میں بھی مقررہ حصص کی خلاف ورزی ہوتی ہے اسے بھی ناجائز کہیئے۔

اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں تو اپنے مال میں تصرف کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مرنے کے بعد کے لیئے بھی اپنی مرضی لوگوں پر تھوپ جائے تو بعینہ یہی صورت وقف علی الاولاد کی صورت میں بھی ہے کہ مالک اپنے مرنے کے بعد کے لیئے اپنی ایک مرضی ورثہ پر تھوپ جاتا ہے تو بہتر ہوگا کہ اسے بھی ناجائز قرار دیا جائے۔

نام تبدیل کرنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہو جاتی۔ مخالفت

دونوں صورتوں میں ہے ۔ اللہ کے مقرر کردہ حصص کی خلاف ورزی وقف علی الاولاد میں بھی ہے اور وصیت کی صورت میں بھی ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک کو جائز قرار دیدیں اور دوسری کو ناجائز۔

وقتی ضروریات کے ماتحت آرڈیننس

حقیقت یہ ہے کہ تہائی مال کی وصیت والی روایت کو جس سے ہمارے علماء نے قرآنی آیت کو مجروح کر دیا ہے صحیح پس منظر میں دیکھا نہیں گیا بعض مرتبہ وقتی ضروریات کے ماتحت کچھ عارضی احکام جاری کئے جاتے ہیں ۔ ایسا ہر حکومت میں ہوتا ہے ۔ اُسے موجودہ دور میں آرڈیننس کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ آرڈیننس ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں اور ضرورت ختم ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں ۔ ہمارے فقہاء اور علماء نے قانون اور آرڈیننس میں فرق نہیں کیا ۔ قانون تو وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے کہ ہر مسلمان پر والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت کر دینا ضروری ہے۔

($\frac{۲}{۱۸۰}$)

لیکن عربوں میں شادیاں کرنا اور طلاقیں دینا بڑی ہی معمولی بات تھی اور آج بھی ہے ۔ ہر آدمی ایک سے زیادہ شادیاں کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے ۔ ساری بیویاں پسند اور ناپسند میں برابر نہیں ہوتی تھیں اور نہیں ہوسکتیں ۔ ایک

بیوی زیادہ پسند ہے اور زیادہ محبوب ہے ۔آدمی اس کی اولاد کو بیوی کی خاطر نوازنا چاہتا ہے اور اسے بلا ضرورت اور بلا کسی معقول وجہ کے دوسری بیویوں کی اولاد سے زیادہ دیتا تھا جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی تھی ۔ یہ بات بہت عام تھی چنانچہ حضرت لغمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت ہے کہ

ان اباہ اتی بہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی نحلت ابنی ھذا غلاما کان لی فقال اکل ولدك نحلتہ مثل ھذا؟ فقال لا ۔ قال فارجعہ ، ومن روایاتہ تصدق علی ابی ببعض مالہ فقالت امی عمرۃ بنت رواحۃ لا ارضی حتی تشھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فانطلق بی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیشھدہ علی صدقتی فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم افعلت ھذا بولدك کلھم؟ قال لا قال اتقوا اللہ واعدلوا فی اولادکم فرجع ابی فرد تلك الصدقۃ ۔ ومنھا : قال اکلھم وھبت لہ مثل ھذا؟ قال لا قال فلا تشھدنی اذا فانی لا اشھد علی جور ۔ ومنھا اشھد علی ھذا غیری ، ثم قال ایسرك ان یکونوا فی البر سواء قال بلی قال فلا

اذا الا للسنة بحوالہ جمع الفوائد

(صـ ۲۵۴ / ج ۱)

ان کے والد انھیں لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا ایک غلام دے دیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اپنے تمام بیٹوں کو ایسے ہی غلام دئے ہیں؟ تو انھوں نے کہا: "نہیں" آپ نے فرمایا تو رجوع کر لو۔ اور نعمان بن بشیر ہی کی روایتوں میں ہے کہ میرے والد نے مجھے اپنا کچھ مال بخش دیا تو میری ماں عمرہ بنت رواحہ نے کہا کہ میں اس وقت تک خوش نہیں ہونگی جب تک تم اس پر حضور صلعم کی گواہی نہیں کرا دیتے تو میرے والد مجھے لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس بخشش پر آپ کو گواہ بنا دیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے؟ انہوں نے کہا! "نہیں" تو آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل اور برابری کرو تو میرے والد واپس آ گئے اور اس بخشش کو واپس لے لیا اور انہی روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کیا تم نے اپنے سب بچوں کو اسی طرح ہبہ کیا ہے؟" انھوں نے کہا

"نہیں" تو آپ نے فرمایا کہ مجھے گواہ نہ بناؤ، میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ اور بعض روایات میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا "میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو" پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری اولاد تم سے نیکی کرنے میں برابر ہو؟ میرے والد نے کہا: "ہاں" تو آپ نے فرمایا! تو اب میں گواہ نہیں بنتا۔

اس صورت حال کا تقاضا یہی تھا کہ اس ظلم و جور کو روکا جائے چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ اس کی تلافی فرمادی۔ ہم نے غلطی یہ کی کہ آرڈیننس کو قانون بنا دیا اور قیامت تک کے لئے اسے نافذ کر دیا۔ یہ آرڈیننس قرآن کریم کے خلاف نہیں تھا بلکہ قرآن کریم کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ اس نے وضاحت کے ساتھ فرما دیا تھا کہ

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

$\left(\frac{۲}{۱۸۲-۱۸۱}\right)$

تو سن لینے کے بعد جو وصیت میں تبدیلی کرے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہوگا جو وصیت کو بدلیں گے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے اور جانتے ہیں۔ لیکن
جو شخص وصیت کرنے والے کے متعلق طرفداری
یا کوتاہی کا اندیشہ کرے تو ان کے درمیان
اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً
حق تعالیٰ بخشنے والے اور رحم فرمانے والے
ہیں۔

آج بھی وصیت کرنے والے کی وصیت کسی بدنیتی پر مبنی
ہو اور وہ ورثاء کو نقصان پہنچانے کی نیت سے وصیت
کر رہا ہو تو عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے اور عدالت اگر
مطمئن ہو جائے تو وہ وصیت میں اصلاح کر سکتی ہے
تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو۔

ارشادِ نبوی لا نورث ما ترکنا صدقۃ آیۂ وصیت کے عین مطابق تھا

لہٰذا جب یہ معلوم ہوگیا کہ حکم وصیت منسوخ نہیں ہے اور وصیت وراثت پر مقدم ہے تو اب یہ بات سمجھنے میں کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ (ہم انبیاء کی جماعت ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے) تقسیم وراثت کے اصول کے خلاف نہیں ہے کہ اس سے قرآن کریم کے عام حکم کو خاص کیا جائے کیونکہ آیۂ وراثت میں صراحت کے ساتھ

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ (۴/۱۱) کی قید لگی ہوئی ہے کہ یہ تقسیم وراثت میت کی وصیت کو پورا کرنے یا قرض ادا کرنے کے بعد کی جائے گی۔ اور اپنے مال میں حالات کے تحت مناسب وصیت ہر مسلمان پر سورہ بقرہ کی آیت کی رو سے فرض ہے

كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلۡمَوۡتُ إِن تَرَكَ

خَيْرًا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝

(۲/۱۸۰)

اے مسلمانو! جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اگر وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہے تو تم پر والدین اور قرابت داروں کے لئے معروف طریقہ پر وصیت کرنا فرض کر دیا گیا ہے۔ یہ تقوی شعار لوگوں پر ضروری ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا' اس آیت میں وصیت کی فرضیت کو نہایت ہی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمْ کے لفظ (تم پر فرض کیا گیا ہے) سے آیت کریمہ کا آغاز ہو رہا ہے اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (یہ تقوی شعار لوگوں پر ضروری ہے) کے الفاظ پر آیت کا اختتام ہو رہا ہے۔ جو حکم صرف چند روز کے لئے دیا جا رہا ہو اور اسے چند دن کے بعد منسوخ ہو جانا ہو اسے اس شد و مد سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم کا انداز بیان خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم محکم ہے اور محکم رکھنے کے لئے نازل فرمایا گیا ہے منسوخ کرنے کے لئے نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد کہ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوگا آپ کی وصیت تھی اور وصیت کرنے کا حکم ہر مسلمان کا حق ہے اور اس پر فرض ہے۔ آپؐ نے اپنا سارا مال و متاع' اگر کچھ تھا، تو اسے آپؐ نے وقف

فرمادیا تھا وقف کے لئے ھذا صدقۃ ہی کا لفظ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے وصیت نامہ میں استعمال فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لفظ لکھے تھے ان ما کان لی من ینبع من مال یعرف لی فیھا وما حولھا صدقۃ (جو کچھ میرے اموال میں ینبوع میں ہیں جو وہاں میرے نام سے مسروف ہیں اور جو اس کے آس پاس ہیں، سب صدقہ یعنی وقف ہیں) یہ دونوں وصیت نامے میں پہلے ہی مع حوالے کے نقل کر چکا ہوں۔ؔ

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے وصیت نامے میں یہی لکھا ہے ھذا ما تصدق بہ موسیٰ ابن جعفر تصدق بارضہ فی مکان کذا وکذا کلھا (یہ وہ تحریر ہے جس کے ذریعہ سے موسیٰ بن جعفر نے صدقہ وخیرات (یعنی وقف) کیا ہے وہ تمام زمینیں جو فلاں فلاں مقام پر واقع ہیں الخ۔ یہ وقف نامہ بھی میں اس سے پہلے مع حوالہ کے نقل کر چکا ہوں۔

یہ تمام حضرات مع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود صاحب

؎ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے شیعہ حضرات کی کتابوں کے یہ حوالے اس لئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ یہ حضرات بھی صحابہ کرام سے دشمنی کے باوجود ان حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

اولاد ہونے کے اپنا حبۃً حبۃً وقف کرکے جارہے ہیں اور اولاد کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں تھی تو ان حضرات نے یہ وصیت کیسے فرمادی۔ رہا ورثہ کے ساتھ زیادتی کا خدشہ سو وہ ان حضرات سے متوقع ہی نہیں۔ یقیناً ان حضرات نے اس کا خیال رکھا ہوگا۔ یا دوسرے غریب انسانوں کی خاطر اپنے عزیز واقربا رکے جذبۂ قربانی کا یقین ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی حکمت بتاتے ہوئے بخاری کے شارح لکھتے ہیں کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ چونکہ تبلیغ دین اور خدمت انسانیت کے لئے مبعوث کرتا ہے اور ان سے یہ اعلان کرادیتا ہے کہ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا (اس خدمت انسانیت کا ہم کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے) اس لئے آنحضرت صؐ نے نہیں چاہا کہ وہ دنیوی مال ومتاع چھوڑ کر جائیں اور کسی کو یہ شبہ کرنے کا موقع ملے کہ آپؐ نے اپنے ورثہ کے لئے یہ مال ومتاع جمع فرمایا تھا۔ اسی مصلحت کی خاطر آنحضرت نے اپنے ورثہ کے لئے زکوٰۃ وصدقات حاصل کرنا ممنوع قرار دیدیا تھا۔

دوسری وجہ اس طرز عمل کی یہ تھی کہ انبیاء کرام اپنی امت کے لئے والد کی جگہ ہوتے ہیں اس لئے ان کا مال اپنی تمام اولاد (امت) کے لئے یعنی مصالح عامہ کے لئے ہوتا ہے صدقہ کے یہی معنے ہیں (حاشیہ بخاری ج ۲ ص ۱۶۵)

بہر حال جو مال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں فئے کی حیثیت سے تھا وہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا ہی نہیں بلکہ وہ مملکت کی ملکیت اور آپ کی تحویل میں تھا۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ آپ کی ملکیت تھا اس کے متعلق آپ نے وصیت فرما دی تھی کہ وہ آپ کی وفات کے بعد عامۂ مسلمین کے مفاد کے لئے وقف ہو گا۔ چنانچہ وہ وقف رہا اور اس میں بھی وراثت جاری نہیں ہو سکتی تھی اور جاری نہیں ہوئی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ابتداءً یہ بات معلوم نہیں تھی لیکن جب معلوم ہو گئی تو وہ اس پر راضی ہو گئیں اور خوش ہو گئیں بلکہ خود بھی وصیت کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً وصلی اللہ علی نبیہ المصطفیٰ وآلہ واصحاب البر والتقیٰ۔

وصیت کے فقہی مسائل

یہ اصولی ابحاث کر لینے کے بعد ہم ان فقہی مسائل کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہمارے فقہاء نے اس ضمن میں بیان فرمائے ہیں۔

قاتل کے لئے وصیت

کسی شخص نے اپنے کسی رشتہ دار، دوست یا خادم کیلئے وصیت کی کہ اس کے مرنیکے بعد اس کے ترکہ میں سے اُسے اتنا دیدیا جائے۔ وصیت کر دینے کے بعد عمداً یا خطاءً اس شخص کے ہاتھوں جس کیلئے متوفی نے وصیت کی تھی متوفی کا قتل عمل میں آگیا۔ فقہائے حنفیہ ایسی صورت میں وصیت کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اب اسے متوفی کی وصیت کے مطابق کچھ حاصل کرنیکا حق نہیں رہا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وصیت باقی رہے گی اور جس کے حق میں متوفی نے وصیت کی تھی اسے وصیت کے مطابق متوفی کے ترکہ سے اپنا حق وصول کرنیکا حق ہو گا۔

ہمارے خیال میں قتل خطا کی حد تک امام شافعیؒ کا ارشاد مطابق قرآن ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ (۳۳/۵) اور تم پر اسمیں کوئی گناہ نہیں جو تم سے (بلا ارادہ) غلطی سے سرزد ہو جائے۔

لہذا قتل خطا، چونکہ قصداً نہیں ہوتا بلکہ غلطی سے سرزد ہوتا ہے اسلئے قابل مواخذۂ الٰہی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے قاتل کو وصیت کے مفاد سے محروم کر دینے کی کوئی شرعی وجہ نہیں ہو سکتی۔ رہا قتل عمد کا مجرم تو وہ اپنے جرم سے ....

اپنے آپ کو مباح الدم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے جرم کی پاداش میں بطور قصاص کے قتل کر دیا جائے گا۔ اس لئے اس کے حق میں وصیت قائم رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قتل خطاء کی صورت میں

ہم امام شافعیؒ کے مسلک کو قرآن کے مطابق سمجھتے ہیں اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

کافر کے لئے وصیت

مسلمان اپنے کسی کافر عزیز، دوست اور خادم کے لئے نیز کافر آدمی مسلمان عزیز، دوست اور خادم وغیرہ کے لئے وصیت کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ حربی یعنی دارالحرب کا باشندہ نہ ہو۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (۶۰/۸)

اللہ تمھیں ان کفار کے ساتھ جنھوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں کوئی جنگ نہیں کی اور نہ تمھیں تمہارے شہروں سے نکالا ہے نیکی کا سلوک کرنے اور انصاف کا برتاو کرنے سے نہیں روکتا۔ یقیناً اللہ تو انصاف کا سلوک کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

البتہ اگر کوئی رشتہ دار یا دوست یا خادم حربی ہو یعنی دارالحرب

میں رہتا ہو تو اس کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہوگا۔ ایسے ہی دارالحرب میں رہنے والے اگر کسی رشتہ دار نے یا دوست نے کسی مسلمان کے حق میں وصیت کر دی ہے تو مسلمان کو اس وصیت کو وصول کرنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ چنانچہ سورۂ ممتحنہ ہی کی اگلی آیت میں ہے۔

اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۶۰/۹)

اللہ تمہیں ان لوگوں سے روکتا ہے جو تم سے دین کے سلسلہ میں جنگ کر چکے ہیں اور تمہیں تمہارے شہروں سے نکال چکے ہیں اور تمہارے نکالنے میں انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کی ہے کہ ان کے ساتھ تم دوستی کا سلوک کرو۔ اور جو بھی ان سے دوستی کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہوں گے۔

لہٰذا نہ اہل حرب کے حق میں وصیت کرنا جائز ہے اور نہ اہل حرب سے وصیت قبول کرنا جائز ہے۔

وصیت کو قبول یا رد کرنا

جس شخص کے حق میں وصیت کی گئی ہے اسے وصیت کو قبول یا رد کرنے کا اختیار ہوگا۔ لیکن یہ قبول اور رد کرنا وصیت کرنے والے کی موت کے بعد کا معتبر ہوگا۔ اگر وصیت کرنے والے کی

زندگی ہی میں اُس وصیت کو قبول کرلیا یا رد کردیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ وصیت تو وصیت کرنے والے کی موت کے بعد ہی ثابت ہوگی۔ ثبوت سے پہلے ہی قبول کرلینے یا رد کردینے کا کوئی اعتبار نہیں۔

مقروض کی وصیّت کسی شخص نے اپنے مال میں وصیت کردی کہ فلاں فلاں آدمی کو اتنا اتنا روپیہ دیدیا جائے۔ لیکن اس پر اتنا قرض بھی ہے کہ اس کا تمام ترکہ اس کا قرض ادا کرنے ہی میں چلا جائے گا اور کچھ نہیں بچے گا تو ایسے شخص کی وصیت باطل ہے۔ کیونکہ وصیت تو ایک قسم کا تبرع اور حسن سلوک ہے۔ لیکن قرض کو ادا کرنا فرض ہے۔ لہٰذا قرض بہ نسبت وصیت کے زیادہ اہم ہے اور پہلے اہم کو لینا چاہیئے۔ البتہ اگر قرض خواہ اپنا قرضہ معاف کردیں تو پھر متوفی کی وصیت پوری کی جائے گی۔ اگر سارا ترکہ قرض میں چلا جاوے تو تقسیم ترکہ بھی نہیں ہوگی۔

نابالغ کی وصیّت اگر کوئی نابالغ بچہ کسی کے حق میں کوئی وصیت کرجائے تو فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک نابالغ کی وصیت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وصیت ایک قسم کا تبرع ہے اور بچہ تبرع کا اہل نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نابالغ کی وصیت اگر نیک کام میں ہو تو صحیح ہوجائے گی۔ فقہائے حنفیہؒ کا قول اس سلسلہ میں زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس بچہ کیلئے وصیت جو ابھی پیدا نہیں ہوا

اگر کسی شخص نے اس بچہ کے لئے وصیت کردی جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ابھی اپنی ماں کے شکم ہی میں ہے تو یہ وصیت جائز ہے۔ کیونکہ وصیت کی حقیقت یہ ہے کہ مرنے والا اپنے مال کا مالک اپنے بعد کسی کو بنا رہا ہے۔ اور جو بچہ ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہے وہ وارث بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو لامحالہ وہ وصیت کی بنا پر بھی مالک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جیسے وراثت میں اس کی خلافت صحیح ہے ایسے ہی وصیت میں بھی اس کی خلافت صحیح ہونی چاہئے۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا کہ ترکے میں میری اس بیٹی کو بھی شامل کر لینا جو عن قریب پیدا ہونے والی ہے۔ (طبقات ابن سعد وغیرہ)

وصیت سے رجوع

اگر کسی شخص نے اپنے عزیز، دوست یا اور متعلقین میں سے کسی کے لئے وصیت کردی تھی اور کچھ عرصہ کے بعد اس کی رائے تبدیل ہوگئی۔ اب وہ اپنی وصیت سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کا ہبہ ہے اور ہبہ میں رجوع کا حق ہوتا ہے اگرچہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح وصیت میں بھی رجوع کرنا صحیح ہوگا لیکن مکروہ اور ناپسندیدہ ہوگا۔

رجوع لفظاً اور عملاً

رجوع کے لئے دونوں صورتیں

صحیح ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ متوفی صراحۃً زبان سے کہہ دے کہ میں نے فلاں آدمی کے لئے جو یہ وصیت کی تھی میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ اور یہ بھی ہے کہ اپنے عمل سے وہ اس کا ثبوت بہم پہنچا دے کہ اس نے رجوع کر لیا ہے۔ مثلاً وصیت کی ہوئی چیز میں کوئی ایسا تصرف کر لیا کہ اس سے دیکھنے والوں کو یقین ہو سکتا ہے کہ وصیت کرنے والا اپنی وصیت پر قائم نہیں رہا مثلاً جس چیز کی وصیت کی تھی اس کو فروخت کرنے کا کسی سے سودا کر لیا یا اسے کسی دوسرے آدمی کو ہبہ کر دیا یا اسے خود اپنے استعمال میں لینے لگا۔ وغیرہ وغیرہ

غیر معین وصیت

اگر کسی نے غیر متعین طور پر وصیت کی ہے کہ فلاں آدمی کو میرے ترکہ میں سے کچھ دیدیا جائے تو مُوصِی کے مرنے کے بعد ورثاء سے یہی کہا جائے گا کہ وہ اسے (یعنے جس کے لئے موصی نے وصیت کی ہے) اس کے ترکہ سے کچھ دیدیں۔ ورثاء آپس میں مشورہ کر کے جو دینا چاہیں دیدیں۔ وصیت کی مقدار خود ورثاء متعین کریں گے۔

حقوق اللہ کی وصیت

اگر کسی نے چند وصیتیں کی ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے تو ان میں سے فرائض کو مقدم کیا جائے گا مثلاً کسی نے زکوۃ، حج، کفارات اور قربانی وغیرہ کی وصیت کی ہے تو زکوۃ اور حج چونکہ فرائض میں داخل ہیں لہٰذا ان کو مقدم رکھا جائے گا۔

قربانی فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اس کو مقدم نہیں رکھا جائے گا۔ ایسے ہی حج اور کفارات سے زیادہ اہمیت زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ ایسے ہی کفارۂ قتل، کفارۂ ظہار اور کفارۂ یمین یہ سب صدقۂ فطر وغیرہ سے زیادہ اہم ہیں۔ لہذا ان کو مقدم رکھا جائے گا۔

ایسی وصیت جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی صدقہ وخیرات سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میں ہمارے نزدیک تہائی کی حد یا جو مناسب ہو مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی تھی۔ کیونکہ بقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تم اپنے ورثاء کے لئے بھی کچھ چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم سارا مال خیرات کر جاؤ اور تمھارے پیچھے تمھاری اولاد، دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھرے۔ چنانچہ ایک تہائی سے زیادہ حضرت سعدرضؓ کے حق میں وصیت ممنوع ہونے کا صحیح محمل یہی ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے صدقہ وخیرات کے ضمن میں وصیت کی ہے تو اس میں مناسب حد کی پابندی کی جائے گی اور فرائض کو واجبات پر، واجبات کو نوافل پر اور نوافل میں جو (نوع انسانی کے لئے فائدہ رسانی کے اعتبار سے) زیادہ اہم ہو اس کو ترجیح دی جانی چاہیئے۔ اس طرح مناسب حد میں جس قدر وصیتیں پوری کی جاسکیں ان کو پورا کر دیا جائے۔ جو مناسب حد سے

بڑھ رہی ہوں ان کو ملتوی رکھا جائے اِلّا یہ کہ خود بالغ ورثاء ان کو اپنی مرضی سے پورا کرنا چاہیں۔ اگر تمام وصیتیں اہمیت کے اعتبار سے برابر درجے کی ہوں تو پھر وصیت کرنیوالے نے جن کو مقدم رکھا تھا ان کو ترجیح دی جائے گی۔ چونکہ موصی اور ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور ترکہ کی مقدار بھی مختلف ہی ہوتی ہے اس لئے انفرادی حالات کے ماتحت حاکم مجاز کو وصیت کی حد مقرر کرنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ وہ ایک تہائی بھی ہوسکتی ہے اور ایک تہائی سے کم زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

حج کی وصیت اگر کسی شخص نے یہ وصیت کی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ سے اسکی طرف سے حج کرادیا جائے تو ترکہ کی مقدار، ورثہ کے مالی حالات کے پیش نظر حاکم مجاز کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا جائے یا نہیں۔

"فقہ القرآن جلد اول" میں کتاب الحج کے "باب حج بدل" میں ہم نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی تھی کہ حج بدل کرنے سے آیا میت کی طرف سے حج ادا ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اس بحث کو وہاں دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ جو شخص حج ادا کیے بغیر فوت ہو گیا ہے یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جس سے صحت یاب ہونے کی توقع نہیں ہے تو چونکہ اس میں مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا کے مطابق حج ادا کرنیکی

استطاعت ہی نہیں پائی گئی لہذا اس پر حج فرض ہی نہیں ہوسکا۔ اور نیابتاً کسی دوسرے آدمی کا اس کی جانب سے حج ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امام مالکؒ کا مذہب یہی ہے اور ہم نے امام مالکؒ کے قول ہی کو ترجیح دی تھی۔ لہذا حج بدل اس معنے میں حج بدل نہیں ہے کہ زید پر حج فرض تھا۔ اس کی جگہ عمرو نے حج کر دیا تو زید کا فریضہ حج ادا ہو گیا کیونکہ جب زید پر حج فرض ہی نہیں تھا تو عمرو کے حج کرنے سے زید کا حج کیسے ادا ہو گیا۔ البتہ زید نے وصیت کی تھی کہ اس کے ترکہ میں سے کسی کو حج کرا دیا جائے اس کے ورثار نے اس کے ترکہ سے بکر کو حج کرا دیا تو زید کو اس عمل خیر کا ثواب یقیناً ملے گا کہ اس نے ایک نادار آدمی کو اپنے پیسہ سے حج کرا دیا ہے۔

لہذا اگر کسی شخص نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے ترکہ سے میری طرف سے حج کرا دیا جائے اور اس شخص نے اتنا ترکہ چھوڑا ہے کہ اگر اس کے ترکہ سے حج ادا کرا دیا جائے تو ورثار کی کوئی حق تلفی نہیں ہوتی اور حاکم مجاز میت کی اس وصیت کو پورا کرنے کا حکم صادر کر دیتا ہے تو یہ عرفی حج بدل تو نہیں ہوگا۔ یعنی میت کی طرف سے کوئی دوسرا آدمی حج نہیں کرے گا۔ کیونکہ میت پر حج فرض ہی نہیں ہوسکا تھا جسے کوئی دوسرا آدمی ادا کرے ہاں یہ حج میت کی طرف سے اس معنیٰ میں ہوگا کہ اس کا ثواب میت کو

ضرور حاصل ہوگا۔ کیونکہ اسی کی رقم سے حج کیا گیا۔ اور اس صورت میں ورثار کو حج کرنے والے شخص کو زاد وراحلہ کے اخراجات میت کے جائے رہائش سے ادا کرنے چاہئیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص سفر حج کے لئے روانہ ہوا۔ اور اثنائے سفر میں مرگیا اور وصیت کر گیا کہ اس کی طرف سے حج ادا کرا دیا جائے تب بھی اس کی طرف سے حج پر جانے والے کو میت کے جائے رہائش ہی سے اخراجات زاد وراحلہ ادا کرنے چاہئیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام زفر کا مسلک یہی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ جہاں میت کی موت واقع ہوئی ہو وہاں سے حج کرنے والے کو زاد وراحلہ کے اخراجات ادا کرنے چاہئیں البتہ اگر میت کے ترکہ میں اتنی گنجائش نہ ہو تو خود مکہ مکرمہ کے کسی باشندے یا مکہ مکرمہ کے قریب جگہ کے باشندے سے حج ادا کرا کر اس کا ثواب میت کو پہنچا دیا جائے کہ اس صورت میں کفایت کے ساتھ حج ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضہ کے ارشاد

لا یصوم احد عن احد ولا یحج احد عن احد ولا یصلی احد عن احد (اوکما قال)

کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے، کوئی شخص کسی کی طرف سے حج نہ کرے، کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے۔

نیز امام مالک کے ارشاد :-

اِنی لا اریٰ ان یحج احد عن احد
میری رائے میں کوئی شخص کسی کی طرف سے حج
نہیں کر سکتا۔

کا مطلب بھی یہی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے فریضہ کو ادا نہیں کر سکتا۔ جس پر حج فرض ہوا وہی حج کرے تو اس کا فرض ادا ہوگا۔ جس پر روزہ فرض ہوا ہے وہی روزہ رکھے تو اس کا فرض ادا ہوگا۔ کسی دوسرے آدمی کے حج کرنے یا روزہ رکھنے سے اس شخص کا فریضہ ادا نہیں ہوگا۔ البتہ اگر کوئی شخص نفل روزہ رکھے، نفل حج کرے اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو بخشدے تو یہ ثواب ضرور منتقل ہو جائیگا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ !!

رہ گئی آیت (۵۳ / ۳۹ - ۴۱) تو وہ بھی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ نیز ان حضرات کے ارشاد کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی زندہ اور غیر معذور شخص کی طرف سے یہ عبادات نہیں کر سکتا۔ کہ خود اس شخص کو یہ عبادات ادا کرنی چاہئیں جس پر وہ فرض ہوئی ہیں۔ میت کی طرف سے اور معذور و مجبور شخص کی طرف یہ عبادات کر لینے کی ممانعت نہیں ہے واللہ اعلم۔

کیونکہ آدمی جب وصیت کر جاتا ہے کہ میرے ترکہ سے میرے لئے حج کرایا جائے تو اس میں خود وصیت کرنے والے کی سعی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ وہ وصیت کرتا ہے حج کے

سلسلہ کے اخراجات (زاد وراحلہ) خود اس کے ترکہ سے ادا
کئے جاتے ہیں ۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میت کا اس
عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی سعی کو اس میں کوئی دخل
نہیں ہے ۔ لہٰذا وہ خود اپنی سعی کے مطابق ہی اجر حاصل
کرتا ہے ۔

واللہ اعلم

باب الوصیۃ للاقارب وغیرھم

پڑوسیوں کے لئے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی ہو کہ اس کے ترکہ میں سے اس کے پڑوسیوں کو اتنی رقم دیدی جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جو پڑوسی اس سے قریب تر اور ملے ہوئے ہوں، وہ مراد ہوں گے اور امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک میت کے تمام اہل محلہ مراد ہوں گے جو محلہ کی مسجد میں جمع ہو جاتے ہوں۔ ہمارے خیال میں امام ابو حنیفہؒ کا قول قابل ترجیح ہے کیونکہ پڑوسی کا لفظ حقیقۃً اسی شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو بالکل متصل رہتا ہو۔ چنانچہ اسی کو شفعہ کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔

سسرالی رشتہ داروں کیلئے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے سسرالی رشتہ داروں کو میرے ترکہ میں سے اتنی رقم دیدی جائے تو بیوی کے جتنے ذی رحم محرم ہوں ان کو وصیت کی رقم ادا کر دی جائے یعنی بیوی کے وہ قریبی رشتہ دار مراد ہوں گے جن سے اس کی بیوی کا نکاح نہ ہو سکتا ہو۔ امام محمدؒ اور ابو عبیدؒہ قاسم ابن سلامؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

سمدھانے کے لئے وصیت اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے ترکہ سے اتنی رقم میرے سمدھانے والوں کو دیدی جائے تو ہر ذی رحم محرم کے شوہر مراد ہوں گے۔ یعنی بیٹی، بہن خالہ اور پھوپھی کے شوہروں میں وصیت کی رقم تقسیم کر دی جائے گی ان میں قریب اور بعید سب ہی شامل ہوں گے۔

اقربار کے لئے وصیت اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے ترکہ سے اتنی رقم میرے اقربار کو دیدی جائے تو والدین اور اولاد کے علاوہ جو قریبی رشتہ دار ہوں وہ مراد ہوں گے۔ والدین اور اولاد اقربار میں نہیں آتے کیونکہ حق تعالےٰ نے سورہ بقرہ میں

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

(۲/۱۸۰)

اے مسلمانو! جب تمہیں موت آنے لگے تو اگر تم میں سے کوئی مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو تم پر والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کے لئے وصیت کر دینا فرض کیا گیا ہے۔

پھر سورۂ بقرہ ہی میں ذرا آگے ہے

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

(۲/۲۱۵)

اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ جو کچھ مال تم خرچ کرو اس میں
والدین اور قریب ترین رشتہ داروں کا حق ہے

پھر سورۂ نساء میں ہے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ
الْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

(۴/۷)

مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو والدین
اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے
لئے بھی حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور قریب
ترین رشتہ چھوڑ جائیں

اس سے ذرا آگے ہے

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ (۴/۳۳)

اور ہم نے ہر ایک کے لئے وارث مقرر کر دیئے
ہیں اس سے جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار
چھوڑ جائیں۔

پھر اور آگے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ
أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ (۴/۱۳۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! انصاف کو قائم کرنے
والے ہو، اللہ کے لئے گواہی دینے والے خواہ وہ
گواہی خود تمہارے ہی خلاف یا والدین اور قریب
ترین رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ ہو۔

چونکہ قرآن کریم نے ان چھ مقامات پر اَقْرَبِیْنَ اور اَقْرَبُوْنَ (قریب ترین رشتہ دار) کا عطف والدین پر کیا ہے اور عطف مغائرت کو چاہتا ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ والدین اقربون میں شامل نہیں ہوتے وہ ان سے الگ ہوتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں کہ

"محمد ابن الحسن رحمہ اللہ نے اس بات پر کہ والدین اقرباء میں سے نہیں ہوتے حق تعالیٰ کے اس ارشاد ہی سے استدلال کیا ہے "الوصیۃ للوالدین والاقربین" اور چونکہ وہ اپنے کسی غیر کے ذریعہ سے ان سے رشتہ کا تعلق پیدا نہیں کرتے، ان کا رشتہ براہ راست ہوتا ہے۔ والدین کے سوا تمام رشتے کسی کے ذریعہ سے ہوتے ہیں تو اَقْرَبُوْنَ وہ رشتہ دار ہوئے جو اپنے سوا کسی دوسرے کے ذریعہ سے اس کے قریب بنتے ہوں اسی طرح صلبی اولاد بھی اقربین میں سے نہیں ہوتی کیونکہ وہ بھی بذاتِ خود والدین کی طرف تعلق حاصل کرتی ہے نہ کہ اس کے اور والد کے درمیان کسی واسطہ کے ذریعہ سے اور چونکہ والدین اقربین میں سے نہیں ہوتے اور بیٹا بہ نسبت باپ کے اپنے بیٹے کی طرف زیادہ قریب تر ہوتا ہے

لہذا بطریق اولیٰ اقربین میں سے نہیں ہوگا ــــــــــــ"

(احکام القرآن صفحہ ۱۹۵ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ مصر ۱۳۴۷ھ)

بہر حال اقرباء سے مراد والدین اور اولاد کے علاوہ دوسرے قریب ترین رشتہ دار ہوں گے اور الاقرب فالاقرب کے اصول پر جو سب سے زیادہ قریب ہوں اور ذی رحم محرم ہوں ان کو ترجیح دی جائے گی اور دو یا دو سے زیادہ مراد ہوں گے ۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے ۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اسلام میں ان کا آخری جد جن کو جمع کرتا ہو اس کی ساری اولاد مراد ہوگی ۔ مثلاً اگر وصیت کرنے والا علوی ہو تو عبد مناف ابوطالب کی اولاد میں جتنے لوگ آتے ہیں وہ سب مراد ہوں گے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قریب ترین والد کی اولاد میں جتنے لوگ آتے ہیں وہ سب مراد ہوں گے ۔ ہمارے خیال میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک قرین قیاس ہے ۔ کیونکہ وصیت بھی میراث ہی کے سلسلہ سے تعلق رکھتی ہے اور میراث میں الاقرب فالاقرب کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے ۔ لہذا وصیت میں بھی اسی اصول پر عمل ہونا چاہئے ۔ علاوہ ازیں حضرت امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اسلام میں پہلے جد کی تمام اولاد اگر مراد ہو تو اس پر عمل کرنا حضرات صاحبین کے زمانہ میں شاید ممکن ہو لیکن آجکل ممکن ہی نہیں ہے ۔ مثلاً اگر وصیت کرنے والا علوی ہو تو عبد مناف ابوطالب کی تمام اولاد پر وصیت

کو جاری کرنا جب کہ عبد مناف ابو طالب کی اولاد کا شمار بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ وصیت کا اجراء کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں امام شافعیؒ کا قول پھر بھی قابل عمل ہے۔ کیونکہ قریب ترین والد کی اولاد پر وصیت کا مال تقسیم کر دینا پھر بھی ممکن ہے۔

الاقرب فالاقرب

اگر کسی شخص نے وصیت کی کہ میرے قریب ترین رشتہ داروں کو اتنا مال میرے ترکہ سے دیدیا جائے اور اس کے قریب ترین رشتہ داروں میں دو چچا اور دو ماموں ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وصیت کے مطابق مال دونوں چچاؤں کو دیا جائے گا کیونکہ ماموؤں کے مقابلہ میں چچا اقرب ہیں اور امام محمدؒ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں چچاؤں اور دونوں ماموؤں کو وصیت کردہ مال کی مقدار برابر برابر تقسیم کر دی جائے گی یعنی چاروں کو ایک ایک چوتھائی مال دیا جائے گا۔ کیونکہ ان کے نزدیک الاقرب فالاقرب کے اصول پر وصیت میں عمل نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر اس کے قریب ترین رشتہ داروں میں ایک چچا اور دو ماموں ہوں تو امام صاحبؒ کے نزدیک نصف چچا کو ملے گا اور ایک نصف دونوں ماموؤں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ لیکن صاحبین کے نزدیک تینوں میں برابر وصیت کا مال ایک ایک تہائی کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے گا۔

اگر وصیت کرنے والے نے یہ وصیت کی کہ اتنا مال میرے

ترکہ میں سے میرے قریب ترین رشتہ دار کو دیدیا جائے اور قریب ترین رشتہ داروں میں ایک چچا اور دو ماموں ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سارا وصیت کا مال چچا کو ملے گا اور دونوں ماموں کچھ نہیں پائیں گے۔

اگر وصیت کرنیوالے نے وصیت کی کہ اتنا مال میرے ترکہ میں سے میرے قریب ترین رشتہ داروں کو دیدیا جائے اور اس کے قریب ترین رشتہ داروں میں ایک چچا اور ایک پھوپھی یا ایک ماموں اور ایک خالہ ہے تو چچا اور پھوپھی کو یا ماموں اور خالہ کو برابر برابر حصہ دیا جائے گا۔ کیونکہ اقرب (قریب ترین رشتہ دار) ہونے میں دونوں برابر ہیں۔

اھل کے لئے وصیّت

اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے ترکہ میں اتنا مال فلاں کے اہل کو دیدیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اھل سے مراد فلاں کی بیوی ہو گی۔ اور امام محمد اور ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وہ سب لوگ مراد ہوں گے جن کا نفقہ فلاں کے ذمہ ہوتا ہو۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اہل کا لفظ بیوی کیلئے حقیقت ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ج (۳۸/۲۹)

جب موسیٰ نے مقررہ مدت پوری کرلی اور اپنی بیوی کو لے کر چلے تو پہاڑ کی جانب سے انھیں آگ نظر آئی۔

اس آیت میں اھلہ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی ہی ہیں۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ اھل سے مراد وہ تمام افراد خانہ ہوتے ہیں کہ جن کا نان ونفقہ کسی کے ذمہ ہو۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔

وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ

(۱۲/۹۳)

اور میرے پاس اپنے سب گھر والوں کو لے آؤ

اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اولاد اسرائیل کی صرف بیویوں کو لانے کے لئے نہیں کہا تھا بلکہ تمام افرادِ خاندان کو لانے کے لئے فرمایا تھا۔ لہذا اَھْلٌ سے مراد تمام افراد خاندان ہیں جن کا نفقہ ان کے ذمہ تھا۔

اَھْلٌ کے ذیل میں صاحب محیط المحیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے معنی عبرانی زبان میں خیمہ کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اھل وہ لوگ ہیں جو ایک خیمہ میں رہتے ہوں یعنی بیوی اور بچے۔ ان میں بیوی اصل ہے اور بچے تبعًا شامل ہیں۔ اس کے بعد راغب کے الفاظ میں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی بولا جانے لگا جو آپس میں نسب، دین یا پیشہ، مکان اور شہر میں مشترک ہوں (مفردات راغب) لیکن ظاہر ہے کہ یہ عام معنے مجازی ہی ہوسکتے ہیں جو کثرت استعمال سے اس لفظ کے ہوگئے ہیں۔ عام طور پر اھل الرجل آدمی کے بیوی بچوں اور قریبی رشتہ داروں کو

کہتے ہیں اھل البیت گھر والے۔ اہل خانہ بیوی بچے۔ اھل الرجل بیوی اور اولاد (تاج العروس و مفردات راغب) لیکن صاحب محیط المحیط کے نزدیک اس سے مراد بالخصوص بیوی ہوتی ہے۔ قرآن کریم سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں جب ان کے پاس فرشتے آئے اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو اسحٰق علیہ السلام کی انہوں نے بشارت دی اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو تعجب ہوا کہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا تو فرشتوں نے کہا تھا

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (۱۱/۷۳)

فرشتوں نے کہا کہ کیا تم اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہو! اے (ابراہیمؑ کی) اہل خانہ تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں۔

حضرت سارہؓ کے اب تک کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھی تبعاً اَهْلَ البیت کے مفہوم میں داخل ہو جاتی۔ یہاں تو صرف بیوی ہی بیوی ہیں اور وہی مراد ہیں۔ نیز موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جب وہ مدین سے اپنی زوجۂ محترمہ کو لے کر مصر جا رہے ہیں۔ سردی کا موسم اور رات کا وقت ہے صحرائے سینا سے گذر رہے ہیں کہ انہیں دور سے آگ کی سی روشنی

نظر آتی ہے ۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں ہے

وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ إِذْ رَاٰ
نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْا إِنِّيْ اٰنَسْتُ
نَارًا لَّعَلِّيْ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ
عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ (۲۰ / ۹-۱۱)

اے پیغمبر اسلام ! آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کا واقعہ پہنچا ہے ؟ جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو ، مجھے آگ نظر آرہی ہے ۔ شاید میں وہاں سے کوئی چنگاری لاسکوں یا وہاں سے راستہ کا کچھ پتہ نشان لگ جائے ۔

واضح رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ اس خاندان کی نسل ہی حضرت ہارون سے چلی ہے ۔ لہٰذا یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صرف زوجۂ محترمہ ہی لفظ اَهْلِهٖ کا مصداق ہیں ۔ نیز یہی واقعہ سورہ قصص میں آیا ہے

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهٖ اٰنَسَ
مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْا
إِنِّيْ اٰنَسْتُ نَارًا (۲۸ / ۱۹)

تو جب موسیٰ نے (مقررہ) مدت پوری کرلی اور وہ اپنی بیوی کو لے کر چلے تو طور (پہاڑ) کی طرف سے انھیں آگ نظر آئی ، انھوں نے اپنی بیوی سے

سے کہا۔ ٹھہرو، مجھے آگ نظر آرہی ہے۔
یہاں بھی اَھْلِہٖ سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ ہی مراد ہیں۔ نیز یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جب عزیز مصر کی بیوی نے ان پر ڈورے ڈالنے چاہے اور یوسف علیہ السلام کمرہ سے بھاگے، پیچھے پیچھے عزیز مصر کی بیوی بھی آرہی تھی۔ دروازہ پر عزیز مصر سے دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی تو عزیز مصر کی بیوی نے شوہر سے کہا تھا۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(۱۲/۲۵)

عزیز مصر کی بیوی نے کہا کہ جو تیری بیوی کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے۔

اس آیت کریمہ میں بھی اَھْلِكَ سے مراد صرف عزیز مصر کی بیوی ہی ہے۔ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جب وہ دریائے نیل میں بہتے بہتے فرعون کے محل میں پہنچے اور زوجۂ فرعون نے انھیں اپنا متبنّیٰ بنانے کی خواہش کی اور انھوں نے کسی دایہ کا دودھ نہ پیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جو ان کی سُن گن لینے کے لئے فرعون کے محل میں پہنچ گئی تھیں

کہا تھا

فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى أَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ
لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ٥

(۲۸/۱۲)

کیا میں تمہیں ایسی گھر والی بتاؤں جو تمہاری اس کی
ذمہ داری اٹھا سکے اور وہ اس کی خیر خواہ بھی ہو۔

اس آیت میں اہل بیت سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت موسٰی
علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس وقت
فرعون اور زوجۂ فرعون کو ایک ایسی دایہ ہی کی ضرورت تھی
جو بچہ کو دودھ پلا سکے۔ دایہ کے بچوں وغیرہ کی تو ضرورت
نہیں تھی۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ان کا
بیٹا کشتی میں سوار نہیں ہوا اور اس کے غرق ہو جانے کا اندیشہ
ہوا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ
اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ
الْحٰكِمِيْنَ ٥ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ
اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ
تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ٥ (۱۱/۴۵-۴۶)

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ میرا بیٹا تو میرے
اہل میں سے ہے اور یقیناً آپ کا وعدہ سچا ہے۔

(کہ اپنے اہل کو کشتی میں سوار کر لینا) اور آپ تو بہترین
فیصلہ کرنے والے ہیں تو حق تعالیٰ نے جواب دیا تھا
کہ اے نوح! وہ تمھارے اہل میں سے نہیں ہے۔
یقیناً اس کے عمل بھی اچھے نہیں ہیں۔ لہٰذا تم مجھ سے
اس بات کا سوال نہ کرو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔
میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ بن جاؤ

مفسرین کا خیال ہے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ وجہ اور علّت ہے اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ کی۔ یعنی اے نوحؑ وہ تمھارے اہل میں سے اس لئے نہیں ہے کہ اس کے عمل صحیح نہیں ہیں۔ (وہ صاحب ایمان نہیں ہے۔ صاحبانِ ایمان الگ ملّت کے افراد ہیں اور صاحبانِ کفر الگ ملت کے افراد ہیں۔ وہ تمھاری ملّت ہی سے نہیں ہے تو وہ تمھارا اھل کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تفسیر یقیناً صحیح ہے لیکن دونوں جملے مستقل بھی تو ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ آپس میں علّت اور معلول نہ ہوں۔ عربیت کے لحاظ سے علت اور معلول ہونا ضروری تو نہیں ہے۔ تو اگر دونوں جملے اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے نوح! تمھارا بیٹا تمھارا اہل نہیں ہے اہل تو حقیقی طور پر بیوی ہوا کرتی ہے۔ اور اولاد تبعًا اہل کہلاتی ہے۔ اصلاً اہل نہیں ہوا کرتی۔ علاوہ ازیں اس کے اعمال بھی صالح نہیں ہیں۔ وہ تم پر ایمان بھی نہیں لایا ہے لہٰذا اس کے متعلق ہم سے سوال نہ کرو۔ یہ تفسیر بھی عربیت کے لحاظ سے صحیح ہے۔ اس صورت میں یہ آیت

امام ابو حنیفہؒ کے قول کی دلیل بن جائے گی کہ اَهْلَ کا مصداق حقیقی طور پر بیوی ہی ہوا کرتی ہے۔ اور اولاد و دیگر رشتہ داروں کو تبعًا اھل کہا جا سکتا ہے۔ اصالۃً نہیں کہا جا سکتا۔ صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا خیال ہے کہ اَهْلٌ میں وہ تمام لوگ داخل ہوتے ہیں جن کا نان ونفقہ کسی کے ذمہ ہو۔ صرف بیوی ہی اہل نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے اور ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سورۂ نمل اور سورۂ عنکبوت کی آیات (۲۷/۵۷، ۲۹/۳۲) سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں جگہ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ (۲۷/۵۷) اور لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ (۲۹/۳۲) میں اھلهٗ سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی اولاد ہی ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں بیوی کا استثنار آرہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اَهْلَهٗ میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے اَهْلٌ کے حقیقی معنے بیوی ہی کے ہوتے ہیں۔ اولاد اور دوسرے قریبی رشتہ دار تبعًا اور مجازًا مراد ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں دونوں آیتوں میں اِلَّا امْرَاَتَهٗ کے استثنار کی وجہ سے مجازی معنے ہی مراد ہوں گے کیونکہ مجاز کا قرینہ موجود ہے۔ نیز اس کا امکان ہو کہ لوط علیہ السلام کے کئی بیویاں ہوں اور اَهْلَهٗ سے مراد مؤمن بیویاں ہی ہوں اور اِلَّا امْرَاَتَهٗ سے کسی خاص

بیوی کا استثنار کیا جا رہا ہو ۔ جو ایمان نہیں لائی تھی ۔ کیونکہ انبیاء سابقین کے عام طور پر متعدد بیویوں کا ثبوت کتب سابقہ سے ملتا ہے ۔ لہٰذا اس قسم کی آیات سے امام ابو حنیفہؒ کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا ۔ واللہ اعلم

آل فلاں کے لیے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی ۔ ترکہ میں سے اتنا مال فلاں کی آل کو دیدیا جائے تو وہ مال فلاں آدمی کے گھر والوں کو دینا ہوگا ۔ کیونکہ آل سے مراد وہ خاندان ہوتا ہے جس کی طرف آدمی اپنی نسبت کرتا ہو ۔ لہٰذا فلاں آدمی کے خاندان کے افراد میں جو ایک گھر میں رہتے ہوں وہ مال تقسیم کر دینا ہوگا ۔

چنانچہ آل فرعون کا لفظ (۲/۴۹ ذ ۲/۵۰ ذ ۳/۱۱ ذ ۷/۱۳۰ ذ ۷/۱۴۱ ذ ۸/۵۲ ذ ۸/۵۴ ذ ۱۴/۶ ذ ۲۸/۸ ذ ۴۰/۲۸ ذ ۴۰/۴۵ ذ ۴۰/۴۶ ذ ۵۴/۴۱) میں چودہ مرتبہ آیا ہے جس سے مراد پوری قوم فرعون ہے ۔

نیز آل موسیٰ و آل ھٰرون کا لفظ (۲/۲۴۸) میں آیا ہے اور مراد قوم موسیٰ اور قوم ہارون یعنی بنی اسرائیل ہیں ۔ نیز آل اِبْرٰھِیْمَ کا لفظ (۳/۳۳ ذ ۴/۵۴) میں آیا ہے جس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری نسل ابراہیمی ہے ۔ اور آل عِمْرَانَ کا لفظ (۳/۳۳) میں آیا ہے اور مراد حضرت عمرانؑ (والد حضرت مریمؑ) کی ساری نسل ہے ۔ اسی طرح آل یعقوب کا لفظ (۱۲/۶ ذ ۱۹/۶) میں آیا ہے اور مراد پوری قوم بنی اسرائیل ہے ۔ اور آلِ لُوْطٍ کا لفظ بھی آیت (۱۵/۵۹ ذ ۲۷/۵۶ ذ ۱۵/۶۱ ذ ۵۴/۳۴)

میں آیا ہے اور مراد حضرت لوط علیہ السلام کی پوری اولاد ہے۔ نیز آل داؤد کا لفظ آیت (۳۴/۱۲) میں آیا ہے اور مراد حضرت داؤد علیہ السلام کا پورا خاندان ہے۔ لہٰذا آل کے لفظ میں عموماً پورا خاندان مراد ہوتا ہے جو کسی ایک جگہ رہتا ہو۔

اہل بیت کیلئے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے ترکہ میں سے فلاں آدمی کے اہل بیت کو اتنی رقم دیدی جائے تو اس میں اس کے سب گھر والے شامل ہوں گے۔ حتیٰ کہ باپ اور دادا بھی شامل ہونگے اور ان کو بھی وصیت سے حصّہ دیا جائے گا۔ کیونکہ باپ اور دادا گھر کی اصل اور بنیاد ہیں۔

اپنے اہل نسب اور اہل جنس کے لئے وصیت

اگر کسی شخص نے اپنے اہل نسب یا اہل جنس کے لئے وصیت کی ہے۔ تو نسب سے مراد وہ خاندان ہوگا جس کی طرف وہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے اور وہ آباء کی جہت سے ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں نسب باپ سے چلتا ہے۔ ماں سے نہیں چلتا۔ ایسے ہی اہل جنس سے مراد بھی اس کے باپ ہی کے گھر والے ہوں گے۔ ماں کے گھر والے نہیں ہوں گے۔ البتہ اگر اس نے اپنے اہل قرابت کے لئے وصیت کی ہے تو تمام قرابت داروں کو وصیت سے حصہ دینا ہوگا۔ کیونکہ قرابت باپ کی جانب سے بھی ہو سکتی ہے اور ماں کی جانب سے بھی۔

بنوں فلاں کے یتامیٰ، نابینا معذور اور بیواؤں کیلئے

اگر کسی شخص نے وصیت کی کہ فلاں خاندان کے یتیموں، نابیناؤں، معذوروں اپاہجوں اور غریبوں کو میرے ترکہ سے اتنی رقم دے دی جائے تو اگر یہ لوگ قابل شمار ہوں تو وصیت میں اس خاندان کے فقراء، اغنیاء، مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے اور اگر وہ لاتعداد اور قابل شمار نہ ہوں تو ان میں سے صرف فقراء اور حاجت مند مراد ہوں گے۔ کیونکہ وصیت سے مقصد تقرب الٰہی ہوتا ہے جو لوگوں کی حاجت روائی اور لوگوں کی گرسنگی سے رہائی میں زیادہ متوقع ہے۔ البتہ اگر اس نے یوں وصیت کی کہ فلاں خاندان کے نوجوانوں اور بیواؤں کو میرے ترکہ میں سے اتنی رقم تقسیم کر دی جائے اور وہ لاتعداد اور بیشمار ہیں تو وصیت باطل ہو گی کیونکہ وصیت کے الفاظ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے ضرورت اور حاجت کا احساس ہوتا ہو تو صرف فقراء کو دیدینا صحیح نہیں ہو گا اور خاندان کے سارے نوجوانوں اور بیواؤں کو دینا ممکن نہیں ہے۔

خاندان کے فقراء و مساکین کیلئے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی ہے کہ فلاں خاندان کے فقراء اور مساکین کو میرے ترکہ میں سے اتنی رقم دیدی جائے تو کم از کم دو فقیروں اور مسکینوں کو وہ

رقم دے دینی ضروری ہے۔ کیونکہ فقراء اور مساکین جمع کے الفاظ ہیں اور جمع کا اطلاق کم از کم دو پر تو ہونا چاہیئے۔

بنو فلاں کیلئے وصیت

اگر یوں وصیت کی کہ بنوں فلاں کو میرے ترکہ میں سے اتنی رقم دیا جائے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا قول یہی ہے کہ فلاں کی اولاد ذکور واناث (مردوں اور عورتوں کو) سب کو وصیت کے مطابق رقم تقسیم کر دی جائے گی کیوں کہ بنو کا لفظ بیٹوں بیٹیوں، پوتوں، پوتیوں کو سب کو شامل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں امام ابو حنیفہؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ بنو کا لفظ حقیقت میں مردوں ہی کے لیئے ہے عورتیں اس میں تغلیبا اور مجازاً شامل کر لی جاتی ہیں۔ لہذا صرف مردوں کو وصیت کا مال دیا جائے گا عورتوں کو نہیں۔

ہمارے نزدیک امام صاحب کا پہلا قول جو امام محمد اور امام ابو یوسفؒ کا قول بھی ہے زیادہ صحیح ہے کہ بنو کا لفظ سب کو ہی شامل ہوتا ہے۔ البتہ اگر بنو فلاں سے مراد کوئی خاندان، یا قبیلہ ہو تو پھر بالاتفاق خاندان کے مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہونگے۔

فلاں کی اولاد کیلئے وصیت

اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے ترکہ میں

سے فلاں کی اولاد کو اتنا مال دے دیا جائے تو اس وصیت میں بالاتفاق فلاں کی اولاد، مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے کیونکہ اولاد کا لفظ مردوں اور عورتوں سب کو بربنائے حقیقت شامل ہوتا ہے اور سب کو برابر سرابر دیا جائے گا۔ البتہ

ورثہ فلاں کیلئے وصیت

اگر ان الفاظ سے وصیت کی ہے کہ فلاں کے وارثوں کو میرے ترکہ سے اتنی رقم دے دی جائے تو وصیت میں مرد اور عورتیں سب شامل تو ہوں گے لیکن مردوں کو عورتوں سے دوگنا حصّہ دیا جائے گا کیونکہ وصیت کرنیوالے نے فلاں کے ورثاء کے لئے وصیت کی ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ وراثت کے اصول کے مطابق فلاں کے وارثوں کو دلوانا چاہتا ہے اور وراثت میں لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کا اصول کارفرما ہوتا ہے (یعنی مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ) لہٰذا اس اصول کی پیروی کیجائیگی۔

باب الوصیۃ بالسکنیٰ والثمرۃ

جس طرح اعیان کے ساتھ وصیت کی جا سکتی ہے اسی طرح منافع کے ساتھ بھی وصیت کی جا سکتی ہے ۔ چنانچہ اگر کسی نے وصیت کر دی کہ فلاں آدمی کو میرے فلاں مکان میں اتنے سال تک یا عمر بھر رہنے دیا جائے ۔ یا فلاں شخص کو میرے فلاں درخت کا پھل دیا جایا کرے ۔ ایک وقت معینہ تک بھی یہ وصیت درست ہے اور ہمیشہ کے لئے بھی جب تک وہ شخص جس کے متعلق وصیت کی گئی ہے زندہ رہے ۔ اسی طرح مکان اور درخت کی ملکیت تو وصیت کرنے والے یا اس کے ورثار کے حق میں محفوظ رہے گی البتہ اس کے منافع اس شخص کو حاصل ہوتے رہیں گے جس کے لئے وصیت کی گئی ہے ۔ اسی طرح یہ وصیت بھی صحیح ہے کہ میرے مرنے کے بعد فلاں مکان یا فلاں دکان کا کرایہ اتنے سال تک یا جب تک وہ زندہ رہے فلاں آدمی کو ملتا رہے ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وقف کی صورت میں ہوتا ہے ۔ کہ ملکیت وقف کرنے والے کے حق میں محفوظ رہتی ہے اور منافع ان کو

حاصل ہوتے رہتے ہیں جن کے حق میں وقف کیا ہے ۔ (اس سلسلہ میں وقف کا بیان دیکھ لیا جائے)

موصیٰ لہٗ اگر مر گیا جس شخص کے حق میں منافع کی وصیت کی تھی کہ اس کو ملتے رہیں جب وہ مر جائے تو اب اس چیز کے منافع موصی کے ورثہ کی طرف لوٹ آئیں گے ۔ موصیٰ لہٗ کے ورثہ کی طرف منتقل نہیں ہوں گے ۔ کیونکہ وصیت کرنے والے نے جس شخص کے حق میں وصیت کی تھی وہ موجود نہیں رہا اور موصیٰ لہٗ کے ورثاء کے لئے اس نے وصیت نہیں کی تھی ۔ نیز اگر موصی لہٗ کا انتقال خود موصی کی زندگی ہی میں ہو گیا تو وصیت باطل ہو گئی ۔ کیونکہ وصیت کا نفاذ تو موصی کی موت کے بعد ہونا تھا اور موصی کی موت کے وقت موصی لہٗ موجود ہی نہیں رہا ۔ لہذا وصیت ختم ہو گئی ۔

وصیت میں تبدیلی کسی نے وصیت کی کہ میرے فلاں مکان کا کرایہ اتنے عرصہ تک فلاں آدمی کو ملتا رہے لیکن اس فلاں آدمی نے بجائے مکان کا کرایہ وصول کرنے کے اس مکان میں سکونت اختیار کر لی تو حنفیہ میں سے فقیہ ابوبکر اسکافؒ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ کیونکہ وصیت کرنے والے کا مقصد تو یہ تھا کہ اس مکان کے منافع اس شخص کو حاصل ہوتے رہیں ۔ منافع کی جہاں ایک صورت کرایہ کی شکل میں ہو سکتی ہے وہیں اس کی دوسری صورت سکونت اختیار کر لینے کی بھی ہے ۔ لیکن جمہور فقہائے

حنفیہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کرایہ کی صورت میں اگر میت کے ذمہ کسی کا قرض نکل آیا تو ورثاء قرض کی ادائیگی کے لئے موصی لہٗ سے کرایہ کی رقم واپس لے سکتے ہیں تاکہ اس سے قرض کی ادائیگی کر سکیں۔ (واضح رہے کہ وصیت پر قرض کی ادائیگی مقدم ہوتی ہے) اور سکونت اختیار کر لینے کی صورت میں ورثاء اس سے کچھ نہیں لے سکیں گے۔ لہٰذا وصیت میں ایسی تبدیلی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اسی طرح اگر کسی نے وصیت کی کہ فلاں شخص کو میرے بعد میرے فلاں مکان میں رہائش کا حق ہوگا۔ اس شخص نے بجائے خود رہائش اختیار کرنے کے اس مکان کو کرایہ پر دیدیا اور اس کا کرایہ وصول کرتا رہا امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کر لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وصیت کی رو سے وہ مکان کی منفعت کا مالک ہو گیا ہے۔ وہ اس منفعت کا دوسرے کو بھی مالک بنا سکتا ہے، معاوضہ لے کر بھی اور بلا معاوضہ بھی اس لئے کہ منفعت کا حکم ان کے نزدیک اعیان کے حکم کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن فقہائے حنفیہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ وصیت کی صورت میں موصی لہٗ کے لئے منفعت کی تملیک بلا بدل ہے۔ جیسا کہ عاریہ کی صورت میں تملیک بلا بدل ہوتی ہے۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ عاریت پر لی ہوئی چیز کو آدمی کرایہ پر چڑھا دے اور اس سے کرایہ وصول کرتا رہے۔ علاوہ ازیں ہمارے نزدیک منافع کا حکم اعیان کی طرح نہیں ہوتا۔ فقہائے حنفیہ دونوں میں

فرق کرتے ہیں۔

باغ کے پھل کی وصیت اگر کسی شخص نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے باغ کا پھل فلاں آدمی کو دیدیا جائے تو باغ پر جو پھل لگا ہوا ہے، وہ موصیٰ لہٗ کی ملکیت ہوگا۔ لیکن آئندہ جو پھل باغ میں آئے گا وہ ورثہ کی ملکیت ہوگا۔ اس پر موصی لہٗ کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ البتہ اگر اس نے یوں وصیت کی ہے کہ میرے مرنیکے بعد میرے باغ کا پھل ہمیشہ فلاں آدمی کو دیا جایا کرے تو اس باغ کا پھل جب تک موصیٰ لہٗ زندہ رہے وہ اسی کا حق ہوگا۔ موصی لہٗ کے مرنے کے بعد ورثہ اس باغ کا پھل حاصل کرسکیں گے۔

باغ کی آمدنی کی وصیت لیکن اگر کسی شخص نے یوں وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے باغ کی آمدنی فلاں آدمی کو دی جائے تو باغ کی آمدنی موصیٰ لہٗ کی زندگی بھر موصیٰ لہٗ کو ملنی چاہئے۔ کیونکہ آمدنی کے متعلق جب مطلقاً کہا جاتا ہے تو اس سے عرف عام میں موجود اور مستقبل کی آمدنی مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کا توگذارا باغ یا مکان کی آمدنی پر ہے یعنی حال اور مستقبل میں اس کی گذر اوقات باغ کی آمدنی ہی پر ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتا کہ موجودہ فصل کی آمدنی پر تو اس کا گذارہ ہے لیکن مستقبل کی آمدنی پر اس کا گذارہ نہیں ہوگا۔ اگر صرف موجودہ فصل کی آمدنی کیلئے وصیت کرنی ہوتی تو موصِی کو یوں وصیت کرنی چاہئے تھی کہ میرے مرنیکے بعد فلاں آدمی کو موجودہ فصل کی

آمدنی دیدی جائے۔ لیکن جب پھل کی بات کیجاتی ہے اور مطلقاً پھل کا ذکر کیا جاتا ہے تو موجود پھل ہی مراد ہوا کرتا ہے۔

بھیڑ کے اون، دودھ اور اولاد کی وصیت

اگر کسی نے یہ وصیت کی ہے کہ میری بھیڑوں کا اون، یا انکے بچے یا انکا دودھ میرے مرنیکے بعد فلاں آدمی کو دیا جائے تو اگر وصیت کرنے والے نے صراحۃً کہدیا ہو کہ بھیڑوں کا اون، انکے بچے اور انکا دودھ ہمیشہ موصٰی لہٗ کو دیا جایا کرے۔ تو صرف وہ اون، صرف وہ بچے اور صرف وہ دودھ مراد ہوں گے جو موصی کی موت کے دن بھیڑوں کے جسم پر، انکے پیٹ میں اور ان کے تھنوں میں موجود ہوں ہمیشہ کے لئے وصیت صحیح نہیں ہوگی۔ کیونکہ جو اون آج بھیڑوں کے جسم پر موجود نہیں ہے۔ جو بچے بھیڑوں کے پیٹ میں آج موجود نہیں ہیں، جو دودھ بھیڑوں کے تھنوں میں آج موجود نہیں ہے ان کے متعلق وصیت کرنا ایک معدوم چیز کی تملیک ہے جو صحیح نہیں ہے۔ رہ گیا پھل اور آمدنی کا معاملہ کہ ان کے متعلق ہم نے وصیت کو جائز بتایا ہے حالانکہ وہاں بھی معدوم ہی کی تملیک ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی اور پھل وغیرہ میں چونکہ شریعت نے مساقات اور اجارہ کے معاملات کو ضرورت کے لحاظ سے جائز کیا ہے۔ اس لئے ہم نے وصیت میں بھی اسے جائز رکھا ہے ورنہ اصول تو وہی ہے کہ معدوم کی تملیک جائز نہیں ہوتی۔

واللہ اعلم

باب وصیۃ الذمیؒ

کسی یہودی یا نصرانی نے اپنا صومعہ یا گرجا اپنی صحت کی حالت میں تعمیر کرایا اس کے بعد وہ مرگیا تو اس کے مرنے کے بعد اس میں میراث جاری ہوگی اور ورثہ میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ وقف کی صورت ہے اور وقف کی ان کے نزدیک (امام سرخسیؒ کی روایت پر) کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک بھی ورثہ میں تقسیم ہو جائے گا لیکن ان کے نزدیک اس لئے کہ صومعہ یا گرجا بنانا ایک معصیت ہے لہذا اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (وقف کا بیان دیکھ لیا جائے)

البتہ اگر اس نے متعین لوگوں کے لئے وصیت کی ہے کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں کے لئے میرا مکان گرجا یا صومعہ بنا دیا جائے تو ائمہ حنفیہ فرماتے ہیں کہ یہ وصیت ثلث کی حد تک جائز ہوگی۔ اس لئے کہ اس میں تملیک اور استخلاف کے معانی پائے جاتے ہیں اور ذمی اپنی چیز کا مالک یا خلیفہ جسے چاہے بنا سکتا ہے۔

اور اگر غیر معین لوگوں کے لئے اس نے وصیت کر دی ہے کہ میرا گھر ان کے لئے کنیسہ یا گرجا بنا دیا جائے تو یہ وصیت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک باطل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ بات ان کے عقیدہ میں عبادت ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان پر ان کے دینی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ یہ حقیقت میں ایک معصیت ہے اور معصیت کے ساتھ وصیت باطل ہوتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ذمی کی وصیت اپنے مال میں اپنے اعتقاد کے مطابق جائز ہونی چاہئے۔ محولہ بالا تینوں صورتوں میں وصیت صحیح ہے۔ کیونکہ ہمیں کسی کے عقیدہ میں دخل دینے اور اسے اپنے عقیدہ پر مجبور کرنے کا اسلام نے حق نہیں دیا۔ قرآن کریم نے ایک اصول بیان کر دیا ہے کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
(۲/۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ
وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝
(۱۰/۹۹)

اللہ اگر چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں سارے
کے سارے ایمان لے آچکے ہوتے تو کیا آپ
لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا چاہتے ہیں ۔

لہذا ہمیں ان کے مذہبی معاملات میں ایسی کوئی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیئے جس سے جبر یا اکراہ کا کوئی پہلو نکلتا ہو وہ کینسہ یا صومعہ بنائیں ۔ وہ متعین لوگوں کے لیئے یہ وصیت کر جائیں کہ اس کے بعد اس کا گھر ان کے لیے کینسہ یا صومعہ بنا دیا جائے یا غیر متعین لوگوں کے لئے ایسی وصیت کر جائیں۔ یہ ان کا اپنا دینی معاملہ ہے ۔ وہ ہر تصرف کر سکتے ہیں

اگر کوئی حربی دارالاسلام میں امان کے ساتھ داخل ہوا اور یہاں آکر بیمار ہو گیا اور موت کا وقت آگیا اور یہاں اس نے کسی مسلمان یا کسی ذمی کے حق میں کوئی وصیت کر دی کہ میرا سارا مال میرے مرنے کے بعد انھیں دیدیا جائے تو اس کی یہ وصیت صحیح ہو گی ۔ فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ایک تہائی تک وصیت کا جواز ورثہ کے حق کی وجہ سے ہے اور اسی وجہ سے ہمارا موقف یہ تھا کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ ہونی چاہیئے اور حربی آدمی کے ورثہ دارالاسلام میں نہیں ہیں ۔ وہ اگر ہیں تو دارالحرب میں ہیں ۔ لہذا وہ ہمارے حق میں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ لہذا ان کے حق کی رعایت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔

ہم شروع میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ وصیت

میں ایک تہائی کی قید ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اس
لئے ہمارے نزدیک اس توجیہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

باب الوصی وما یملکه

وصی اس شخص کو کہتے ہیں جس کو وصیت کرنے والا۔ مرتے وقت یا مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ میرے مال میں فلاں فلاں بات کر دینا۔ وصی کے کیا اختیارات ہوتے ہیں۔ اس باب میں ان کو بیان کیا جا رہا ہے۔

وصی کو انکار کرنے کا حق

اگر کسی شخص نے کسی کو اپنا وصی بنایا کہ میرے بعد میرے مال میں ایسا ایسا کر دینا اور وصی نے موصی کی وصیت کو اس کے سامنے قبول کر لیا اور پیٹھ کے پیچھے اس وصیت کو رد کر دیا کہ مجھ سے اس وصیت پر عمل نہیں ہو سکے گا تو اس کا یہ انکار قابل قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ موصی تو وصیت کر کے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا تو اگر وصی کو موصی کی موت کے بعد یا اس کی زندگی ہی میں پس پشت انکار کا حق دے دیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وصی نے موصی کو دھوکہ میں رکھا۔ لہٰذا اس کا اب رد کر دینا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر وصی نے موصِی کے سامنے ہی رد کر دیا تھا

تو یہ رد کرنا صحیح ہوگا۔ کیونکہ موصی کو وصی کی مرضی کے بغیر وصیت کا پابند بنانے کا حق نہیں ہے۔ اور نہ اس میں کوئی دھوکہ ہے۔ کیونکہ وصی کے انکار کر دینے کے بعد موصی اس کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو اپنا وصی بنا سکتا ہے۔ اور اگر وصی نے موصی کے سامنے نہ وصیت کو قبول کیا تھا نہ رد کیا تھا تو موصی کے مرنے کے بعد اسے اختیار ہوگا۔ چاہے اسے قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرے یا وصیت کو رد کر دے۔

اگر وصی نے موصی کی وصیت کو اس کی زندگی میں قبول نہیں کیا تھا اور موصی کے مرنے کے بعد اس نے انکار کر دیا کہ میں اس ذمہ داری کو قبول نہیں کر سکتا۔ لیکن بعد میں اس کی رائے تبدیل ہو گئی اور اس نے قبول کر لیا تو اگر اس کے اولاً انکار کے بعد حاکم وقت نے اسے وصیت سے خارج نہیں کر دیا تھا اور حاکم وقت کے فیصلہ سے پہلے پہلے اس نے قبول کر لیا ہے تو ایسا کر لینا جائز ہے۔ لیکن اگر قاضی تک معاملہ پہنچ چکا تھا اور قاضی اس کے انکار کے مطابق کوئی دوسرا انتظام کر چکا ہے تو اب اسے ازسرِ نو قبول کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

کسی نالائق کو وصی بنانا

اگر کسی شخص نے کسی غلام کو یا کافر کو یا فاسق آدمی کو اپنا وصی مقرر کر دیا تھا تو قاضی ایسے لوگوں کو وصی کی ذمہ داری

سے سبکدوش کر کے مناسب آدمی کا تقرر کر سکتا ہے ۔ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ ان تمام صورتوں میں وصیت باطل ہے ۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ وصیت تو صحیح ہے لیکن اسے حاکم وقت کے فیصلہ سے ختم ہو جانا چاہیئے ۔

خود اپنے غلام کو وصی بنانا اگر کسی نے خود اپنے غلام کو وصی مقرر کر دیا اور موصی کے تمام ورثاء، چھوٹے یعنی نابالغ بچے ہیں تو وصیت صحیح ہے یہ مذہب امام ابو حنیفہؒ کا ہے ۔ امام ابو یوسفؒ اس وصیت کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ غلام کو خود اپنے اوپر ولایت نہیں ہوتی ۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو مالک پر مملوک کی ولایت لازم آتی ہے اور یہ قلب مشروع ہے ۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ورثہ جب کہ چھوٹے بچے ہوں تو ان کے مفادات کی حفاظت اسی میں ہے کہ اس کا وصی ہونا جائز تسلیم کیا جائے ۔ علاوہ ازیں اگر مالک اسے کسی کام کے لئے بھیجتا تھا کہ فلاں کام کر آؤ اور وہ کر آتا تھا تو اس کا یہ تصرف صحیح تسلیم کیا جاتا تھا ۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ موصی اسے وصی بنا جائے تو اسے جائز نہ مانا جائے ۔ امام محمد سے دونوں قول مروی ہیں ۔ امام ابو یوسفؒ کے موافق بھی اور امام ابو حنیفہؒ کے موافق بھی ۔ لہٰذا فقہاء نے ان کے قول کو مضطرب قرار دیا ہے ۔ ہمارے خیال میں امام ابو حنیفہؒ کا قول زیادہ

صحیح ہے۔

وصی اگر وصیت کی ذمہ داری پوری نہ کرسکتا ہو

اگرکسی نے ایک ایسے شخص کو اپنا وصی بنا دیا ہے جو وصیت پورا کرنے کا اہل نہیں ہے تو حاکم وقت کو وصی کے ساتھ مزید ایک مناسب آدمی کا اضافہ اپنی طرف سے کر دینا چاہئے اور وصی کو اس کی نا اہلی کی بنار پر معزول نہیں کرنا چاہئے۔ یہ دونوں آدمی مل جل کر موصی کی وصیت پر عمل کریں تاکہ موصی کی وصیت پر عمل بھی ہو جائے کہ اس نے جسے وصی مقرر کیا تھا وہ وصی برقرار ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کا اضافہ حاکم مجاز نے کر دیا ہے تاکہ وصی اپنی نا اہلی کی بنار پر ورثہ کو نقصان نہ پہنچا دے۔ البتہ اگر ثابت ہو جائے کہ وصی خائن ہے اور وہ وصیت میں خرد برد کر رہا ہے تو حاکم مجاز ایسے وصی کو معزول کرسکتا ہے۔ لیکن جب تک ایسی کوئی شکایت نہ ہو اور اس کا کوئی ثبوت نہ بہم پہنچے تو حاکم مجاز کو اسے معزول کرنے کا حق نہیں ہے۔

دو آدمیوں کو وصی بنانا

اگرکسی نے دو آدمیوں کو وصی مقرر کر دیا ہے کہ وہ دونوں اس کی وصیت کو عملی جامہ پہنائیں تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی ایک تنہا کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔ دونوں مل کر ہی تصرف کریں اور امام

ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دونوں میں ہر وصی تنہا تصرف کرسکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ جس انداز سے موصی نے وصیت کی تھی اسی انداز سے وصیت جاری ہونی چاہئے موصی نے وصیت دو آدمیوں کے حق میں اجتماعی طور پر کی ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ لہذا اجتماعی طور پر ہی دونوں کو وصیت میں تصرف کرنے کا حق ہوگا۔ انفرادی طور پر نہیں۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔ کہ کسی کو وصی بنانا ایک طرح کی ولایت ہے۔ اور یہ شرعی وصف ہے جو منقسم نہیں ہوسکتا۔ لہذا دونوں کو انفرادی طور پر وصیت کو عملی جامہ پہنانے کا حق ہے۔ ہمارے خیال میں امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا مذہب موصی کی منشار کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ موصی کسی ایک شخص کو بھی وصی مقرر کرسکتا تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو کچھ سوچ کر ہی وصی مقرر کیا ہے۔ لہذا اس کی منشار پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

البتہ بعض مخصوص معاملات ایسے ہیں کہ ان میں دونوں اوصیاً کا اجتماعی عمل درآمد ضروری نہیں ہے۔ ان میں ہر وصی انفرادی طور پر بھی عمل درآمد کرسکتا ہے۔ مثلاً میت کی تجہیز و تکفین کہ اس میں دونوں کے اجتماعی عمل درآمد کے انتظار میں میت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور میت کے چھوٹے بچوں کے کھانے پینے کا انتظام اور ان کے لئے لباس وغیرہ کی فراہمی کیونکہ اس کے لئے بھی اجتماعی عمل درآمد کے انتظار میں صغیر السن

اولاد کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امانتوں کو واپس کرنا۔ غصب کردہ چیزوں کو واپس کرنا۔ بیع فاسد کے ذریعہ خریدی ہوئی چیزوں کو واپس کرنا۔ اموال کی حفاظت کرنا۔ قرضوں کو ادا کرنا یا متعین وصیت کو نافذ کرنا۔ موصی کے خلاف مقدمات کی جواب دہی کرنا۔ موصی کے لئے اگر کوئی شخص کچھ ہبہ کرے تو اسے قبول کرنا۔ جن چیزوں کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو فروخت کرنا۔ ایسی چیزیں جو ضائع ہو سکتی ہوں انکو جمع اور اکٹھا کرنا۔ کیونکہ ان تمام امور میں اجتماعی عمل کے انتظار میں بیان کردہ امور کے ضائع ہو جانے، خراب ہو جانے یا ورثہ کے مفاد کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔

اگر ایک وصی مر جائے

اگر کسی نے دو شخصوں کو اپنا وصی مقرر کیا ہے مگر قضائے الٰہی سے ان میں سے ایک وصی مر گیا ہے تو حاکم مجاز مر جانے والے کی جگہ ایک دوسرا وصی مقرر کر دے گا۔ کیونکہ موصی کا منشاء ایک وصی کو مقرر کرنا نہیں تھا۔ اس نے دو وصی مقرر کئے تھے۔ لہٰذا حاکم مجاز موصی کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے ایک وصی اور مقرر کر دے جو مر جانے والے وصی کی جگہ لیلے۔

وصی میت کا خلیفہ ہے

کسی شخص نے ایک آدمی کو وصی مقرر کیا اور دوسرے شخص کے لئے اس نے ایک تہائی یا ایک چوتھائی مال کی وصیت بھی کی ہے۔ اور موصی کے مر جانے کے بعد اس نے مال کو تقسیم کر دیا۔ یعنی

یعنی میت نے جس شخص کے حق میں ایک تہائی یا چوتھائی مال کی وصیت کی تھی وہ مال اس کو دے دیا اور باقی مال ورثہ کے لئے رکھ چھوڑا تو وصی کی یہ تقسیم درست مانی جائے گی۔ حتیٰ کہ ورثہ میں سے اگر کچھ لوگ موجود نہیں تھے اور ان کی غیر موجودگی کے عرصہ میں وہ ترکہ جو وصی نے ورثہ کے لئے رکھ چھوڑا تھا اگر ضائع ہوگیا تو یہ ورثہ اس شخص سے مال واپس نہیں لے سکتے جس کے حق میں میت نے وصیت کی تھی اور اور وصی نے ان کے حصہ کا مال اسے ادا کر دیا تھا۔ کیونکہ وصی کی یہ تقسیم صحیح تھی۔ لیکن اگر موصی لہٗ کے حصہ کا مال الگ کر کے وصی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور باقی مال ورثہ میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور موصیٰ لہٗ کے حصّہ کا مال وصی کے پاس ضائع ہوگیا ہے تو اس تقسیم کو صحیح نہیں مانا جائے گا اور موصیٰ لہٗ اپنے حق کیلئے ورثہ کو تقسیم کردہ مال سے مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ وصی میت کا خلیفہ تھا۔ موصی لہٗ کا خلیفہ نہیں تھا۔ ورثہ کی طرف سے نیابۃً اس کے تصرفات صحیح ہیں لیکن موصیٰ لہٗ کی طرف سے اس کے تصرفات صحیح نہیں ہیں۔

وصی کے تصرفات

اگر کسی نے ایک شخص کو وصی مقرر کیا اور اس کے ورثہ میں سے کچھ بالغ ورثاء غائب ہیں اور وصی ترکہ کی کچھ چیزوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت ان غائب بالغ ورثہ کے لئے محفوظ کر لینا چاہتا ہے تو مکان اور زمین کے علاوہ دوسری چیزوں میں ان کا

یہ تصرف جائز متصور ہوگا۔ لیکن مکان، باغ اور زمین وغیرہ میں یہ تصرفات صحیح نہیں ہوں گے کہ مکان، باغ اور زمین کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہیں۔ دوسری چیزوں میں یہ اندیشہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جو ایسی چیزیں ہوں جن کے فروخت کر دینے میں مصلحت ہو اور ان کے ضائع ہوجانیکا اندیشہ ہو ان میں فروخت کر دینے کا تصرف صحیح ہوگا۔ لیکن جو ایسی چیزیں ہوں جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو، ان میں یہ تصرف صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ بالغ اولاد کا مکان، باغ اور زمین وغیرہ میں خود اس کے باپ کے لئے بھی فروخت کر دینے کا تصرف صحیح نہیں تھا تو وصی کا تصرف کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ترکہ میں وصی کا تجارت کرنا

وصی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ مال متروکہ میں وہ تجارت شروع کر دے۔ کیونکہ وصیت کا مقصد تجارت نہیں ہے بلکہ مال متروکہ کی حفاظت ہوتا ہے۔

وصی، نابالغ ورثہ کیلئے دادا پر مقدم ہے

کسی نے اپنی نابالغ اولاد کے مفادات کی حفاظت کے لئے کسی کو وصی مقرر کر دیا ہے۔ لیکن نابالغ کا دادا بھی موجود ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں دادا کا حق مقدم مانا جائے گا کیونکہ باپ کے بعد دادا اپنے پوتوں اور پوتیوں کے حق میں زیادہ شفیق ہو سکتا ہے۔ حتی کہ وہ باپ کی عدم موجودگی میں

اپنے پوتوں اور پوتیوں کا ولی بھی ہوتا ہے ۔حتی کہ فقہاء نے دادا کو اپنے پوتوں اور پوتیوں کا نکاح کر دینے کا حق بھی دیدیا ہے (ہمارے خیال میں نابالغ اولاد کا نکاح کر دینے کا حق دادا کو تو کیا باپ کو بھی حاصل نہیں ہے ۔کتاب النکاح میں اس مسئلہ کو دیکھ لیں) مطلب یہ ہے کہ دادا، باپ کے بعد قریب ترین رشتہ دار ہوتا ہے اور باپ کا واسطہ دور ہو جانے کے بعد دادا اپنے پوتوں اور پوتیوں کے لئے باپ کی جگہ لے لیتا ہے امام شافعیؒ کے نزدیک باپ نے اگر کوئی وصی مقرر کر دیا تھا تو وصی کے مقابلہ میں دادا اپنے نابالغ پوتوں اور پوتیوں کے مال میں تصرفات کا زیادہ حقدار ہوگا ۔لیکن حنفیہؒ کا خیال یہ ہے کہ وصی دادا پر مقدم ہوگا ۔متوفی کو معلوم تھا کہ اس کے بعد اس کے بچوں کا دادا بھی موجود ہے لیکن اس نے اس کے باوجود ایک وصی کو مقرر کیا ہے ۔جو اس کی دلیل ہے کہ متوفی کو اپنے باپ پر پورا اعتماد نہیں تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی اولاد کے مفادات کی حفاظت دادا کے ذریعہ سے کما حقہ نہیں ہو سکے گی اس لئے ایک وصی مقرر کرنے کی ضرورت ہے ۔

ہمارے نزدیک حنفیہؒ کا مسلک زیادہ قرین مصلحت ہے ۔ قرآن کریم نے یتیموں کے مفادات کی حفاظت پر زور دیا ہے ۔جس طرح بھی یتیموں کے مفادات کی زیادہ حفاظت ہو سکے وہی قابل ترجیح ہے ۔

ڈو وصی تیسرے وصی کیلئے گواہی دیں

کسی میت کے دو وصی اگر گواہی دیں کہ میت نے ہمارے ساتھ فلاں (تیسرے) آدمی کو بھی وصی مقرر کیا تھا اور وہ تیسرا آدمی اس کا انکار کرے تو ان ڈو وصیوں کی گواہی تسلیم نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ اس دونوں وصیوں کے متعلق یہ تہمت موجود ہے کہ وہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تیسرے آدمی کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اگر وہ تیسرا آدمی بھی اس کا مدعی ہو کہ مجھے میت نے وصی مقرر کیا تھا تو ان ڈو وصیوں کی گواہی معتبر مانی جائے گی۔ لیکن عدالت سے حاکم مجاز کی توثیق اس کے لئے ضروری ہے۔

ڈو بیٹے گواہی دیں

میت کے ڈو بیٹے اگر شہادت دیں کہ ہمارے باپ نے فلاں آدمی کو ہمارا وصی مقرر کیا تھا اور وہ شخص اس کا انکار کرے کہ میت نے اسے وصی مقرر کیا ہے۔ تو دونوں بیٹوں کی گواہی معتبر نہیں مانی جائے گی کیونکہ اس صورت میں یہ تہمت موجود ہے کہ میت کے بیٹے اپنے ترکہ کی حفاظت کے لئے ایک آدمی کا تقرر کر کے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔

دو وصی نابالغ وارث کیلئے گواہی دیں

اگر کسی شخص نے دو آدمیوں کو اپنا وصی مقرر کیا اور وہ دونوں

وصی میت کے ترکہ میں سے کچھ مال کے سلسلہ میں گواہی دیں کہ میت نے یہ وصیت کی تھی کہ اتنا اتنا مال فلاں نابالغ وارث کو دیدیا جائے تو ان کی یہ شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ نابالغ وارث کے مال میں ان دونوں وصیوں ہی کو تصرفات کا حق ہوگا۔ لہذا یہ تہمت موجود ہے کہ وہ اس مال میں تصرف کرنے کا حق حاصل کرنے کیلئے ایسی شہادت دے رہے ہوں۔ البتہ اگر بالغ وارث کے لئے وہ اس قسم کی شہادت دیں تو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ان دونوں وصیوں کی شہادت قبول کی جائے گی کیونکہ بالغ ورثہ کی صورت میں یہ تہمت نہیں پائی جاتی کیونکہ وصیوں کو بالغ آدمی کے مال میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ تصرفات کا حق نہ سہی مگر اس کی حفاظت کا حق تو وصی کو حاصل ہوگا اور اگر وہ بالغ وارث کہیں غائب ہو جائے تو پھر وصیوں کو تصرفات کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ فقہاء حنفیہ نیز دیگر فقہاء کے نزدیک بھی وارث کے لئے خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ ہو وصیت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ تو فقہاء کے مسلک پر مسئلہ کی صورت ہی کہاں پیش آئے گی۔ اس سے ہمارے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ میت کو ورثاء کے لئے بھی وصیت

کرنے کا حق ہے۔ اور خود فقہائے حنفیہ اس مسئلہ میں میت کے لئے وصیت کو صحیح تسلیم فرمارہے ہیں۔

قرض کی شہادت

دو آدمیوں نے گواہی دی کہ کہ فلاں فلاں دو آدمیوں کا میت کے ذمے ایک ہزار روپیہ قرض تھا اور یہ دونوں آدمی (یعنی قرض خواہ) اُن گواہوں کے لئے گواہی دیں کہ میت کے ذمے ان کا بھی قرضہ تھا تو یہ دونوں شہادتیں معتبر نہیں ہوں گی۔ کیونکہ یہاں یہ تہمت موجود ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان چاروں آدمیوں کی ملی بھگت ہو کہ تم ہمارے حق میں گواہی دینا، ہم تمھارے حق میں گواہی دیں گے۔

لیکن اگر یہ صورت ہو کہ دو آدمیوں نے گواہی دی کہ فلاں فلاں دو آدمیوں کا میت کے ذمہ ایک ہزار روپیہ قرض تھا اور دوسرے دو آدمی گواہی دیں کہ ان گواہوں کا بھی میت کے ذمے ایک ہزار روپیہ قرض تھا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ گواہیاں معتبر ہوں گی۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ یہ گواہیاں بھی معتبر نہیں ہوں گی۔ امام خصافؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی ایک روایت امام ابو یوسفؒ کے مطابق نقل فرمائی ہے۔

اور ابو یوسفؒ کی ایک روایت امام محمد کے مطابق بھی نقل کی ہے۔

اسی طرح اگر دو آدمیوں نے گواہی دی کہ میت

نے فلاں دو آدمیوں کے حق میں ایک تہائی مال کی وصیت کی تھی اور ان دونوں نے جن کے لئے شاہدوں نے گواہی دی تھی یہ گواہی دے دی کہ میت نے ان گواہوں کے لئے بھی ایک تہائی مال کی وصیت کی تھی تو یہ دونوں شہادتیں باطل ہیں ۔کیونکہ دونوں ایک دوسرے کیلئے گواہی دے رہے ہیں ۔گویا دونوں شرکت کے مدعی ہیں ۔ لہذا شہادت قبول نہیں کی جا سکتی ۔کیونکہ تہمت موجود ہے ۔

فقہ القرآن قرآن کریم کی روشنی میں فقہ اسلامی کا انسائیکلوپیڈیا موجودہ دور کے تقاضوں کے پیش نظر مدون کیا گیا ہے ۔

زمانہ تغیر آشنا اور متحرک ہے جو کسی ایک نقطہ پر ساکن نہیں ہے اسلامی معاشرہ ارتقاء پذیر ہے ۔ہمارے تقاضے ہر آن تبدیل ہو رہے ہیں ۔ہماری مروّجہ فقہ بارہ سو سال پہلے ہمارے فقہائے کرام نے (شکر اللہ سعیہم) اپنے دور کے حالات کے مطابق مرتب فرمائی تھی وہ موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تھی اس لیے ضرورت تھی کہ اس کا قرآن کریم کی روشنی میں بھرپور جائزہ لیا جائے اور فقہائے امت کے فیصلوں میں سے جو فیصلہ قرآن کریم کے قریب تر ہو اور ہمارے دور کے تقاضوں کو پورا کر سکے اسے ترجیح دے کر ایک قابل عمل فقہ کو جدید خطوط پر مرتب کیا جائے ۔

شیخ الحدیث پروفیسر مولانا عمر احمد عثمانی نے جن کی قرآن کریم اور سنت نبوی پر گہری نظر ہے اور موجودہ وقت کے تقاضوں کا عمیق شعور ہے فقہ القرآن کے نام سے وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی فقہ کا ایک قابل عمل انسائیکلوپیڈیا مرتب فرما دیا ہے جو ملک کے اہل علم اور علمائے قانون سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے ۔ وفاقی شرعی عدالت اسکی بنیاد پر ایک فیصلہ دے چکی ہے ۔پاکستانی پریس نے بھی شاندار خیر مقدم کیا ہے ۔آپ بھی اس علمی و فکری شاہکار کا مطالعہ فرمائیں اور قرآن کریم کی ابدیت پر اپنے ایمان کو تازہ فرمائیں ۔

باب الوراثة

وراثت کے متعلق آیات ہم اپنی کتاب کی ابتدا میں دے چکے ہیں فلسفۂ وراثت کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغۃ کے حصّہ دوم میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور قرآنی احکام وراثت کے مصالح و حکم اور ان کے فلسفہ پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے شاہ صاحب کے ارشادات من وعن ہدیۂ ناظرین کر دیئے جائیں شاہ صاحب فرماتے ہیں!

مسائلِ میراث کے متعلق اصولی بحث

مسائل میراث کی بنا چند ایک اصولی باتوں پر ہے۔ من جملہ ان کے یہ کہ استحقاق میراث کے بارے میں مصاحبتِ طبعی اور تناصر و تعاون کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کیوں کہ ان باتوں کا لحاظ کرنا گویا انسان کا طبعی مذہب ہے۔ حقوق میراث کی بنا ہنگامی اتفاقات پر نہیں رکھی جاتی جنکی تعیین اور ضبط میں لانا ناممکن ہے۔ نوامیس کلیہ کے لئے ان کو اساس قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ

بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ "اور اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی کتاب میں بعض قرابت دار بعض دوسرے قرابت داروں سے زیادہ مستحق ہیں" اسی اصول کی بنا پر حقوق میراث کو نسبی رشتہ داروں تک محدود رکھا گیا ہے نیز صرف زوجین کو میراث کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے وجوہ موجود ہیں جو قرابت داروں کے حلقہ میں ان کے شامل کئے جانیکے مقتضی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تدبیر منزلی کے نظام کو بہتر طریقہ پر قائم رکھنے کے لئے ان کا باہمی تعاون نہایت ضروری ہے۔ نیز ان کو قرابت داروں کے زمرہ میں شامل کرنے سے ان کو اس بات کی ترغیب وتحریص دلانی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے نفع نقصان کو بعینہ اپنا نفع نقصان خیال کریں۔

ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ شوہر اپنی بیوی کی ضروریات کا عمر بھر کفیل رہتا ہے۔ اس کا مال اسی کی حفاظت اور نگرانی میں رہتا ہے اور وہ اس کو ہر طرح سے امین سمجھتا ہے، ان باتوں کو سامنے رکھ کر شوہر کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا غیر معقول نہیں کہ میری بیوی اگر مرجائے تو اس کا سارا مال یا اس کا بعض حصہ میرا حق ہے۔ اس بنا پر وہ مناقشہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ شرع نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ اس کو بیوی کے ترکہ سے نصف یا ربع کا مستحق قرار دیا جس سے اس کی اشک شوئی اور اس کے جھگڑا کھڑا کرنے کا سدّباب مقصود ہے۔ زوجین کے باہمی شدید اتصال کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب

بیوی کی اپنے شوہر سے اولاد ہوتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ وہ بچے اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتے اور اسی کے بال بچے" شمار کیئے جاتے ہیں کیونکہ اس کا نسب انہی سے چلتا ہے اور اس کے منصب کو وہی سنبھالتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اپنی ماں سے ان کا جو رشتہ ہے وہ نہایت قریبی رشتہ ہے اور کبھی منقطع ہونے والا نہیں اس لئے بیوی کو اپنے شوہر سے علیحدہ قوم کا نہیں شمار کیا جا سکتا، مگر وہ بھی گویا اپنے شوہر کی قوم اور اس کے قبیلے ہی کی ایک فرد ہوتی ہے۔ من جملہ وجوہ اتصال کے ایک یہ بھی ہے کہ بیوی پر شوہر کا یہ حق ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر میں عدّت کے دن بسر کرے اس حالت میں اس عورت کے معاش کا اس کی اپنی قوم سے کوئی بھی کفیل نہیں ہوتا اس لئے یہ ضروری ہے کہ شوہر کے مال سے اس کے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے لیکن یہ تعین کرنا تو ممکن نہیں کہ مثلاً اس کو اتنی رقم دی جائے۔ کیونکہ ترکہ کی مقدار بعض اوقات بہت کم ہوتی ہے اور اس لیئے وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لئے یہی مناسب اور موزون ہے کہ اس کے ترکہ کا ایک "جزو شائع"

لہ جزو شائع اس حصہ کو کہتے ہیں کہ اس تمام چیز میں سرایت کیئے ہو جسکا وہ حصہ ہے۔ مثلاً کہیں کہ اس گھر یا مکان کی تہائی۔ اسکے یہ معنے ہیں کہ اس گھر یا مکان کے ہر ایک جزو کا تیسرا حصہ مثلاً کسی کا حق ہے اور بقیہ ⅔ حصہ دوسرے مالک کا حق ہے اسکے مقابلہ کا لفظ جزو معین ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا صورت میں یہ کہا جائے کہ اس گھر کی ڈیوڑھی یا کوئی (باقی مضمون اگلے صفحہ پر

اس کا حق مقرر کیا جائے جس طرح کہ شرع نے رُبع اور ثمن اس کا حصہ مقرر کیا ہے۔ من جملہ ان اصول کے ایک یہ کہ قرابت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قرابت وہ ہے جو حسب اور منصب میں شرکت کی مقتضی ہے اور یہ کہ وہ دونوں ایک ہی قوم اور قبیلہ کے افراد ہوں اور ان کا درجہ آپس میں مساوی ہو۔ دوسری قرابت یہ ہے کہ دونوں حسبؔ نسب میں شریک نہ ہوں اور ان کی حیثیت بھی ایک نہ ہو لیکن ان کا یہ رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ رفق و ملاطفت اور محبت کا برتاؤ کرنے کا مقتضی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقسیم ترکہ کا اختیار خود میت کو حاصل ہوتا تو وہ اس قرابت کا حق ادا کرنے سے نہ چوکتا۔ قسم اوّل کی قرابت کو موخّر الذکر قسم پر ترجیح دینا لازم ہے کیونکہ عرب اور عجم سب میں یہ خیال شائع و ذائع ہے کہ کسی شخص کی ثروت اور اس کے منصب کا اپنی ہی قوم سے نکال کر دوسری قوم اور قبیلہ کی طرف منتقل کرنا بے انصافی اور ظلم ہے۔ ایسی بات سن کر انکا غصہ بھڑک اٹھتا ہے اور وہ سخت نفرت اور ملامت کا اظہار کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے کسی شخص کا منصب اور اس کا ترکہ کسی فرد کو دیا جائے جو اس کی اپنی قوم کا ہے اور اس کا قائم مقام ہے تو اس کو وہ بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں اور اس کو

(بقیہ پہلے صفحہ کا) خاص کرہ بطور مثال زید کا حق ہے اور باقی گھر عمر یا بکر کا ہے۔

لہ حسب کے معنے ہیں خاندانی شرافت۔

عین عدل و انصاف سمجھتے ہیں ۔ یہ ذہنیت گویا ان کی فطرت میں داخل ہے اور ان کے دلوں سے اس کا خیال نکلنا ناممکن ہے ۔ البتہ ہمارے زمانہ میں چونکہ حسب نسب کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی اور ان کا باہمی تعاون اور تناصر نسب کی بنا پر نہیں ہوتا ۔ اس لئے لوگوں کی وہ ذہنیت باقی نہیں رہی ۔

بایں ہمہ دوسری قسم کی قرابت کو بھی نظر انداز کرنا قرین صواب نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود یکہ ماں کا رشتہ اپنے بیٹے کیساتھ بہت قریب کا ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی اس کی اولاد کو سخت تاکید کی گئی ہے پھر بھی میراث میں اس کا حصہ بیٹی اور بہن کے حصہ سے بہت کم ہے جس کا فلسفہ یہی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی قوم اور اس کے قبیلے سے نہیں ۔ اس کے حسب (خاندانی شرافت) اور جاہ ومنصب میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور نہ ہی اس کے بعد وہ اس کی قائم مقام ہو سکتی ہے چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بعض اوقات بیٹا ہاشمی ہے اور ماں حبشن یا بیٹا قریشی ہے اور ماں عجمی یا بیٹا خاندان خلافت کا چشم وچراغ ہے اور اس کی ماں ایک دنی الاصل بلکہ متہم عورت ہے ۔ برخلاف اس کے بیٹی اور بہن میت کی اپنی قوم سے ہیں اور اس کے منصب (پوزیشن اور حیثیت) میں اس کے ساتھ شریک ۔ ماں کی طرف سے بھائی بہن جب میراث کا حصہ لیتے ہیں تو مجموعہ کے طور پر بھی ان کا حق ایک تہائی سے قطعاً زائد نہیں ہوتا ۔ اس کی بعینہ وہی مذکورہ بالا وجہ ہے ، مثلاً ایک

ایک شخص خود تو قریش سے ہے لیکن اس کا اخیافی (ماں جنا) بھائی بنی تمیم سے ہے۔ ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ دونوں قبائل میں عداوت پیدا ہو کر جنگ چھیڑ جاتی ہے۔ ایک بھائی قریش کے لئے تلوار اٹھاتا ہے اور دوسرا بنی تمیم کی نصرت وحمایت پر کمربستہ نظر آتا ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر کوئی بھی اس بات کو قرینِ عدل وانصاف نہیں سمجھتا کہ ایک کو دوسرے کا قائم مقام خیال کیا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس بیوی نے بھی جو چنار ایک موکد وجوہ کی بنا پر (جن کی تفصیل ابھی مذکور ہوئی) نسبی رشتہ داروں کے ساتھ ملحق سمجھی جاتی ہے۔ شوہر کے ترکہ میں بہت کم حصہ پایا (کیونکہ ہر چند اس کو شوہر کے ساتھ اتصال حاصل ہے پھر بھی وہ حقیقۃً اس کی قوم سے نہیں) اور جب ان کی تعداد ایک سے زائد ہو تب بھی وہی ایک حصہ سب کو بانٹ دیا جاتا ہے اور ان کی خاطر دوسرے وارثوں کے حصہ میں مطلق کمی نہیں کی جاتی، کیونکہ جب وہ دوسرا شوہر کر لیتی ہے تو پہلے شوہر سے اس کا تعلق کُلیّۃً منقطع ہو جاتا ہے۔

اصول میراث کا خلاصہ ذوی الفروض وغیرہ کے وجوہ استحقاق

خلاصہ یہ کہ حق میراث کا دار و مدار تین باتوں پر ہے۔

(۱) کوئی شخص میت کی شرافت نسبی اور اس کے جاہ ومنصب میں یا جو کچھ بھی اسی قبیل سے ہے اس کا قائم مقام ہو۔ ان کی

وجہ یہ ہے کہ انسان طبعاً (عمر بھر) اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جب وہ مرے تو کوئی اس کا قائم مقام ہو۔

(۲) خدمت اور ہمدردی وغم خواری یا ملاطفت اور شفقت اس بات کی مقتضی ہو کہ اس کو حق میراث عطا کیا جائے۔

(۳) وہ قرابت جو ان دونوں معانی پر مشتمل اور دونوں وجوہ کی جامع ہو۔ اب زیادہ تر تو اسی نوعِ ثالث کو مقدم سمجھا جاتا ہے جس کا کامل مظنّہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو شجرۂ نسب کے عمود کی کڑی ہو۔ مثلاً باپ دادا اور پوتا۔ ان کو میّت کی میراث کا سب سے زیادہ حق حاصل ہے لیکن وضع طبعی یہ ہے کہ بیٹا باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ تمام دُنیا کا نظامِ بقاء اُسی پر قائم ہے۔ ایک پشت کے گذر جانے پر دوسری پشت اس کی بجائے آبادئ عالم کا باعث ہوتی ہے۔ سب لوگ اسی امید پر جیتے اور اس کوشش اور فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی اولاد و احفاد ان کی قائم مقام ہو۔ برخلاف اس کے باپ کا اپنے بیٹے کی جگہ لینا وضع طبعی نہیں اور نہ ہی کسی کے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ میرا باپ میرا قائم مقام ہو چنانچہ اگر خود انسان کو اپنے مال میں تصرّف کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ اپنے باپ کی نسبت بیٹے کو بہت زیادہ مستحق سمجھے گا اور یہی چاہے گا کہ میرے مال کا وہی مالک ہو (یا کم از کم اس کو سب سے بڑا حصّہ ملے) بنا بر آں سب اقوامِ عالم میں یہی بات رائج اور مسلّم ہے کہ اولاد کو آباؤ اجداد پر مقدّم رکھا جائے۔ باپ بیٹے سے

دوسرے درجہ پر انسان کے سگے بھائی اس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں یا جو انہی کی طرح آدمی کے لئے بمنزلہ دست و بازو کے ہوں اور ایک باپ سے ان کی نسل چلی ہو اور ان کا نسب اور خاندان شرافت ایک ہو۔ ہمدردی و غم خواری یا ملاطفت اور شفقت کے لحاظ سے انہی کو مستحق سمجھا جا سکتا ہے جن کا میت سے قریبی رشتہ ہے۔ مثلاً ماں اور بیٹی جو اسی قبیل سے ہوں۔ یعنی شجرۂ نسب کے عمود کی کڑیاں ہوں۔ علاوہ ازیں بیٹی میں بھی بیٹے کی طرح فی الجملہ قائم مقام ہونے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ بیٹی کے بعد دوسرا درجہ بہن کا ہے اور وہ بھی اس طرح سے میت کی قائم مقام ہے۔ ان رشتوں کے بعد میاں بیوی کا تعلق ہے اور پھر اس سے دوسرے درجہ پر ماں جائے بھائی بہن ہیں۔ حمایت اور معاونت یا قائم مقام ہونے کے معنے عورتوں میں نہیں پائے جاتے۔ بسا اوقات ان کی شادی دوسری قوم یا قبیلہ میں ہوتی ہے اور اسی قوم یا قبیلہ میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ البتہ بیٹی اور بہن کو اس عموم سے مستثنےٰ قرار دیا جا سکتا ہے، تاہم قائم مقام ہونیکی نوعیت ان میں کمزور ہے (اور اس لیے چنداں درخور اعتنار نہیں) ہاں رفق و ملاطفت اور ہمدردی و شفقت کو سبب استحقاق قرار دیا جائے تو یقیناً یہ حیثیت ان میں کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کا مظنّہ وہی ہیں جن کا میت سے قریبی رشتہ ہے۔ مثلاً ماں اور بیٹی، بہن کو بھی اسی نوع میں داخل سمجھا جا سکتا

ہے لیکن جن کا رشتہ دور کا ہے۔ ان کو اس صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پھوپی خواہ اپنی ہو یا باپ کی، سہ گانہ وجوہ استحقاق میں سے پہلی وجہ بیٹے اور باپ میں کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد بالترتیب بھائیوں اور چچوں کا درجہ ہے۔ وجوہ استحقاق کی دوسری وجہ باپ میں پورے طور سے موجود ہے۔ اس کے بعد حسبِ مراتب میت کے بیٹے اور اس کے اعیانی[1] اور اخیافی بھائیوں میں بھی یہ معنے پائے جاتے ہیں۔ رشتہ وہی معتبر ہے جو قریب کا ہو۔ دور کے رشتہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی بنا پر پھوپی کو چچا کی طرح نہیں سمجھا گیا کیوں کہ چچا تو آدمی کے حقوق کی حمایت کرتا ہے لیکن پھوپھی اس قابل نہیں۔ پھر رشتہ میں بھی اس کو وہ قرب حاصل نہیں جو بہن کو ہے۔ من جملہ اصولِ وراثت کے ایک یہ ہے کہ مرد کو عورت پر ترجیح دی جاتی ہے بشرطیکہ وہ دونوں ایک ہی درجہ میں ہوں۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ حقوق کی حفاظت اور حمایت مردوں ہی کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ مردوں کو کئی ایک موقعوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور وہ ہمیشہ مصارف کے

---

[1] جو بھائی بہن ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں ان کو اعیانی کہتے ہیں۔ جن کا باپ ایک ہو اور ماں الگ الگ ہو۔ وہ بہن بھائی علاتی کہلاتے ہیں برخلاف اس کے جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ ہوں، وہ اخیافی کہلاتے ہیں۔

کے زیرِ بار رہتے ہیں۔ اس لئے مناسب اور قرین صواب یہی ہے کہ میراث کا جو بمنزلہ مال مفت کے ہے انہی کو زیادہ مستحق سمجھا جائے۔ برخلاف اس کے عورتیں (خرچ تو بھلا کیا کریں گی از دست وہ تو) اپنے شوہروں اور باپ بیٹے پر اپنا بوجھ ڈالتی ہیں۔ کلام مجید کی اس آیت میں یہی اشارہ ہے
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ مردوں کو عورتوں کا نگراں ہونے اور ان کی خبر گیری کرنے والوں کی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالی نے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں"۔

ابن مسعود اس مسئلہ کے بارے میں جس میں میّت کے والدین رہ جائیں اور اس کی اولاد نہ ہو فرماتے ہیں "خدا نہ کرے کہ میں ماں کو باپ پر ترجیح دوں" باپ کے لئے اتنی فضیلت کافی ہے کہ اس کو بیک وقت صاحب فرض (جس کا میراث میں حصّہ مقرر ہوتا) اور عصبہ[۱] قرار دیا ہے۔ اس کو دگنا حصّہ دینے کی اسی لئے ضرورت نہیں۔ ایسا کرنا دوسرے وارثوں کے حقوق پر دست

---

[۱] عصبہ ان نرینہ رشتہ داروں کو کہتے ہیں جن کا میراث میں حصہ مقرر نہیں جن کا حصہ مقرر ہے ان کو ذوی الفروض کہتے ہیں، اب اگر یہ لوگ اپنا حصہ لے لیں اور ترکہ بچ رہے یا کسی میت کے ذوی الفروض سرے سے نہ ہوں تو اسکے مستحق عصبہ ہیں جو الاقرب فالاقرب کے اصول پر مستحق ہوتے ہیں۔

درازی یا کم ازکم ان کی ناقدر شناسی ہوگی۔ ماں جنے بھائی چونکہ بلحاظ نسب کے دوسری قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے باوجود مرد ہونے کے بھی ان سے یہ توقع نہیں کہ وہ ایسے بھائی کی حمایت کے فرائض ادا کریں گے جو دوسری قوم سے ہے۔ اس بنا پر ان کے اور ان کی بہنوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا بالفاظ دیگر مرد کو عورت پر ترجیح دینے کا اصول ان پر حاوی نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں چونکہ ان کی وجہ قرابت صرف ماں کا رشتہ ہے، اس لئے ان سب بھائی بہنوں کو عورت کی حیثیت دی گئی۔

استحقاق وراثت کا ایک اور اصول

من جملہ اصول وراثت کے

ایک یہ ہے کہ جب ایک ہی رتبہ میں بہت سے وارث جمع ہوجائیں تو یہ ضروری ہے کہ حق میراث کو ان سب میں برابر تقسیم کر دیا جائے۔ کیوں کہ کسی کو بھی دوسرے پر تقدم حاصل نہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے اور اگر ان کے مراتب مختلف ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) یا تو ان سب پر ایک ہی اسم کا اطلاق ہوگا اور سب کی حیثیت ایک ہوگی۔ اندریں صورت قاعدہ یہ ہے کہ اقربیت کا لحاظ رکھا جائے جو زیادہ قریب ہو وہ اس کو کلیتہً محروم کر دیتا ہے جس کا قرب اس سے کم ہو۔ کیوں کہ توارث کی بنا تعاون

کی ترغیب و تحریض دلاتا ہے اور قرابت و تعاون میں سب ہی برابر ہیں۔ مثلاً اولاد الام یعنی اخیافی بھائیوں میں یہ اشتراک پایا جاتا ہے کہ وہ سب اس قابل ہیں کہ ان کیساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کیا جائے۔ اگر وہ سب میت کی نرینہ اولاد ہے تو ان سب میں یکساں طور پر قائم مقام ہونے کی حیثیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح سب عصبہ اس بات میں برابر ہیں کہ وہ آدمی کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔ اب قرینِ مصلحت یہی ہے کہ ان سب کو مستحق میراث ہونے کا امتیاز بخشا جائے۔ تاکہ ہر ایک اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھے اور ذمّہ داری کے فرائض ادا کرنے کی صورت میں وہ مستوجبِ ملامت ہو۔ لیکن یاد رکھو نفس استحقاق ہی کو امتیاز کا موجب خیال کیا جاتا ہے حِصص کی مقدار میں کمی بیشی کو ناقابل التفات سمجھا گیا ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ سب پر ایک ہی اسم کا اطلاق نہ ہوسکے اور ان کی حیثیتیں مختلف ہوں۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جو کوئی ان میں سے اللہ تعالیٰ کے علم میں انفع ہونے کا مظنّہ غالب ہے وہ اپنے سے کمتر درجہ رکھنے والے کو کلّیۃً محروم نہیں کرتا بلکہ اُس کے حصۂ میراث کو کم کر دینے کا باعث ہوتا ہے۔

تعیین حِصص کا اصول اور آیات متعلقہ فرائض کی تشریح

منجملہ اصول وراثت کے ایک یہ ہے کہ جو حصّے مقرر کیے جائیں وہ کل ترکہ کی واضح

کسر ہو جس کو سرسری نظر سے معلوم کیا جا سکے اور تدقیق حساب کی ضرورت نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں یہی اشارہ ہے کہ: "ہم ایک ان پڑھ قوم ہیں ہمیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا" اس حدیث کا یہی مفہوم ہے کہ عام مکلفین کو کوئی ایسا حکم نہ دیا جائے جس میں دقیق حساب کی ضرورت پڑے۔ حصص کی تعیین کے بارے میں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی کمی بیشی واضح طریقہ پر دکھائی جائے چنانچہ دو مختلف حصوں کی کمی بیشی بادی النظر میں سامنے آجائے اور محتاج غور نہ ہو۔ انہی وجوہ کی بناء پر شرع نے حصص میراث کے بارے میں کسور میں سے دو قسم کے مجموعے اختیار کیے۔

ایک مجموعہ (الف) $\frac{2}{3}$ اور $\frac{1}{3}$ اور $\frac{1}{6}$ کا ہے۔

دوسرا مجموعہ (ب) $\frac{1}{2}$ اور $\frac{1}{4}$ اور $\frac{1}{8}$ پر مشتمل ہے۔

ان دونوں مجموعوں کا مخرج اصلی اول ترین اعداد (یعنی ۲، ۳ کا عدد) ہیں۔ ہر ایک مجموعہ میں تین مراتب ہیں اور ان میں تضعیف و تنصیف کا تناسب ہے (ایک سرے سے شروع کرو تو دو گنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے سرے سے ابتدا کرو تو وہ ایک دوسرے کے نصف ہیں) اس سے فوراً ایک حصے اور دوسرے حصے کا تفاوت بیّن اور نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔ پھر یہ کہ ایک مجموعہ کی کسور کو دوسرے مجموعہ کی کسور سے نسبت دی جائے تو کئی ایک مناسبات ظہور میں آتی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی حصہ نصف سے

زاید ہو لیکن بہر حال کُل کا جزو ⅔ سے اور کوئی بہتر صورت تصور میں نہیں آتی اسی طرح کوئی ایسی کسر جو نصف سے کم اور چوتھائی سے زاید ہو ⅓ کی کسر ہو سکتی ہے ⅕ اور ⅙ کو حصص میراث میں شامل نہیں کیا کیونکہ ان کی کسر نکالنے میں ذرا دِقت ہے اور تضعیف اور تنصیف بھی محتاجِ تعمق ہے۔ کلام مجید کا یہ رکوع فرائض کے بارے میں (شافی و وافی ہے)۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (الی آخرہ)

بیٹے کا حصہ بیٹی سے دوگنا مقرر فرمایا جس کا فلسفہ اس آیت میں ہے، الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ الخ مع تشریح گذر چکی ہے، ایک بیٹی کو نصف میراث کا مستحق قرار دیا گیا۔ کیونکہ اگر بیٹا ہوتا تو وہ سب مال لے جاتا۔ اس لئے بیٹی کا نصف ترکہ لینا وہی: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ط کے اصول پر مبنی ہے۔ اگرچہ اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم مذکور ہے لیکن اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ دو بیٹیوں کا استحقاق بھی اس سے کم نہیں۔ ان کو دو تہائی کا مستحق قرار دینے کی یہ توجیہہ ہے، کہ اگر ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہو تو بیٹی کو ایک تہائی ملتی ہے۔ اس لئے بیٹے کی بجائے دوسری اس کے ساتھ بیٹی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایک تہائی سے کم ملے سب بیٹیاں ہوں تو باقی ایک تہائی عصبہ کے لئے محفوظ رہتی ہے کیوں کہ

عصبہ کے اور بیٹوں کے حقوق معاونت کی وجہ سے یکساں ہیں اس لیئے وہ ایک دوسرے کو محروم نہیں کر سکتے ۔ اتنی بات ضرور ہے کہ میت بیٹیاں چونکہ اس کے شجرہ نسب کے عمود کی کڑیاں ہیں اس لئے حکمت تشریعیہ کا اقتضا یہی ہے کہ ان کو زاید حصہ دیا جائے (ص ۵۱۰ تا ۵۱۸ حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم اردو ترجمہ مولانا عبد الرحیم پشاوری مرحوم ناشر قومی کتب خانہ لاہور)

حضرت شاہ صاحب کے اس طویل اقتباس سے واضح ہے کہ وراثت کا مبنیٰ تین امور ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر قرآن کریم نے وراثت کے حصّے مقرر فرمائے ہیں ۔ جو مختصراً یہ ہیں ۔

(۱) شرف ومنصب میں میت کا قائم مقام ہونا اور اسکی جگہ لے لینا ۔

(۲) خدمت ، شفقت ، ہمدردی ، مواسات اور نرمی وغیرہ ۔

(۳) میت سے قرابت اور رشتہ داری کا تعلق ۔

ان میں صرف ایک بنیاد یعنی قرابت اور رشتہ داری ایک ایسی بنیاد ہے جو ہر صورت اور ہر حال میں علی حالہ قائم رہتی ہے باپ ، ماں بھائی بہن اور دیگر اعزا ہر حال میں باپ ، ماں ، بھائی بہن اور عزیز و قریب ہی رہتے ہیں ۔ ان میں آپ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے ۔ لیکن دوسری جو دو بنیادیں ہیں ، ان کی صورت یہ نہیں ہے ۔ کوئی بیٹا اس کی صلاحیت رکھتا ہے کہ

باپ کی جگہ لے سکے اور اس کا قائم مقام ہو سکے۔ دوسرا بیٹا اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ نیز ایک بیٹا زیادہ خدمت گذار فرمانبردار، وفا شعار ہے لیکن دوسرے بیٹے کی یہ صورت نہیں ہے۔ بعض بیٹے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہایت نافرمان، ماں باپ کو اذیت دینے والے ہوتے ہیں جن سے ماں باپ کا دل بیزار ہوتا ہے۔ آئے دن اخبارات میں اس قسم کے اعلانات شائع ہوتے رہتے ہیں کہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کو عاق کر دیا ہے۔ اسے میرے ترکہ میں سے کچھ نہ دیا جائے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بیٹوں نے باپ کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا اور بیٹی نے باپ کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور کما حقہ خدمت کی اور ہر طرح سے باپ کا خیال رکھا۔ یہ صحیح ہے کہ عام صورت حالات یہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد، مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

حق تعالےٰ نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں۔ اس سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ آدمی کے چار بیٹے ہیں تو ماں باپ کو چاروں بیٹوں سے یکساں خدمت، راحت، شفقت و مواسات میسر نہیں آتی۔ ایک بیٹا زیادہ خدمت کرتا ہے۔ دوسرے اتنی خدمت نہیں کرتے۔ ایک بیٹا اپنے باپ کا زیادہ مزاج شناس ہے۔ دوسرے بیٹوں کا یہ حال نہیں ہے ایک بیٹے یا بیٹی سے

ماں باپ کو زیادہ نفع پہنچتا ہے۔ دوسرے بیٹوں اور بیٹیوں سے اتنا فائدہ نہیں پہنچتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تین بیٹے بڑے ہو چکے ہیں۔ لیکن پڑھکر وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ باپ نے ان کی شادی بیاہ بھی کر دیا ہے۔ لیکن چوتھا بیٹا ابھی نابالغ ہے۔ اس کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔ اس کا شادی بیاہ بھی نہیں ہوا۔ وہ ماں باپ کا محتاج ہے۔

ایسی صورتیں اس دنیائے آب گل میں برابر پیش آتی رہتی ہیں۔ انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسا تو بکثرت ہوتا ہے کہ آدمی کی دو بیویاں ہیں۔ ایک صاحب اولاد ہے۔ اس کے بچے اس کا بوجھ اٹھانے کے لئے موجود ہیں اور دوسری بیوی کے اولاد نہیں ہے۔ وہ بالکل ہی بے سہارا ہے یا ایک بیوی کے بچے جوان ہیں وہ کمانے دھمانے کے قابل ہیں۔ لیکن دوسری بیوی کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو ابھی اکتساب رزق کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیویوں کے حالات یکساں نہیں ہیں لیکن ایسے مستثنیات کے لئے قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ قانون تو عام حالات کو سامنے رکھ کر ہی بنایا جا سکتا ہے

وصیت کی ضرورت

ان مشکلات کا حل قرآن کریم نے وصیت کی صورت میں رکھا ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ

تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ○ (۲/۱۸۰)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی ہے اور وہ اپنے بعد مال و متاع کچھ چھوڑنے والا ہو، تو چاہیئے کہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے اچھی وصیت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

لہذا قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسے خصوصی حالات میں وصیت کے حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضرورت مند ورثاء کے لئے خصوصی وصیت کر کے مناسب انتظام کر جائیں کیونکہ جو کچھ مال و متاع وہ چھوڑ رہے ہیں، ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں محنت و مشقت کر کے اسے کمایا ہے اور جب تک ان کے جسم میں جان ہے اور سانس آرہا ہے وہ اپنے مال و متاع کے مالک و مختار ہیں۔ لہذا جن کا وہ مال ہے اسے انہی کی مرضی کے مطابق منتقل ہونا چاہیئے حضور اکرم کا ارشاد ہے کہ۔

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ خَاطِرِهٖ۔

کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی دلی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

عمومی قوانین خصوصی حالات کے مطابق نہیں بنائے جاتے اور نہیں بنائے جا سکتے وہ عمومی حالات کے مطابق ہی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن خصوصی حالات کی رعایت بھی رکھی گئی ہے، یعنی ان کے لئے وصیت کا قانون ہے،

وصیّت کی اہمیت وصیت کے باب میں ہم نے اس پر تفصیل سے بحث کر دی ہے۔ اسے ملاحظہ فرما لیا جائے لیکن یہاں ہم چند باتوں پر متنبہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

اول تو یہ کہ قرآن کریم نے وصیت کے حکم کو وراثت کے احکام پر مقدم کیا ہے چنانچہ وصیت کا حکم سورہ بقرہ میں آیا ہے جو قرآن کی دوسری سورت ہے اور وراثت کے احکام سورۂ نساء میں آئے ہیں جو قرآن کریم کی چوتھی سورت ہے۔

دوم یہ کہ وراثت کے احکام بیان فرماتے ہوئے حق تعالیٰ نے بار بار اس فقرہ کو دہرایا ہے۔ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ۔ یعنی یہ حکم میت کی وصیت کو پورا کر لینے اور قرض کو ادا کر لینے کے بعد نافذ ہوگا۔

سوم یہ کہ آیت وصیت کے الفاظ اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نظر میں اس حکم کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ آیت کی ابتداء ان الفاظ سے فرمائی گئی ہے کُتِبَ

عَلَیْکُمْ (تم پر ذیل کی بات فرض کر دی گئی ہے) اور آیت کے خاتمہ پر پھر تاکید مزید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (تقویٰ شعار لوگوں پر یہ حکم قطعاً واجب العمل اور حتمی ہے) پھر دوسری آیت میں بعد والوں کو تاکید کر دی گئی ہے کہ وہ میت کی وصیت میں کسی قسم کی تبدیلی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ اگر میت نے وصیت میں کوئی زیادتی کر دی ہے یا کسی بے انصافی کا مظاہرہ کیا ہے تو قضاۃ اور حکام کو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اصلاح کر دیں۔ اصلاح کی دونوں صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ میت کی وصیت میں ناانصافی کی بات کی حکماً تصحیح کر دیں۔ دوسری یہ کہ ورثہ کو سمجھا بجھا کر تصحیح پر راضی کر لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ شان ایسے احکام کی ہرگز نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی جو صرف چند دنوں کے لئے عارضی طور پر نافذ کئے جا رہے ہوں اور مختصر عرصہ کے بعد انھیں منسوخ کیا جاتا ہو۔ حق تعالیٰ کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ حکم جو ہم دے رہے ہیں یہ چند ایام کے بعد منسوخ ہو جائیگا۔ لہٰذا اس نے لاعلمی کی وجہ سے اس کو اپنے الفاظ میں اتنی اہمیت دیدی۔ قرآن کا طرز بیان اور اس کے الفاظ زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہونے والا نہیں تھا۔

فقہاء کا نقطۂ نظر

اس ضمن میں ہمارے فقہائے کرام کا

نقطۂ نظر یہ ہے کہ وصیت کا حکم ابتداءِ اسلام میں نافذ العمل تھا۔ لیکن جب میراث کی آیتیں نازل ہوگئیں اور قرآن کریم نے ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے تو وصیت کا حکم ختم ہوگیا۔ اب متوفی ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا۔ اور یہ وصیت بھی غیر ورثاء کے لئے ہو سکتی ہے۔ ورثاء کے لئے نہیں ہو سکتی۔ جبکہ وصیت کی اس آیت میں والدین اور اقرباء کے لئے وصیت کی فرضیت بیان فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا اس آیت کریمہ کو منسوخ ماننے کے علاوہ انھیں اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بظاہر وصیت کے سلسلہ میں عام فقہاء کے ہم خیال ہیں چنانچہ "مسائل میراث کے متعلق اصولی بحث" سے پہلے "میراث کے مسائل نازل ہونے سے پہلے وصیت کا حکم نازل ہوا" کے زیر عنوان حضرت شاہ صاحبؒ نے وصیت کا حکم منسوخ ہوجانے کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی مراد وصیت کے حکم کے منسوخ ہونے سے وہ کچھ نہیں ہے جو ہمارے عام فقہاء کا خیال ہے بلکہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق شاہ صاحب کی مراد نسخ سے متاخرین کے اصطلاحی معنے نہیں ہوتے بلکہ متقدمین کے لغوی معنے مراد ہوا کرتے ہیں۔ مولانا سندھی مرحوم چونکہ حضرت شاہ صاحب کے مستند شارح تسلیم کیے جاتے ہیں

اس لئے ہم مولانا سندھی کا اقتباس نقل کئے دیتے ہیں ۔
"الفرقان" بریلی (انڈیا) شاہ ولی اللہ نمبر ۱۳۵۹ھ میں وہ فرماتے ہیں کہ

فصل (۷) ناسخ ومنسوخ

قرآن میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ ومنسوخ کی بحث بھی ہے
اہل علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود ومحصور نہیں کرتے ۔ یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہمی مختلف ہیں اس کا اثر قرآن شریف پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملے (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کر کے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے ۔

شاہ صاحب کے رسوخ فی العلم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے نسخ فی القرآن کے مسئلہ کو اطمینان بخش طریقہ سے حل کر دیا ۔ "الفوز الکبیر" میں اس کی مفصل بحث موجود ہے شاہ صاحب نسخ کا لغوی ترجمہ متقدمین کی اصطلاح کو مانتے ہیں۔ متقدمین جب کسی آیت کو منسوخ کہیں گے تو اس سے ان کی مراد کوئی خاص اصطلاحی معنی نہیں ہوں گے ۔ بلکہ لغوی مفہوم جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہی ان کی مراد ہوتا ہے ۔ اگر کوئی مضمون ایک دفعہ مطلق یا مجمل بیان کر دیا جائے اور

دوسرے موقع پر مطلق کی قیود واضح کر دی جائیں۔ یا اجمال کو تفصیل سے بدل دیا جائے تو لغوی طور پر دونوں جگہ کہا جائے گا کہ دوسرے مضمون نے پہلے کو منسوخ کر دیا۔

اس اعتبار سے بے شک قرآن کی آیات میں کثرت سے نسخ موجود ہے مکی سورتوں میں عموماً اصول اور کلیات محقق کیئے جاتے ہیں۔ اور مدنی سورتوں میں ان کی تشریح اور تفصیل آتی ہے۔ ایک قوم کو تدریجی ترقی دینے والا کوئی استاد اس طریق بیان سے بچ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کو جو قطعاً طبعی ہے معیوب نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ اس سے شکوک پیدا ہوتے ہیں، پھر متقدمین کے بعد متاخرینؒ آتے ہیں۔ وہ نسخ کا ایک خاص مطلب معین کر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جیسے تورات کے تفصیلی احکام پر عمل کرنا قرآن کے تفصیلی اوامر کے بعد ممنوع ہے، اسی طرح قرآن میں بعض ایسی آیتیں موجود ہیں جن پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔

یہ اصطلاح فقہاء کے باہمی اختلاف اور تضارب کے بعد پیدا ہوئی۔ شاہ صاحب اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے ——— لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحب کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے۔ قوم کی عام حالت کو مد نظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہل علمؒ پانچسو آیتیں منسوخ مانتے رہے۔ لیکن شیخ جلال الدین

لے پوری بحث کیلئے دیکھو فوز کبیر طبع مجتبائی دہلی از ص۱۷ تا مابعد کا حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

سیوطی اتقان میں بنیس ۲۰ سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے اس بارے میں سیوطی کا مقتدا اور شیخ قاضی ابو بکر (محمد ابن عبداللہ المعروف بہ ابن العربی مالکی (متوفی ۵۴۳ھ) ہے۔ شاہ صاحب مذکورہ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دیکر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی باسانی تطبیق دے سکتا ہے۔ شاہ صاحب صراحۃً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحۃً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہو جاتا۔ اور عامہ اہل علم اس پر

(پچھلے صفحہ ۲ کا مضمون) فوز کبیر کی اصل عبارت حسب ذیل ہے۔
"متقدمین (بنظر اصطلاح خود) عدد آیات منسوخہ بہ پنج صد رسانیدہ اند و اگر نیک بنگاری غیر محصور است۔ اما انچہ باصطلاح متاخرین منسوخ است عدد قلیل بیش نیست لاسیما بحسب توجیہے کہ ما اختیار کردہ ایم۔ شیخ جلال الدین سیوطی کتاب اتقان بعد ازانکہ از بعض علماء انچہ مذکور شد بہ بسط تقریر نمود۔ آنچہ برائے متاخرین منسوخ است بر وفق شیخ ابن عربی تحریر کردہ قریب بہ بست شمردہ فقیر را در اکثر آں بست نظر است الی ان قال۔ قلت وعلی ما حررت لا یتعین النسخ الا فے خمس آیات" فوز کبیر ÷ نور الحق۔

غور کرنا ہی چھوڑ دیتے[1]

اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا اگر اسلوب حکیم پر ان کے بیان کو حمل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہیں ہوگا۔

آیۂ وصیت ان پانچ آیات میں جو سب سے زیادہ مشکل ہے ہم اس کو یہاں مثالاً بیان کر دیتے ہیں

قال الامام ولی اللہ، کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت الآیۃ ۔ قلتُ منسوخۃ بآیۃ یوصیکم اللہ فی اولادکم وحدیث لا وصیۃ لوارث مُبیّنٌ للنسخ ھ الفوز الکبیر ص ۱۸

اگر وارثوں کے ایسے حالات نہ ہوتے جن میں وہ غیر وارث بھی بن سکتے ہیں تو اس کی توجیہ ناممکن ہوتی ۔ والدین خصوصًا ایسی حالت میں ہیں کہ وہ غیر وارث نہیں ہوتے ۔ لہٰذا ان کے حق میں وصیت قطعی طور پر منسوخ ہونی چاہیے ۔ اور آیت مذکورہ بالا میں مکتوبہ وصیت والدین کے لئے ہے اس لئے شاہ صاحب نے آیت مذکورہ کو قطعی طور پر منسوخ مان لیا ۔ مگر میرے شخصی حالات ایسے تھے جن سے مجھے تنبہ ہوا۔

---

[1] قال الامام عبد القاہر البغدادی رحمہ بعض القدریۃ من اھل عصرنا انہ لیس فی القرآن آیۃ منسوخۃ ولا آیۃ ناسخۃ وھو ابومسلم الاصبہانی الخراسانی ھ ص ۲۲۶ (راجع ترجمتہ فی الاعلام لخیر الدین الزرکلی) ؛ محمد نور الحق علوی غفرلہ

میری والدہ غیر مسلمہ میرے ساتھ موجود تھی میں بیمار ہوا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی کہ اگر میں مرجاؤں تو اس بیچاری کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس وقت اس کی جس قدر خاطر تواضع کی جاتی ہے وہ میری وجہ سے ہے۔ میرے مرتے ہی یہ محروم ہوجائے گی۔ اب مجھے وصیت کا مطلب سمجھ میں آیا۔ کہ اگر حالات ایسے درپیش ہوں تو وصیت لازم ہے بنابریں کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت پر عمل کرنے کی ایک صورت نکل آئی اس لئے اس کو منسوخ کہنے کی ضرورت ہی نہیں اطلاق کو تطبیق کی خاطر مقید بشیک کرلیجئے یہ تو فقہ قرآنی کا بہت بڑا وسیع باب ہے۔

علی ہذالقیاس باقی ماندہ چار آیتوں میں تطبیق بہت آسان ہے۔ وہ اولیٰ غیر اولیٰ، عزیمت ورخصت پر عمل کرنے سے حل ہوجاتی ہیں۔

(ناسخ ومنسوخ میں شاہ صاحب کا حکیمانہ طرز)

میں اپنی سمجھ کے موافق شاہ صاحب کے بیان کو ایک حکیمانہ طرز بیان سمجھتا ہوں۔ میں اسے قبول نہیں کرسکتا۔ کہ جس امر پر مجھے تنبہ ہوا۔ شاہ صاحب کی نظر ادھر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اور باقی چار آیتوں کی مثالیں میرے مطلب کی شواہد ہیں وہاں انھیں قواعد سے بآسانی تطبیق ہوسکتی ہے جن کو وہ دوسری آیات میں استعمال کررہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذہنیت عامہ کو منتشر نہ کرنے کے لئے شاہ صاحب نے یہ طریقہ

اختیار کیا ہے اس کی مثال مسوّیٰ[1] میں بھی ایک جگہ ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات غیر مطہر چیز کو شارع مطہر کے درجہ پر رکھدیتا ہے اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز (جس کی تطہیر زیر بحث ہے) نجس ہی نہیں ہے مگر چونکہ دیکھا جاتا ہے کہ نجاست کی نفی سے ذہنیت عامہ ابا کرے گی اس لئے ایک غیر مطہر چیز کو کہدیا جاتا ہے کہ "یطھرہ ما بعدہ"

ماہنامہ الفرقان بریلی کا شاہ ولی اللہ نمبر ص۲۵۵ تا ص۲۵۸۔

---

[1] مسوّیٰ کی عبارت حسب ذیل ہے۔ ان ام ولد لابراھیم بن عبد الرحمٰن بن عوف سالت ام سلمۃ زوج النبی صلعم فقالت انّی امرأۃٌ اطیل ذیلی وامشی فی المکان القذر قالت ام سلمۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطھرّہ ما بعدہ قلت فی المنہاج طین الشارع المتیقن نجاستہ یعفیٰ منہ عما یتعذر الاحتراز عنہ غالبًا ویختلف بالوقت وموضعہ من الثوب و البدن۔ وفی الھدایۃ عن محمد انہ لما دخل الرے ورأے البلوی فی الاوقات افتی بان الکثیر الفاحش لا یمنع الصلاۃ وقاسوا علیہ طین بخارٰی ہ ص۴۳ طبع مکہ معظمہ تفصیل کے لئے مصفّٰی ص۶۳ تا مابعد ملاحظہ ہو

مرد اور عورت کے حصص میں فرق

وراثت کے باب میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ حق تعالےٰ نے وراثت کے حصے مقرر فرمائے ہیں۔ ان میں صراحت کے ساتھ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ کا حکم دے کر عورتوں پر مردوں کی برتری کا ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ حالانکہ اسلام تمام مسلمانوں میں عدل و مساوات کا مدعی ہے۔ مسلمانوں میں جیسا کہ مرد داخل ہیں، ان میں عورتیں بھی داخل ہیں۔ مردوں اور عورتوں میں بھی اسی عدل و مساوات کا مظاہرہ ہونا چاہیے تھا جو نہیں کیا گیا۔ آخر یہ عدم مساوات کیوں ہے؟

حیرت ہے کہ یہ سوال زیادہ مغرب سے متاثر افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس مغربی تہذیب کے زیر اثر یہ اعتراض ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس میں عورت کو سرے سے وراثت کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو وراثت سے محروم تو نہیں کیا اس نے اتنا ہی کیا ہے کہ عورت کا حصہ مرد سے آدھا رکھا ہے جس کی اپنی وجوہ اور حکمتیں ہیں۔

وراثت میں مرد کی برتری عورت پر یہ بات کہ ایک منزلہ کے ورثاء میں مرد کا حصّہ عورت سے ڈبل رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ خاندان کی حمایت اور قبیلہ کی طرف سے مدافعت کا فریضہ مرد ہی انجام دیتا ہے۔ عورتوں پر اس انداز کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ مرد پر عام مصارف زندگی کو برداشت کرنے کا بار بھی ہے جبکہ عورت ان مصارف سے آزاد ہے۔ جب تک اس کی شادی نہ ہو۔ اس کے تمام اخراجات اور مصارف باپ اور بھائی کے ذمّے ہیں اور شادی ہو جانے کے بعد اسکے تمام مصارف شوہر کے ذمے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسے اپنی زندگی میں بہت ہی کم زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر ایک زمرہ کے ورثا میں مرد و عورت میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔ چنانچہ بیٹے اور بیٹی۔ بہن اور بھائی وغیرہ میں مرد کا حصّہ عورت کے حصہ سے ڈبل ہوتا ہے۔ لیکن اخیافی بھائی بہنوں میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ ماں کی اولاد ہوتے ہیں اور ماں کی اولاد ضروری نہیں ہے کہ اپنے خاندان کی ہو۔ وہ دوسرے خاندان کی بھی ہو سکتی ہے۔ جس پر خاندان کی حمایت اور اس کی طرف سے مدافعت کی ذمہ داری نہیں ہوتی لہٰذا ان میں یہ صورت نہیں ہے۔ چنانچہ اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کے حصے مساوی ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال کی تصریحات

مرد اور عورت کے اس فرق پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے

اجتہاد سے متعلق خطبہ میں ترکی کے شاعر ضیا کے مطالبۂ مساوات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

جہاں تک ترکی کے شاعر کے مطالبہ کا تعلق ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ اسلام کے عائلی قانون کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا اور نہ ہی قرآنی اصول وراثت کی اقتصادی اہمیت اس پر چنداں واضح ہے۔ نکاح اسلامی قانون کے مطابق ایک معاشرتی معاہدہ ہے بیوی کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہے کہ نکاح کے وقت شوہر کے اختیار طلاق کو مقررہ شرائط کے مطابق اپنے حق میں منتقل کرائے اور اس طرح اس خصوص میں مرد کے مساوی وہم رتبہ ہو جائے۔ قانون وراثت میں شاعر کی مجوزہ اصلاح ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مردوں اور عورتوں کے شرعی حصص اگر غیر مساوی ہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قانون کی نگاہ میں مرد، عورت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کا قیاس قرآن کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

" اور عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر" لڑکی کے حصہ کا تعین اس کی کسی خلقی کمزوری کی بناء پر نہیں کیا گیا بلکہ اقتصادی

مواقع اور معاشرتی ہئیت میں جو جگہ اسے حاصل ہے اس کے پیش نظر عمل میں آیا ہے۔ مزید براں شاعر کے اپنے معاشرتی نظریئے کے مطابق قانون وراثت کو تقسیم دولت کا تنہا عامل نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس سلسلہ میں جو عامل کارفرما ہیں اسے اس کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ قانون اسلام کی رو سے جب کہ لڑکی اس جائداد کی پوری مالک ہے جو اسے اپنے باپ اور شوہر کی طرف سے شادی کے موقعہ پر ملتی ہے اور جبکہ وہ اپنے مہر کی جو اس کی مرضی کے مطابق خواہ معجل ہو یا غیر معجل اور جس کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی پوری جائداد پر قبضہ رکھ سکتی ہے تنہا اور واحد مالک بھی ہوتی ہے۔ اسکے باوجود بھی ساری عمر کے لیئے اس کی کفالت کی تمام تر ذمہ داری شوہر کے کاندھوں پر ڈالدی جاتی ہے۔ اگر آپ قانون وراثت کے عمل کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی اقتصادی وضعیت میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے اور حقیقت میں ان کے شرعی حصوں کی اس ظاہری عدم مساوات ہی کے ذریعہ قانون اسلام ترکی کے شاعر کی مطلوبہ

مساوات قائم کرتا ہے سچی بات یہ ہے کہ
قرآنی قانون وراثت فان کریمر (von
kremmer) کے نزدیک قانون اسلام
کے سب سے زیادہ طبع زاد پہلو ـــــــ کی تہ
میں جو اصول کارفرما ہیں فقہاء نے ان پر اتنی
توجہ صرف نہیں کی جن کے وہ مستحق ہیں ۔ جدید
سوسائٹی کی تلخ طبقہ داری کشمکش کے پیش نظر
ہم کو اب غور و فکر کرنا چاہیئے ۔ اگر ہم اپنے
قوانین کا مطالعہ آنے والے اس اقتصادی انقلاب
کی روشنی میں کریں تو اغلب ہے کہ ہماری
نظر میں اساسی اصولوں کے ایسے مشہور پہلوؤں
کو دریافت کریں جنھیں ہم ان اصولوں کی حکمت
پر ایک نئے یقین و ایمان کے ساتھ پیش کر سکتے
ہیں ۔
(بحوالہ ماہنامہ چراغ راہ کراچی اسلامی قانون نمبر
جلد دوم صفحہ ۸۰ - ۸۱

ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ مولانا عمر احمد عثمانی مدظلہٗ کی زیر نگرانی مولانا قمر احمد عثمانی صاحب کے قلم سے برصغیر ہند و پاکستان میں ہمارے علمائے کرام نے کیا کیا علمی و فکری خدمات انجام دی ہیں ۔ انکی خدمات کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا گیا ہے ۔ اپنے موضوع پر نہایت ہی اچھوتی اور نادر کتاب ہے ۔ ضرور مطالعہ فرمائیں ۔ قیمت صرف بیس روپے

یتیم پوتے کی وراثت

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ، جب اس کا باپ اس کے دادا کی زندگی میں فوت ہوگیا ہو، ہمارے عہد کا ایک معرکۃ الآرا مبحث بن گیا ہے۔ دونوں طرف دلائل ہیں۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ دونوں طرف کے نقطۂ نظر کی تائید میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں اس کا خلاصہ پیش کر دیں۔ ہمارے نزدیک اس سلسلہ میں مناسب یہ ہے کہ جانبین کے دلائل کا موازنہ کر کے خود ہی کسی ایک فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے اور ایک دوسرے کی انتہا پسندانہ مخالفت و مخاصمت سے پرہیز کیا جائے۔ نہ اس نقطۂ نظر کے قائلین منکر حدیث ہیں نہ اسکے مخالف دشمنان قرآن ہیں۔ دونوں کتاب و سنت کو ماننے والے ہیں اور دونوں مسلمان۔

قائلین وراثت کا نقطۂ نظر

اسلام کا اپنا مزاج

اسلام ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے دیگر مسالک و مذاہب کے مقابلہ میں اپنا ایک منفرد مزاج اور طبیعت رکھتا ہے۔ اسلام کے احکام اس کے ظواہر و رسوم، اس کے قوانین و ہدایات میں ہر جگہ اس کی روح، اسپرٹ اور مزاج کا رنگ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اسلام کے مزاج اور اس کی روح کا یہ تقاضا ہے کہ عوامی ضرورتوں کے لئے وحی الٰہی کی ہدایات کو بنیاد بنا کر جو تفریعی

قوانین اور ہدایات مستنبط کی جائیں ان میں اسلامی مزاج اور اسلامی روح کو اس طرح سمو دیا جائے کہ وہ دیگر تمام اسلامی قوانین سے ہم آہنگ، ہم رنگ اور مطابقت رکھنے والے ہوں کہ سب ایک ہی جسم کے اعضاء وجوارح نظر آئیں۔ اگر تفریعی قوانین میں کوئی ضابطہ اپنے کل سے متمیز، جدا اور ہم رنگ نہ ہو تو جو ضابطہ بنے گا وہ خشک، بے روح الفاظ کا خالی خولی ایک ڈھانچہ تو ہوگا مگر اسلامی مزاج سے نا آشنا، اس کی روح سے متمیز اور مختلف، اس کے تقاضوں سے بیگانہ۔ اس کی فطرت اور طبیعت نیز رنگ ڈھنگ سے الگ، روکھا پھیکا غیر فطری نوعیت کا محض ایک بے مغز قانون ہوگا جو نہ تو اس قابل ہوگا کہ اسے اسلامی قانون کہا جائے اور نہ وہ اسلام کے عدل عمرانی اور معاشرتی انصاف پر مبنی اصولوں سے ہم آہنگ ہوگا۔ یہی حال جزئیات کا بھی ہے۔ انھیں بھی ہم اصول اور کلیات کی روشنی میں سمجھیں اور پرکھیں گے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یتیم پوتے کو اس کے دادا کی میراث سے محض اس بناء پر محروم اور محجوب الارث قرار دینا کہ اس کا چچا زندہ ہے جب کہ وہ واسطہ کے اعتبار سے درمیان میں حاجب بھی نہیں ہے، اسلامی مزاج، اسلامی روح، اسلام کے عدل وانصاف اور اس کے شفقت ورحمت پر مبنی اصولوں سے میل کھاتی بات نظر نہیں آتی۔ یہ اس کے مجموعۂ قوانین میں ایک بالکل ہی انمل، بے جوڑ اور اجنبی چیز نظر آتی ہے۔ کیونکہ اسلام کے دیگر عام مقدس اور عادلانہ اصول واحکام

تو یتیموں کے حقوق کی حفاظت کی تلقین کرتے ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ اسلام سرتاپا یتیموں کے حقوق کا سب سے زیادہ محافظ، پاسبان، نقیب، محافظ اور حمایتی ہے۔ جو مسلمانوں کو بار بار یتیموں کی اعانت و کفالت کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس خوش بخت انسان کو جس نے کسی یتیم کی پرورش اور کفالت کی ہو جنت الفردوس میں اپنی رفاقت ومعیت کی سعادت عظمیٰ سے نواز دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو اسلام یتیموں کے حق میں یوں مجسم شفقت ورحمت ہو اس کا کوئی تفریعی جزئیہ یا حکم اور قانون اس نوعیت کا ہوگا جس کی رو سے ایک یتیم پوتا، اپنے مرحوم بیٹے کی یادگار، بے بس وبیکس پوتا اپنے دادا کی آنکھ بند ہوتے ہی بھرے گھر سے یوں بے دخل اور محروم ہو جائے گا کہ پورے گھر کی ہر چیز اس کے لئے اجنبی ہو جائیگی اور وہ گھر کی گز بھر زمین کو بھی اپنا نہیں کہہ سکے گا۔ تمام زمین، مکان، املاک سے وہ ایک دم بے حق ہو جائے گا۔

قرآن جو اسلامی قوانین واحکام کی بنیاد واساس ہے یوں تو ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جنمیں یتیموں کے حقوق کی حفاظت وصیانت اور ان کی سرپرستی اور کفالت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن سورہ النساء کی ان آیات میں جن میں تقسیم میراث کے تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اصل احکام بیان

کرنے سے پہلے بطور مقدمہ کے سلسلۂ بیان کا آغاز یتیموں کے ذکر ہی سے کرتا ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی اصل پالیسی اس قابل رحم گروہ، یتیموں کے بارہ میں کیا ہے۔
خاص طور پر وہ آیات جو آیت وراثت سے ملحق و متصل لائی گئی ہے اس سے تو یوں نظر آتا ہے کہ اللہ کو خوب معلوم تھا کہ یتیموں کا گروہ جس المناک صورت حالات سے دوچار ہونے والا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے حق تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرما رہا ہے تاکہ لوگ قانونی یا عملی طور پر کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے معاشرہ اور سوسائٹی میں یتیم بالکل ہی بے آسرا اور بے سہارا بن کر رہ جائیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ (۴/۹)

اور چاہیئے کہ (مال متروکہ تقسیم کرنے والے اس بات سے) ڈریں کہ اگر وہ خود (مرتے وقت) اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جائیں جن کے متعلق انھیں خوف ہو کہ (ان کے بعد کہیں ان کے حقوق پامال نہ ہوں) تو چاہیئے کہ وہ (تقسیم وراثت میں) خود بھی اللہ سے ڈریں اور چاہیے کہ (کسی فریق کی طرف نہ جھکیں) بالکل انصاف کی بات کریں۔

ملاحظہ فرمائیں کہ یہ آیت کریمہ کس رقت انگیز انداز میں یتیموں

کے ساتھ روا رکھے جانے والے حسن سلوک کی تلقین کرتی ہے۔ کیا وہ حسن سلوک یہی ہے کہ دادا کی آنکھ بند ہوتے ہی انھیں ہر جدّی چیز سے، جدّی جائداد کے حبّہ حبّہ سے بذریعہ قانون محروم قرار دیدیا جائے۔ کیا کوئی شخص اپنی اولاد کے بارے میں اسی طرز عمل کو پسند کرتا ہے جو یتیم پوتوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے؟ اگر نہیں تو پھر یتیم پوتوں کی جدّی جائداد سے محروم کرنے والا قانون کہاں تک اسلامی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اس سے اگلی آیت میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ○

(۴/۱۰)

بے شک جو لوگ یتیموں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں۔ وہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ اپنے پیٹوں کو آگ سے بھرتے ہیں اور وہ (اس دنیا میں ضمیر کی ملامت کی آگ میں اور آخرت میں) جہنم کی آگ میں ضرور ضرور داخل ہو کر رہیں گے۔

سورۂ نساء کی نویں اور دسویں آیتوں میں یہ کچھ فرما دینے کے بعد حق تعالیٰ نے گیارہویں اور بارہویں آیات میں تقسیم میراث کے تفصیلی احکام بیان فرمائے ہیں۔ میراث کے احکام شروع کرنے سے پہلے یتامیٰ کا بیان بے وجہ نہیں ہے اس میں مسلمانوں کے لئے بڑا سبق موجود ہے۔

پوتا بھی ابن ہوتا ہے

قرآن کریم نے اصل وارث آباء اور اَبناء (اصول و فروع) کو قرار قرار دیا ہے

اٰبَاۤؤُكُمْ وَ اَبْنَاۤؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ (۴/۱۱)

تمہارے باپ اور بیٹے تمہارے اصل وارث ہیں۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں فائدہ کے لحاظ سے تم سے قریب تر کون ہے۔ یاد رکھو، یہ حصے (جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں) اللہ کے مقرر کردہ ہیں یقیناً اللہ خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اَبٌ اور اِبنٌ کسے کہتے ہیں۔ اَبٌ میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے کہ وہ باپ، دادا، پڑدادا اور اوپر سے اوپر تک اصول میں جو بھی ہو وہ اَبٌ کہلاتا ہے۔ اَبُوْكُمْ اٰدَمُ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا تھا۔ اور

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ (۲۲/۷۸)

یہ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت ہے جس نے پہلے ہی تمہارا نام مسلمان رکھ دیا تھا۔

تو حق تعالیٰ کا ارشاد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے قبیلے قریش کا باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا گیا ہے۔
رہگیا ابن اور ولد تو وہ بھی بیٹے، پوتے، سکڑپوتے
نیچے سے نیچے تک سب فروع پر بولا جاتا ہے۔ امام ابوبکر
جصاص رازی نے اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں
بابُ مِیْرَاثِ اَوْلَادِ الْاِبْنِ کے عنوان سے ایک مستقل باب
باندھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ حق تعالیٰ کے قول یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ
فِیْ اَوْلَادِکُمْ میں اولاد سے مراد صلبی اولاد اور پوتے ہیں جب
صلبی اولاد نہ ہو۔ کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جو
پوتے اور پوتیاں چھوڑ مرے تو مال ان سب کے درمیان
مذکر کے لئے مؤنث سے دوگنے کے حساب سے تقسیم ہوگا۔
جیسا کہ قرآن کا حکم ہے۔ اسی طرح اگر متوفی نے پوتی چھوڑی ہو
تو اسے آدھا ترکہ ملیگا اور اگر کئی پوتیاں چھوڑی ہوں تو وہ
سب دو تہائی میں شریک ہوں گی۔ جیسا کہ صلبی اولاد کے
حصے ہوا کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ سب اولاد ذکور
آیت میں مراد ہیں۔ اور وَلَدٌ کا لفظ پوتوں (بلکہ نواسوں) کو
بھی شامل ہوتا ہے جیسا کہ صلبی اولاد کو شامل ہوتا ہے حق تعالے
نے قرآن میں کئی جگہ یا بنی آدم فرمایا ہے (ملاحظہ ہو ۷/۲۶
ذ ۷/۲۷ ذ ۷/۳۱ ذ ۷/۳۵ ذ ۷/۱۷۲ ذ ۱۷/۷۰ ذ ۳۶/۶۰) اور یہ کہنا قطعاً
ناجائز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہاشم کے اور عبدالمطلب
کے بیٹے تھے اس سے ثابت ہوا کہ وَلَدٌ اور اولادٌ کا لفظ پوتے

اور نوا سے پر اور صلبی اولاد پر سب پر بولا جاتا ہے۔ البتہ صلبی اولاد پر اس لفظ کا اطلاق (ایک قول کے مطابق) حقیقی ہوتا ہے اور پوتوں پر مجازی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جب صلبی اولاد موجود ہو تو پوتے مراد نہیں ہوتے اور ان کے (وراثتی) حصوں میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے وہ دو حالتوں میں مستحق ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ صلبی اولاد قطعاً موجود ہی نہ ہو تو یہ ان کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ صلبی اولاد پوری میراث کو حاصل نہ کر سکے تو بچے ہوئے مال کے مستحق ہو جاتے ہیں، کچھ کے یا سب کے، رہا یہ کہ پوتے صلبی اولاد کے ساتھ بطور شرکت کے مستحق ہو جائیں جیسا کہ صلبی اولاد ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوا کرتی ہے تو ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب وَلَدٌ کا لفظ صلبی اولاد کو حقیقۃً شامل ہوتا ہے اور پوتوں کو مجازاً تو ایک ہی لفظ سے صلبی اولاد اور پوتے مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک ہی لفظ بیک وقت حقیقت اور مجاز میں استعمال نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہاں ایک لفظ سے ایک حالت میں جب صلبی اولاد موجود ہو تو پوتے مراد نہیں ہو سکتے اور وہ میراث کے مستحق نہیں ہوتے۔ لیکن یہ ناجائز نہیں ہے کہ صلبی اولاد موجود نہ ہونے کی صورت میں پوتے مراد ہوں تو لفظ، دو حالتوں میں مستعمل ہوگا۔ ایک حالت میں حقیقت اور دوسری حالت میں مجاز میں۔ اور اگر کسی شخص نے کہا کہ میں اپنے تہائی مال کی وصیت فلاں فلاں کی اولاد کے لئے کرتا ہوں۔ انہیں

سے ایک کی صلبی اولاد موجود ہے اور دوسرے کی صلبی اولاد نہیں ہے۔ اس کے پوتے ہیں تو وصیت ایک فلاں کی صلبی اولاد اور دوسرے فلاں کے پوتوں کے لئے ہوگی اور ایک فلاں کے پوتوں کو دوسرے فلاں کے صلبی بیٹے شمولیت سے مانع نہیں بنیں گے۔ البتہ ایک فلاں کے صلبی بیٹے خود اپنے بیٹوں (یعنی متوفی کے ان پوتوں) کی شمولیت کے لئے مانع بن جائینگے یعنی وہ اپنے باپوں کے ساتھ شریک نہیں ہوسکینگے۔ لیکن دوسرے فلاں کے پوتوں کے لئے مانع نہیں بنیں گے۔ اسی طرح حق تعالےٰ کے ارشاد يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ کا تقاضا یہی ہے کہ اول تو تمام مذکورین کے صلبی بیٹے ہونے چاہئیں (اگر ہوں) اور ان کے ساتھ پوتے شامل نہ ہوسکیں) لیکن جس شخص کے صلبی بیٹے نہ ہوں البتہ پوتے موجود ہوں تو اس لفظ کے مفہوم میں وہ پوتے ہی داخل ہوجانے چاہئیں۔ یہ اس لئے جائز ہوا کہ حق تعالےٰ کا ارشاد يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اولادِكُمْ کا خطاب ہر ایک آدمی کو ہے تو ہر آدمی اپنے اپنے حال کے مطابق ہی اس کا مخاطب ہوگا تو جس آدمی کے صلبی بیٹے موجود ہوں، ان کو یہ لفظ حقیقی معنے کے اعتبار سے شامل ہوگا اور اس کے پوتوں کو شامل نہیں ہوگا اور جس شخص کے صلبی بیٹے نہ ہوں البتہ پوتے موجود ہوں تو وہ اپنے حال کے مطابق اس حکم کا مخاطب ہے۔ لہٰذا یہ لفظ پوتوں کو شامل ہوجائے گا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ وَلَدٌ کا لفظ صلبی بیٹے اور پوتے ہر ایک پر حقیقت ہی کے اعتبار سے

بولا جاتا ہے (پوتے پر مجازاً نہیں بولا جاتا) تو یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ وہ سب کے سب (صلبی بیٹے اور پوتے) اپنی ولادت کی جہت سے اسی کی طرف منسوب ہیں اور نسب کی جہت سے بھی کیونکہ نسب اسی سے ملایا جاتا ہے۔ تو یہ لفظ سب کو شامل ہے۔ جیسا کہ اِخْوَۃٌ کا لفظ چونکہ دو بھائیوں کے درمیان اتصال نسب کا نام ہے والدین میں سے کسی جہت سے بھی ہو تو یہ لفظ سب بھائیوں کو شامل ہوتا ہے اور سب ہی کے لئے عام ہوتا ہے، خواہ وہ حقیقی بھائی ہوں۔ (ماں باپ دونوں سے) یا صرف باپ کی طرف سے ہوں (علّاتی بھائی) یا صرف ماں کی طرف سے ہوں (اخیافی بھائی) اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں) اس سے جیسا کہ صلبی بیٹے کی بیوی کی حرمت سمجھی گئی ہے اسی طرح پوتے کی بیوی کی حرمت بھی سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا جب متوفی ایک بیٹی اور ایک پوتی اور ایک پوتا چھوڑ مرے تو بیٹی کو آدھا ترکہ اور پوتی کو چھٹا حصّہ اور پوتے کو عصبہ ہونے کی بنا پر جو باقی بچے وہ دلا دیا جاتا ہے اور اگر متوفی نے دو بیٹیاں اور ایک پوتی اور ایک پوتا چھوڑا ہو تو دونوں بیٹیوں کو دو تہائی اور باقی پوتے اور پوتی کو دلوایا جائے گا کہ مذکر کو مونث سے دوگنا ملے گا۔ اسی طرح اگر متوفی نے دو بیٹیاں اور کئی پوتیاں اور ایک پڑپوتا چھوڑا ہو جو ان سب سے نیچے

ہو تو بیٹیوں کے لئے دو ثلث اور باقی پوتیوں اور پڑ پوتے کو دیا جائے گا اسی طرح یعنی مذکر کو مؤنث سے دوگنا حصہ ملے گا۔ اور یہ تمام اہل علم کا قول ہے صحابہ اور تابعین سب کا سوائے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے کہ وہ باقی پوتے کو دلواتے ہیں ایسے ہی پڑ پوتے اور سکڑ پوتے کو بھی۔ اور وہ پوتیوں کو کچھ نہیں دلاتے جبکہ بیٹیاں دو ثلث لے چکی ہوں اور وہ پوتیوں کو دو ثلث پورا کرنے کے طور پر دلوایا کرتے تھے مثلاً متوفی نے ایک بیٹی کو چھوڑا ہو اور کچھ پوتیاں چھوڑی ہوں تو بیٹی کو نصف اور پوتیوں کو چھٹا حصہ دیدیا جائے تاکہ ان سب کے دو ثلث پورے ہو جائیں اور اگر ان کے ساتھ پوتا بھی ہو تو پوتیوں کو وہ چھٹے حصہ سے زیادہ نہیں دلاتے تھے الخ

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص۱۰۱-۱۰۳ ج ۲)

امام رازیؒ نے اس طویل اقتباس میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں آپ صرف یہ دیکھئے کہ وَلَدٌ اور اِبنٌ کے لفظ کے متعلق انھوں نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ دونوں لفظ صلبی بیٹے کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ نیچے کی تمام فروع بیٹے، پوتے، پڑ پوتے، سکڑ پوتے، نیچے سے نیچے تک سب پر بولے جاتے ہیں اور ایک قول کے مطابق تو صلبی اولاد اور نیچے تک تمام فروع پر ان کا استعمال حقیقی معنوں ہی میں ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے دوسرا قول یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ صلبی اولاد پر ان کا استعمال حقیقی ہوتا ہے اور غیر صلبی اولاد پر

مجازی۔ لیکن دلیل میں انھوں نے جو قرآنی آیت پیش فرمائی ہے
وَحَلَائِلُ اَبْنَائِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ اس نے
ہمارے فقہار کے سارے مفروضوں کی تردید کردی ہے کیونکہ
آیت کریمہ نے صرف صلبی بیٹوں کی بیویوں کو حرام قرار دیا ہے
اور اَلَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (جو تمھارے صلبی ہوں) کی تصریح
وتخصیص کے ساتھ حرام قرار دیا ہے لیکن تمام فقہار وعلمار
اس پر متفق ہیں کہ پوتوں، پڑپوتوں، سکڑ پوتوں نواسوں، پڑنواسوں
سکڑ نواسوں اور نیچے سے نیچے تک تمام فروع کی بیویاں حرام
ہوتی ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سب کو صلبی اولاد ہی
سمجھتے ہیں۔ لہٰذا صلبی اور غیر صلبی کا وراثت میں جو وہ فرق
وامتیاز کرتے ہیں وہ غلط ہوجاتا ہے۔
ایسے ہی تفسیر خازن میں وَلَهُنَّ الربع مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ
لَمْ يَكُنْ لكم وَلَدٌ کی تفسیر کے ماتحت لکھا ہے۔

ان اسم الولد یطلق علی الذکر والانثی ولا
فرق بین الولد وولد الابن وولد البنت
فی ذٰلک (تفسیر خازن ص۴۱۱ ج۱)

یقیناً ولد کا لفظ مذکر و مؤنث سب پر بولا جاتا ہے اور
اس میں بیٹے، پوتے اور نواسے میں کوئی فرق نہیں
ہے۔
لفظ ولد ہی کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رح فتح الباری
شرح صحیح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں کہ

اَلْوَلَدُ اَعَمُّ مِنَ الذکر والانثی ویطلق علی ولد الصلب وعلی ولد الولد وان سفل

(صحیح ۱۲)

وَلَدٌ کا لفظ مذکر و مؤنث کے لئے عام ہے اور صلبی بیٹے اور پوتے پڑپوتے پر نیچے تک بولا جاتا ہے

الشریفیہ شرح السراجیہ میں ہے

ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالیٰ یا بنی آدم (ص۵۴)

پوتا ولد میں داخل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے یابنی آدم فرمایا ہے۔

نیز کنز الفرائض ترجمہ و شرح سراجی میں لکھا ہے کہ "وَلَدٌ میں ولد الولد (پوتا) شامل ہے —"

(ص۵۹)

ان تمام تصریحات سے ثابت ہے کہ وَلَدٌ کے لفظ میں صلبی بیٹا، پوتا، پڑپوتا ہکڑ پوتا، نیچے سے نیچے تک تمام فروع شامل ہیں۔ ایسے ہی بیٹی، پوتی، پڑپوتی سکڑ پوتی نیچے سے نیچے تک سب فروع شامل ہیں۔ لہٰذ

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ (۴/۱۱)

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے وصیت فرماتا ہی

کہ مذکر کو دو مؤنثوں کے حصہ کے برابر دیا جائیگا

اور

اٰبَاۤؤُكُمْ وَاَبْنَاۤؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (۴/۱۱)

تمہارے حقیقی وارث تمہارے باپ (اصول، اوپر سے اوپر تک) اور بیٹے (فروع نیچے سے نیچے تک) ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اُن میں فائدہ رسانی کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے

ان آیات مبارکہ میں اولادکم اور اَبْنَاۤؤُكُمْ کے لفظوں میں اولاد الاولاد بھی شامل ہے۔ لہٰذا ان آیتوں میں پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں اور پڑپوتے پڑپوتیوں اور پرنواسے پرنواسیوں اور نیچے تک ان کی اولاد کے حق وراثت کا ذکر نص صریح موجود ہے۔ اور جیساکہ اوپر ذکر ہو چکا ہے حق تعالیٰ نے للذکر مثل حظ الانثیین کے فرمان میں ذکر اور انثیین کی تعریف کر کے ہمیں ان کے حصہ نکالنے کا بالکل صحیح حسابی قاعدہ بتا دیا ہے

دلیل اول لہٰذ پوتے کے لئے دادا کا وارث ہونے کے سلسلہ میں پہلی دلیل تو یہی ہے کہ پوتا اولاد اور ابناء میں داخل ہے بلکہ صلبی اولاد میں داخل ہے۔ کیونکہ قرآن کریم محرمات کے سلسلہ میں فرماتا ہے۔

وَحَلَاۤئِلُ اَبْنَاۤئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ

اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں تم پر حرام ہیں جو
تمھاری صلب سے ہوں۔

اور پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ پوتے، پڑپوتے اور سکڑ پوتے کی بیویاں نیچے سے نیچے تک دادا پر حرام ہوتی ہیں۔ گویا پوری امت پوتے پڑتے، سکڑ پوتے کو نیچے سے نیچے تک صلبی اولاد قرار دینے پر متفق ہے۔ ایسی صورت میں پوتے کے محروم الارث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
حق تعالیٰ نے

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْأُنثَيَيْنِ (۴/۱۱)

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارہ میں وصیت فرماتا ہے کہ مذکر کو دو مؤنثوں کے حصہ کے برابر دیا جائے

اور

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ
لَكُمْ نَفْعًا (۴/۱۱)

تمھارے وارث تمھارے اصول (باپ دادا) اور فروع (بیٹا، پوتا وغیرہ) تم نہیں جانتے کہ ان میں سے فائدہ رسانی میں تمھارے قریب ترین کون ہے

ان آیات کریمہ میں اولاد کو وارث قرار دیا گیا ہے۔ اور اولاد میں پوتے پڑپوتے وغیرہ سب شامل ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے انھیں محروم الارث قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

دلیل دوم

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ
لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا
(پ ۴)

مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ تھوڑا ہو یا بہت، مقررہ حصہ ہے۔

اس آیت کریمہ سے ہمارے فقہاء یتیم پوتے کے محروم الارث ہونے پر استدلال فرماتے ہیں کہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قریب ترین رشتہ دار وارث ہوتا ہے اور چونکہ خود مورث کا بیٹا، پوتے کے مقابلہ میں قریب ترین رشتہ دار ہے۔ اس لئے یتیم پوتے کا چچا وارث ہوگا، یتیم پوتا وارث نہیں ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی آیت یتیم پوتے کی وارث ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ کا مطلب ہمارے فقہاء نے غلط سمجھا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ قریب ترین رشتہ دار اس مال کے وارث ہونگے جو کوئی چھوڑ کر مر جائے۔ بلکہ قرآن کریم نے یہ فرمایا ہے کہ مرد اور عورتیں اس مال کی وارث ہوں گی جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ پھر سمجھ لیجئے کہ اَقْرَبُوْنَ (قریب ترین

رشتہ دار) قرآن کریم کے بیان میں مورث یعنی مال چھوڑ جانے والے متوفی ہیں۔ وارث نہیں ہیں۔ قرآن کریم یہ فرما رہا ہے کہ قریب ترین رشتہ دار جو چھوڑ مریں اس میں عورتوں اور مردوں کا حصّہ ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ باپ کے مرجانے کے بعد یتیم بچے کا قریب ترین رشتہ دار کون ہوتا ہے۔ اسکا ولی کون ہوتا ہے اس کا سرپرست کون ہوتا ہے۔ فقہاء کی تصریحات کے مطابق باپ کے بعد دادا ہی قریب ترین رشتہ دار ہوتا ہے۔ وہی اس کا ولی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اگر باپ دادا کم سن بچوں کی شادی کر دیں تو جیسا کہ باپ کے نکاح کرنے کی صورت میں بالغ ہو جانے کے بعد بچوں کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہوتا ایسا ہی دادا کے نکاح کرنیکی صورت میں بھی اختیار نہیں ہوتا۔ ہدایہ میں ہے

ویجوز نکاح الصغیرۃ اذا زوجھا الولی بکرا کانت الصغیرۃ اوثیبا والولی ھو العصبۃ و مالک یخالفنا فی غیر الاب والشافعی فی غیر الاب والجد .... وان زوجھما غیر الاب والجد فلکل واحد منھما الخیار اذا بلغ ان شاء فسخ وھذا عند ابی حنیفۃ و محمد وقال ابو یوسف لاخیار لھما اعتبارا بالاب والجد .... ہدایہ صفحہ ۳۱۶ / ۳

مطبوعہ کلام کمپنی کراچی

اور کمسن بچے اور بچی کا نکاح جائز ہے جبکہ ان کا نکاح ولی نے کیا ہو بچی کنواری ہو یا بیوہ ہو۔ اور ولی ہی عصبہ ہوتا ہے امام مالکؒ باپ کے علاوہ اور امام شافعیؒ باپ اور دادا کے علاوہ ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ البتہ اگر باپ دادا کے علاوہ کسی اور نے نکاح کر دیا ہو تو ان میں سے ہر ایک کو جب بالغ ہو جائیں اختیار ہوتا ہے کہ اگر چاہیں تو نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں۔ یہ قول امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا ہے اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ جیسے باپ دادا کی صورت میں اختیار نہیں ہوتا ایسے ہی ہر ولی کی صورت میں اختیار نہیں ہوگا۔

ہدایہ کی اس تصریح سے ثابت ہو گیا کہ باپ کے بعد قریب ترین رشتہ دار، اس کا ولی، اس کا سرپرست دادا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ باپ اور دادا دونوں کے متعلق فقہائے حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ اگر انہوں نے صغیر سن بیٹیوں اور پوتوں پوتیوں کا نکاح کر دیا ہو تو جہاں دیگر اولیا کی صورت میں بالغ ہونیکے بعد انھیں نکاح کو قائم رکھنے اور فسخ کر دینے کا اختیار ہوتا ہے، باپ دادا کی صورت میں انھیں یہ اختیار بھی نہیں رہتا۔

ہمارے نزدیک کم سن اور نابالغ بچوں اور بچیوں کے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتاب النکاح میں ہم اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں آپ یہ دیکھیں کہ

ہمارے فقہاء باپ اور دادا کی ولایت کے کس درجہ قائل ہیں ۔

اس کے بعد کتاب النفقات میں صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں کہ

ولا تجب النفقة مع اختلاف الدین الا للزوجة والابوین والاجداد والجدات و الولد وولد الولد اما الزوجة فلما ذکرنا انها واجبة لها بالعقد لاحتباسها لحق له مقصود۔ وهذا لا يتعلق باتحاد الملة واما غيرها فلان الجزئية ثابتة وجزء المرء فی معنى نفسه فكما لا يمتنع نفقة نفسه بكفره لا يمتنع نفقة جزئه الا انهم اذا كانوا حربيين لا تجب نفقتهم على المسلم وان كانوا مستامنين لانا نهينا عن البر فی حق من يقاتلنا فی الدین (ہدایہ ص ۴۴۶ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی

اور دین کے اختلاف کے باوجود صرف مندرجہ ذیل لوگوں کا نفقہ واجب ہے ۔ بیوی ، والدین ، دادے ، دادیاں بیٹے اور پوتے ۔ جہاں تک بیوی کا تعلق ہے تو اس کی وجہ تو وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے کہ نفقہ بیوی کے لئے بوجہ عقد نکاح کے واجب ہوتا ہے کیونکہ وہ شوہر کے ایک مقصود حق کے لئے اپنے آپکو

محبوس رکھتی ہے اور اسکا کوئی تعلق اتحاد ملت سے نہیں ہے۔ رہ گئے دوسرے افراد (یعنی والدین، دادے، دادیاں بیٹے اور پوتے) تو ان کا نفقہ اس لئے واجب ہوتا ہے کہ ان کا جزو ہونا ثابت ہے۔ اور آدمی کا جزو خود اپنے نفس کے معنے میں ہوتا ہے اور جیسا کہ کفر کی وجہ سے آدمی کا اپنے نفس پر خرچ کرنا ممتنع نہیں ہے ایسے ہی اپنے جزو پر خرچ کرنا بھی ممتنع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر ان کا تعلق اہل حرب سے ہو تو ان کا نفقہ مسلمان پر واجب نہیں ہوگا اگرچہ وہ مستامن (امن حاصل کر کے دارالاسلام میں آنیوالے) ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ہمیں ان لوگوں کے حق میں نیک برتاؤ کرنے سے منع کیا گیا ہے جو ہم سے دین کے بارے میں برسرِ جنگ ہوں۔

صاحب ہدایہ کی اس تصریح کے مطابق لڑکے پر باپ دادا کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور باپ دادا پر بیٹے اور پوتے کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ حتی کہ اگر باپ دادا یا بیٹا پوتا دین کے اعتبار سے بیٹے پوتے یا باپ دادے سے اختلاف بھی رکھتے ہوں تب بھی ان پر یہ نفقات واجب ہوں گے۔ اور اس کی وجہ صاحب ہدایہ نے یہ بتائی ہے کہ وہ سب ایک دوسرے سے جزئیت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ایک کافر پر خود اپنا نفقہ واجب ہوتا ہے ایسے ہی اپنے جزو کا نفقہ بھی واجب ہوگا۔ بیٹا اور پوتا اپنے

باپ دادا کے اجزاء ہیں، لہٰذا ان پر خرچ کرنا اپنے اوپر ہی خرچ کرنا ہے۔ ہمارے فقہاء کرام پوتے پوتی کو نفقات کے سلسلہ میں دادا کا جزو بتاتے ہیں، حیرت ہے کہ وراثت کے سلسلہ میں وہ اس کو اقرب مانتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہیں۔ کیا کوئی چیز جزو سے بھی زیادہ قریب ہو سکتی ہے؟

نفقات کے سلسلہ میں صاحب ہدایہ نے یہ اصول بیان کیا ہے

ویجب ذلک علی مقدار المیراث ویجبر علیہ لان التنصیص علی الوارث تنبیہ علی اعتبار المقدار ولان الغرم بالغنم والجبر لایفاء حق مستحق۔ قال وتجب نفقۃ الابنۃ البالغۃ والابن الزمن علی ابویہ اثلاثا علی الاب الثلثان وعلی الام الثلث لان المیراث لھما علی ھذا المقدار الخ (ہدایہ ص ۴۴۷ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

اور نفقہ بقدر میراث کے واجب ہوتا ہے اور اس پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ خصوصیت سے وارث کی تصریح مقدار کے اعتبار پر تنبیہ ہے۔ کیونکہ تاوان فائدہ حاصل کرنے کے مطابق ہوتا ہے اور جبر اس لئے ہے کہ واجب حق کو پورا پورا وصول کیا جا سکے۔ صاحب قدوری نے کہا ہے کہ جوان لڑکی کا نفقہ اور

اپاہج لڑکے کا نفقہ اسکے والدین پر اثلاثاً واجب ہوگا
یعنی دو تہائی باپ پر اور ایک تہائی ماں پر کیونکہ
ان دونوں کی میراث بھی تو اسی مقدار کے مطابق
ہوتی ہے الخ

صاحب ہدایہ نے نفقات کے سلسلہ میں جو اصول بیان فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ نفقات کا تعلق براہِ راست میراث سے بھی ہے حتیٰ کہ ہر شخص پر نفقہ اسی مقدار کے مطابق واجب ہوتا ہے جتنا اسے اس سے میراث میں حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے نفقات کے سلسلہ میں

"وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَالِكَ" (۲/۲۳۳)

اور وارث پر اس کے مطابق نفقہ واجب ہوگا

فرمایا ہے جس سے مقدار نفقہ پر تنبیہ مقصود ہے کیونکہ حکم کو مشتق (وارث) پر مرتب کرنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مشتق منہ (یعنی وراثت ہی) حکم کی علت ہے۔ لہٰذا حکم بقدر علت ثابت ہو سکے گا۔ آدمی کو جتنا فائدہ کسی سے حاصل ہونا متوقع ہوگا اتنا ہی بوجھ اس پر ڈالا جا سکتا ہے۔ اور جس پر یہ بوجھ ڈالا جائے گا اس سے یہ بوجھ زبردستی وصول جا سکے گا۔ کیونکہ یہ بوجھ اس پر ایک واجب حق ہے۔ اور مستحق کو اسے پورا پورا وصول کر لینے کا حق ہے۔

فقہ کی ان تصریحات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) باپ کے مرجانے کے بعد بچہ کا ولی اس کا دادا ہوتا ہے یعنی وہی اس کا قریب ترین رشتہ دار اور سرپرست ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ نابالغ اور کم سنی میں اس کا نکاح بھی کر سکتا ہے اور اس کا یہ نکاح کر دینا ایسا ہی حتمی ہوتا ہے جیسا کہ اس کے باپ کا کیا ہوا نکاح کہ بالغ ہونے کے بعد اسے اس کے فسخ کر دینے کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ اور یہ تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ لوگوں کو (مرد ہوں یا عورتیں) اس وراثت میں حصہ ملتا ہے جو اس کے والدین یا قریب ترین رشتہ دار چھوڑ مریں۔ باپ کے بعد دادا ہی قریب ترین رشتہ دار ہوتا ہے لہذا پوتے کو اپنے دادا کا یقیناً وارث ہونا چاہیئے۔

(۲) پوتے پر دادا کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور دادا پر پوتے کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ یہ بات بھی دادا اور پوتے کے درمیان قریبی تعلق ہونے کی دلیل ہے۔ یہ نفقہ مطلقا واجب ہوتا ہے اس کے لئے دونوں کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر دادا مسلمان اور پوتا عیسائی، یہودی یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا پوتا مسلمان ہو اور دادا کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو تب بھی یہ نفقہ واجب ہوگا۔ اور فقہا کی تصریح کے مطابق نفقات کا وجوب وراثت کی مقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں نفقہ واجب ہوتا ہے وہاں لامحالہ وراثت بھی ہوتی ہے اور جہاں وراثت پائی جاتی ہے وہاں لامحالہ نفقہ کا وجوب بھی ہوتا ہے۔ دادا پر پوتے کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور

بلاکسی قید کے واجب ہوتا ہے صرف اتنی ہی شرط ہے کہ اس کا باپ موجود نہ ہو تو لامحالہ اسے ترکہ بھی ملنا چاہیئے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کی عدم موجودگی میں دادا اس کا قریب ترین عزیز ہے اور قریب ترین عزیز کے متروکہ مال ہی میں ہر وارث حصّہ دار بنتا ہے۔ فقہاء نے اس کی جو دلیل دی ہے وہ نہایت اہم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ بیٹے اور دادا پوتے میں جو تعلق ہے وہ جزئیت کا ہے۔ بیٹا اور پوتا اپنے باپ اور دادا کا جزو ہوتا ہے۔ جزو پر خرچ کرنا خود اپنے نفس پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔ آدمی اپنے نفس پر اس وقت بھی خرچ کرتا ہے جب وہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا پیرو ہو۔ لہٰذا اگر بیٹا اور پوتا کسی اور دین کا پیرو ہو تو لامحالہ باپ اور دادا کو اس پر بھی خرچ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اپنے جزو پر خرچ کرنا ہے جس سے پہلوتہی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جب خرچ کرنے کے سلسلہ میں اتنی قربت موجود ہے تو وراثت سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔

یتیم پوتے کو محروم قرار دینے کیلئے کوئی شرعی دلیل نہیں

ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۵۲ء) میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا تھا ـــــــ

"فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو، وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث

اس کے چچا ہوتے ہیں ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے ۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلے کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔

(ترجمان القرآن بابت ماہ مارچ ۱۹۵۳ء)

اس کے بعد مولانا مودودی نے فقہاء کے اس متفقہ فیصلے کی معقولیت پر جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ قطعاً اس لائق نہیں ہیں کہ انھیں مولانا مرحوم کی طرف منسوب بھی کیا جا سکے اس لئے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں ۔ کیونکہ ہمارا مقصد کسی کی تردید یا تذلیل نہیں ہے یہاں آپ صرف اتنا دیکھئے کہ مولانا مودودی اعتراف فرمارہے ہیں کہ قرآن وحدیث میں انھیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلے کی بنیاد بنایا جا سکے ۔

فقہاء نے اس سلسلہ میں بخاری شریف میں حضرت زید ابن ثابت کے روایت شدہ اس قول سے (یعنی جو ایک صحابی کا قول ہے حدیث رسول بھی نہیں ہے) استدلال فرمایا ہے جسے امام بخاری نے "باب میراث ابن الابن" میں نقل فرمایا ہے ۔ حضرت زید ابن ثابت رضی کا قول تھا کہ لا یرث ولد الابن مع الابن (بیٹے کیساتھ پوتا وارث نہیں ہوتا) اس سے فقہاء نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں (یعنی یتیم پوتے کے چچا کی موجودگی

میں یتیم پوتا وارث نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس قول کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ہمارے فقہاء نے سمجھا ہے بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ "بیٹے کے ساتھ پوتا۔ یعنی خود اس بیٹے کا بیٹا وارث نہیں ہوتا"۔ یہاں چچا بھتیجے کا ذکر نہیں ہے بلکہ باپ اور بیٹے کا ذکر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس پوتے کا باپ موجود ہو وہ اپنے دادا کا وارث نہیں ہو سکتا۔ چونکہ دادا کا پوتے سے جو تعلق ہے وہ بیٹے کے واسطے سے ہے اور واسطہ خود موجود ہے تو وراثت پوتے تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اصول کا مشہور قاعدہ ہے کہ معرفہ کو جب دوبارہ معرفہ کر کے لایا جائے تو دوسرا معرفہ پہلے معرفہ کا عین ہوتا ہے۔ یہاں ولد الابن اور الابن دونوں معرفہ ہیں۔ لہٰذا الابن سے مراد وہی بیٹا ہو سکتا ہے جو اس سے پہلے ولد الابن میں آچکا ہے۔ دوسرا کوئی بیٹا مراد نہیں ہو سکتا۔ اصول فقہ کی مشہور و متداول کتاب نور الانوار میں ہے ——— اور نکرہ کو جب دوبارہ معرفہ کر کے لایا جائے تو دوسرا، اول کا عین ہوگا.............
اور جب نکرہ کر کے دوبارہ لایا جائے تو دوسرا پہلے کا غیر ہوگا۔
.... اور معرفہ جب معرفہ کر کے دوبارہ لایا جائے تو دوسرا معرفہ اول کا عین ہوتا ہے۔ کیونکہ لام معہود مذکور کی طرف اشارہ کرتا ہے جو گذر چکا ہے اور ان دونوں قاعدوں کی مثال حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ چونکہ الْعُسْر کو دوبارہ

بھی معرفہ کرکے لایا گیا ہے تو وہ اول کا عین ہوگا اور یُسرٌ کو دوبارہ نکرہ کرکے لایا گیا ہے تو وہ اول کا غیر ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک تنگی کے ساتھ دو فراخیاں ہوتی ہیں۔ ابن عباسؓ کے قول کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "ایک تنگی دو فراخیوں پر کبھی غالب نہیں آسکتی" بعینہ یہی مطلب ہے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے ؎

اذا اشتدت بك البلوی ففکر فی الم نشرح

فعسر بین یسرین اذا فکرته فافرح

(جب تم پر ابتلاء اور آزمائش سخت ہو تو سورہ الم نشرح میں غور کرو۔ ایک تنگی دو فراخیوں کے درمیان ہوتی ہے جب تم اس پر غور کرو تو خوش ہو جاؤ)

(نور الانوار صفحہ ۸۱ - ۸۲ مطبوعہ ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی)

اس پوری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ پوتے کے لئے صرف اس پوتے کا اپنا باپ ہی حاجب ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا بیٹا یعنی یتیم پوتے کا چچا حاجب نہیں ہو سکتا۔

تیسری دلیل | اسی موضوع پر سراجی مع ترجمہ بنام کنز الفرائض صفحہ ۱۰۹ - ۱۱۰ میں لکھا ہے

"وهو (یعنی حجب الحرمان) مبنی علی اصلین:- احدهما ان کل من یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذلك

الشخص سوی اولاد الام فانھم یرثون معہا۔

والثانی الاقرب ثم الاقرب (وہ روک جس سے محرومیت لازم آتی ہے) دو اصل قاعدوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کے واسطے سے میت سے تعلق رکھتا ہے۔ تو وہ اسی واسطے (یعنی اسی تعلق پیدا کرنے والے شخص) کی موجودگی میں وارث نہیں ہوا کرتا سوائے ماں کی اولاد کے کہ وہ ماں کے ساتھ وارث ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں سے دوسرا اصول یہ ہے کہ پہلے اولین اقرب حق دار ہے پھر اگر اولین اقرب نہ ہو تو دوسرا اقرب۔

بہر حال پہلی شرط تو یہ ہوئی کہ ہر وہ شخص جس کا مورث یعنی میت کے ساتھ کسی خاص شخص کے واسطے سے تعلق پیدا ہوتا ہو تو وہ اس خاص شخص کی موجودگی میں ورثہ نہیں پاتا ......
...... یعنی اس خاص شخص کی عدم موجودگی میں ورثہ پاتا ہے۔ مثال کے طور پر پوتا اپنے باپ کی موجودگی میں دادا سے ورثہ نہیں پاتا۔ لیکن اگر باپ نہ ہو تو (چونکہ پوتے کا تعلق دادا کے ساتھ، باپ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے) پوتا ورثہ پائے گا۔

دوسری شرط یہ تھی کہ سب سے پہلے سب سے اول اقرب ورثہ پاتا ہے

عـہ ہمارے نزدیک یہ استثنار بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے خود اصول ہی کی تردید ہو جاتی ہے۔

پھر اگر اول اقرب نہ ہو تو دوسرا اقرب (اور علیٰ ہذا القیاس) سراجیہ کی مذکورہ شرط اول ہی میں اقرب کی تعریف بھی موجود ہے۔ یعنی یہ کہ "واسطے" کے ہوتے ہوئے "واسطے والا" ورثہ نہیں پاتا کیونکہ اس وقت واسطہ (یعنی اصل وارث یا اول اقرب) ہی الاقرب ہوتا ہے۔ اور "واسطے" یعنی اصل وارث کی عدم موجودگی میں نہ الاقرب (یعنی واسطے والا یا دوسرے درجہ کا اقرب) ورثہ پاتا ہے۔ دونوں مذکورہ بالا اصول، قرآن کریم اور معقولیت کے لحاظ سے تو درست ہیں۔ لیکن جب عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو ہمارے فقہاء اور علماء ان کی تکذیب اور تردید کر دیتے ہیں

علامہ موسیٰ جار اللہ کی تصریحات

علامہ موسیٰ جار اللہ[۵] مرحوم ہمارے اساتذہ کے زمانے کے بڑے عالم گذرے ہیں۔ ہم اپنی تائید میں اگر ان کے ارشادات پیش کر دیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔ علامہ

ع ۵ علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم روسی ترکستان کے نہایت جلیل القدر اور عبقری عالم تھے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد انھیں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں علامہ مرحوم ہندوستان بھی تشریف لائے اور یہاں کے اہل علم اکابر پر اپنا سکہ بٹھا گئے۔ انکی مرتب کردہ عربی تفسیر "الہام الرحمٰن" کی دو جلدیں شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ نے شائع کی ہیں اور "الوشیعہ فی نقد عقائد الشیعہ" سہیل اکیڈمی لاہور نے شائع کی ہیں جسکا ترجمہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری نے کر دیا ہے۔ اور طبع ہو چکی ہے۔

موصوف نے جہاں اور کئی قابل قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ایک گرانقدر تصنیف "صحیفۃ الفرائض" کے نام سے وراثت کے مسائل پر بھی چھوڑی ہے۔ چنانچہ وراثت کی تعریف کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

ان الارث خلافۃ شرعیۃ۔ یموت احد ویخلفہ۔ اخر فی حقوقہ وفی وظائفہ۔ (ص ۸۱ – ۸۹)

وراثت شرعی قائم مقامی ہوتی ہے۔ ایک آدمی مرجاتا ہے۔ اور دوسرا آدمی اس کے حقوق میں اور اس کی ذمہ داریوں میں اس کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں ——————— "اور[۱] یہاں ایک شرعی قانون ہے جو پر حکمت سنتہ الہیہ کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ فرع (اولاد) اپنی اصل کی قائم مقام ہوجاتی ہے جب اصل جاتی رہے اور اس کے درجہ میں اس کی نائب ہوجاتی ہے تو مورث کی طرف اسے وہی قرب حاصل ہوجاتا ہے جو قرب اصل کو حاصل تھا۔ تو پوتا، جب بیٹا نہ رہے بیٹے کے درجے میں ہوجاتا ہے کہ اس کے لئے کوئی حاجب روک نہیں بنتا۔ اور یہ قانون شرعی آلہی ہے جسے ترک کرنا کسی اہل علم کے لئے جائز نہیں اور اسی پر نظام اجتماعی کی اور کتاب اللہ کی شریعت میں نظام توریث کی بنیاد قائم ہے۔ تو پوتے کو صرف اس کا

---

[۱] تطویل کے خیال سے اصل عربی عبارات کے بجائے ہم انکے ترجمہ پر کفایت کرتے ہیں۔ مؤلف

باپ ہی حاجب ہوسکتا ہے تو جب اس کا باپ موجود نہیں تو میراث سے اس کا حصہ اس کے بیٹے کو ملے گا اور اس کے لئے اس کا چچا حاجب نہیں ہوگا

اور جو کچھ سنت ثابتہ میں وارد ہوا ہے کہ بیٹے کا بیٹا، بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا اس کا مطلب یہی ہے کہ بیٹے کا بیٹا اپنے باپ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا۔

ص ۱۵۶ - ۱۵۹

اس کے بعد فرماتے ہیں ——— "اولاد کی اولاد (یعنی پوتے) اپنے آبار کی خلیفہ ہوتی اور مورث سے اپنے آبار کے حصوں کی وارث ہوتی ہے۔ اور یہ قائم مقامی اسباب کی اصل اور قانون وراثت میں قوی ترین سبب ہوتی ہے"۔

(ص ۱۷)

پھر ص ۱۷ پر علامہ موسیٰ جار اللہؒ نے یہ دو مثالیں دی ہیں:-

مسئلہ ۱: وارثین:- زندہ بیٹا اور یتیم پوتا (مرحوم بیٹے کی اولاد)

اور مسئلہ ۲: وارثین:- زندہ بیٹا (زید) اور یتیم نواسے نواسی (یعنی مرحومہ بیٹی زینب کی اولاد) ان ہر دو مسائل کے بارے میں فرماتے ہیں ——— "اور جو کچھ میری رائے ہے اور جس پر میرے دل کو اطمینان اور سکون حاصل ہے یہ ہے کہ مال آدھا آدھا کیا جائے۔ ایک نصف زندہ بیٹے کو دیا جائے اور دوسرا نصف متوفی بیٹے کی اولاد کو، وہ اپنے باپ کا حصہ

حاصل کرے گی۔

اور دوسری صورت میں مال کو اثلاثًا تقسیم کیا جائے۔ دو ثلث اس کے بیٹے زید کو دیئے جائیں اور ایک ثلث مرحومہ بیٹی زینب کی اولاد کو" ——— پھر صفحہ ۱۷۱-۱۷۲ پر فرماتے ہیں کہ ———

اور اصل یہ ہے کہ کوئی قریبی عزیز میت کی طرف نسبت میں اگر واسطہ ہو تو وہ دور کے رشتہ دار کے لئے حاجب ہو جائے گا۔ اور اگر واسطہ نہ ہو تو اقرب، ابعد کے لئے حاجب نہیں ہو گا۔ پھر ابعد اپنی اصل کے چلے جانے کے بعد اصل کا قائم مقام ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ درجہ کے قریب ہونے میں اقرب کے مثل ہو جائے گا۔ چنانچہ زید مثال مذکورہ میں اپنے بیٹوں کے لئے حاجب ہو جائے گا۔ اور اپنے بھائی کے بیٹوں کے لئے حاجب نہیں ہو گا۔ اسی طرح اپنی بہن کی اولاد کے لئے بھی حاجب نہیں ہو گا" ——— پھر ص ۱۷۲ پر مزید فرماتے ہیں کہ ——— یہ قائم مقامی کا قانون ہے۔ اور یہ اصل ہی قانون نسبت ہے۔ کیونکہ کوئی نقطہ دوسرے نقطہ سے اقرب نہیں ہو سکتا، اِلّا یہ کہ دونوں نقطے ایک ہی خط میں ہوں۔ تو اگر اقرب نہیں رہا تو ابعد اس کی جگہ پر آجائے گا اور وہی اقرب بن جائے گا۔ تو اگر کسی کے دو بیٹے ہوں۔ پھر ان میں سے ایک مر گیا تو متوفی کی اولاد متوفی کی جگہ لے لیگی۔ پھر اس اولاد کا قرب زندہ بیٹے کے قرب کی طرح ہی ہو جائے گا۔ کیونکہ جو کچھ

بھی بعد تھا وہ واسطہ کے وجود کی وجہ سے تھا۔ اور جب واسطہ جاتا رہا تو بعید، قریب ہو گیا اور قریب کی جگہ پر آ گیا، چنانچہ پوتا، اپنے باپ کے چلے جانے کے بعد مورث کا ابن ہو گیا اپنے باپ کی طرح۔ بلکہ ولد کی اولاد۔ ولد کے چلے جانے کے بعد ولد کی جگہ پر آ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ دوسرے بیٹے کی وجہ سے ابعد نہیں ہو جاتے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ وراثت ایک خلافت اور قائم مقامی ہے جو ایک ہی خط مستقیم پر چلتی ہے۔ باپ کے مرجانے سے بیٹا اور دوسری اولاد وارث ہوتے ہیں۔ باپ کا بھائی وارث نہیں ہوتا۔ اسی طرح دادا کے مرجانے سے پوتا بخط مستقیم وارث ہوتا ہے اور اس کے مرحوم باپ کا حق، باپ کے زندہ بھائی یا یتیم پوتے کے چچا کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ باپ کی موت سے یعنی واسطے یا روک کے اٹھ جانے سے پوتا، دادے کا بالکل قریب ہو جاتا ہے اور اپنے مرحوم والد کا قائم مقام بن جاتا ہے، اگر پوتے کا والد زندہ ہوتا تو پھر وہ خود وارث ہو جاتا اور پوتے کا وجود اور عدم وجود اس حالت میں برابر ہوتا۔ آخری نتیجہ علامہ موسیٰ جار اللہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں

"یہ بنیادی اور درست اصل وہی ہے جس کی طرف آیات میراث میں قرآن کریم ہدایت فرماتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم متوفی کی اولاد کو متوفی کا قائم مقام کی حیثیت سے اعتبار کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ متوفی کی اولاد قریب ہونے میں اسی کی مثل ہو جو حق تعالےٰ

جل جلالہ کے ارشاد یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین میں اولاد کی طرح دخول اولی کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں۔

اور یہیں قرآن کریم۔ اپنے خطاب عظیم میں "یا بنی آدم" کے ساتھ کس طرح خطاب کرتا ہے۔ جبکہ آدم کے خلف حقیقی اور صلبی بیٹے موجود نہیں ہیں۔ یہی بات تو ہے کہ اصول باقی نہیں رہے تو ہم اصول کی جگہ پر آ گئے ہیں۔" (صحیفۃ الفرائض ص ۱۷۲-۱۷۳)

اس اقتباس میں علامہ جار اللہ نے یہ بتایا ہے کہ اولاد کے لفظ میں اولاد الاولاد نیچے تک داخل ہوتی ہے۔ دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام اور ہمارے درمیان کتنی پشتیں گذر گئیں۔ پھر بھی ہمیں حق تعالیٰ بنی آدم، یعنی اولاد آدم ہی کہہ کر خطاب فرما رہے ہیں۔

حجب حرمان کے دو اصول

اصطلاح فرائض میں حجب کسی شخص کو اس حق وراثت سے روک دینے کا نام ہے۔ جو وارث کسی کو حق وراثت سے روک دے اسے حاجب اور جسے روک دے اسے محجوب الارث کہتے ہیں۔ فقہاء نے حجب کی دو قسمیں کی ہیں۔ حجب حرمان اور حجب نقصان۔ حجب حرمان تو یہ ہے کہ وارث کو مورث سے ملنے والے ترکہ سے محروم ہی کر دے اور حجب نقصان یہ ہے کہ بالکلیہ تو محروم نہ کرے البتہ حصہ میں کمی کر دے۔ چونکہ حجب نقصان کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم صرف حجب حرمان ہی سے بحث کریں گے۔

فقہاء نے حجب حرمان کے لئے دو اصول یا ضابطے مقرر فرمائے ہیں جو علامہ محمد ابن عبد الرشید مؤلف سراجی کے الفاظ میں یہ ہیں

وهو مبنی علی اصلین احدهما ان کل من یدلی الی المیّت بشخصٍ لا یرث مع وجود ذلك الشخص والثانی الاقرب فالاقرب۔

(سراجی)

(ترجمہ) حجب حرمان دو ضابطوں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ کہ جو شخص میت کے ساتھ کسی واسطے سے رشتہ رکھتا ہو وہ اس واسطے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا اور دوسرا ضابطہ الاقرب فالاقرب ہے یعنی جو میت سے قریب تر ہو وہ حقدار وراثت ہوگا

دونوں اصول کے حدود

ان دونوں اصولوں میں سے پہلا ضابطہ بالواسطہ رشتہ داروں سے متعلق ہے اور دوسرا ضابطہ بلاواسطہ رشتہ داروں سے متعلق ہے۔ چنانچہ ضابطۂ اول کے مطابق دادا، پردادا سکڑدادا، نانی، پڑنانی، سکڑنانی، پوتا پڑپوتا، سکڑپوتا۔ کوئی بالواسطہ رشتہ دار اس وقت تک وارث نہیں بن سکتے جب تک وہ شخص خود موجود ہے جس کے واسطے سے یہ میت

کے ساتھ رشتہ رکھتا ہے۔ یعنی دادا، باپ کی موجودگی میں نانی ماں کی موجودگی میں اور پوتا اپنے باپ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوں گے البتہ جب یہ واسطے موجود نہ ہوں تب وارث ہوں گے۔ یعنی جب باپ نہ ہو تو دادا۔ اور دادا بھی نہ ہو تو پردادا، اوپر سے اوپر تک اور ماں نہ ہو تو نانی، نانی بھی نہ ہو تو پرنانی اوپر سے اوپر تک۔ اسی طرح بیٹا نہ ہو تو اس کا بیٹا اور وہ بھی نہ ہو تو بیٹے کا بیٹا نیچے سے نیچے تک سب ہی وارث ہوں گے۔

اس پہلے اصول میں دو باتیں بتلائی گئی ہیں۔ اول یہ ہے کہ بالواسطہ رشتہ دار واسطے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ بالواسطہ رشتہ دار واسطہ اُٹھ جانے کے بعد وارث ہو جائے گا۔

دوسرا اصول الاقرب فالاقرب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درجہ میں وراثت کا حق دار وہ ہوگا جو متوفی سے قریب ترین رشتہ رکھتا ہو اور دوسرے درجہ میں وہ وارث ہوگا جو پہلے درجہ کے بعد میت سے قریب ترین رشتہ رکھتا ہو۔ یہاں فالاقرب میں فاء تعقیب کے لئے ہے یعنی اول درجہ کے بعد۔ اول درجہ تو وہ ہوا جو بلا واسطہ میت کا قریب ترین رشتہ دار ہے اور دوسرا درجہ وہ ہوا جو اول درجہ کے بعد اس کا قریب ترین رشتہ دار ہو۔

دلیل چہارم و پنجم | یتیم پوتے کی وراثت کیلئے

دراصل یہ چوتھی اور پانچویں دلیل ہے چوتھی دلیل تو اس طرح کہ جب حرمان کے پہلے اصول کے مطابق یتیم پوتا اپنے دادا سے بالواسطہ قریب ترین رشتہ دار تھا۔ یعنی پوتے اور دادا کے درمیان دادا کا بیٹا اور پوتے کا باپ واسطہ تھا اور وہ واسطہ بیٹے یعنی یتیم کے باپ کے مرجانے سے اُٹھ گیا۔ درمیان کا واسطہ اُٹھ جانے سے اب پوتا اپنے دادا سے قریب تر ہو گیا لہٰذا واسطہ اُٹھ جانے کے بعد اب وہ وارث ہو جائے گا۔

اور دوسرے اصول کے مطابق بھی یتیم پوتے کو وارث ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اول درجہ میں وارث میت کا بیٹا ہو جو اس سے قریب تر تھا اور دوسرے درجہ میں وہ وارث ہوگا جو اس کے بعد قریب تر ہو، اور بیٹے کے بعد پوتا ہی سب سے قریب تر رشتہ دار ہے لہٰذا اسے وارث ہونا چاہیئے۔ اگر یتیم پوتا اور اس کا باپ دونوں متوفی کی وفات کے وقت موجود ہوتے تو متوفی کی جائداد کا وارث یتیم پوتے کا باپ ہوتا۔ نہ یتیم پوتا وارث ہوتا اور نہ اس کے حصہ کا وارث اس کا چچا ہوتا۔ یتیم پوتے کا چچا اپنا حصہ لیتا اور یتیم پوتے کا باپ اپنا حصہ لیتا۔ لیکن یتیم پوتے کے باپ کے مرجانے سے اب اقرب یتیم پوتا ہو گیا نہ کہ اس کا چچا۔ کیونکہ چچا تو اول درجہ میں پہلے ہی اقرب تھا۔ وہ دوسرے درجہ کا اقرب تو نہیں ہے۔ دوسرے درجہ کا اقرب تو ہوتا ہی وہ ہے جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد اب (دوسرے درجہ کا) اقرب بن رہا ہے۔

دلیل ششم عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلہ میں ہمارے فقہاء کی جانب سے جو دلائل پیش کیے گئے ہیں وہ بجائے یتیم پوتے کو محروم الارث قرار دینے کے اسے وارث قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ فقہاء کی دلیل بننے کے بجائے ہماری دلیل بن رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے فقہاء نے یتیم پوتے کو محروم قرار دینے کے لئے بخاری شریف کی ایک روایت کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــــ اَلْحِقُوا اَلْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَلِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ ـــــــ (متعین حصے حقداروں کے حوالے کر دو۔ پھر جو باقی بچے وہ قریب ترین مرد کا حصہ ہے) ہمارے فقہاء کا کہنا ہے کہ بیٹا اور پوتا دونوں عصبہ ہوتے ہیں۔ اور یتیم پوتا، چونکہ متوفی کے حقیقی بیٹے کی موجودگی میں قریب ترین رشتہ دار مرد نہیں ہے۔ بلکہ اَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ (قریب ترین مرد، رشتہ دار) اس کا حقیقی بیٹا ہے۔ لہٰذا ذوی الفروض کو ان کے حصے دے کر جو کچھ باقی بچتا ہے وہ متوفی کے حقیقی بیٹے کا حق ہے۔ پوتے کا نہیں ہے۔ اس حدیث میں ہمارے فقہاء کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ انہوں نے حدیث کے الفاظ کو اپنے علم الفرائض کی اصطلاحات پر چسپاں کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حالانکہ علم الفرائض کی یہ اصطلاحات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بہت بعد کی پیداوار ہیں

انھوں نے اس حدیث کا یہ مطلب نکال لیا ہے کہ ذوی الفروض کو ان کے حصے دے کر جو مال بچے وہ عصبات میں قریب ترین عصبہ کو دیدو۔ حالانکہ ذوی الفروض، ذوی الارحام، عصبات یہ سب علم الفرائض کی بعد کی اصطلاحات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْحِقُوا اَلْفَرَائِضَ بِاَھْلِھَا عام لغوی معنوں میں فرمایا تھا کہ جو متعینہ حصے ہیں وہ حق داروں کو دے کر ایک قریبی عزیز کو باقی بچا ہوا مال دیدو۔ بیٹا پوتا حق داروں میں سے ہیں۔ ان سب کو ان کے اپنے اپنے حصے دے کر جو مال بچ جائے وہ میت کے قریب ترین رشتہ دار کو دیدینا چاہیئے۔ مثلاً بیٹے، بیٹیوں، اور بھائی بہنوں کی ملی جلی صورت میں اگرچہ ہمارے فقہار کی اصطلاح میں یہ سب عصبات ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کریم نے لِلذَّکَرِ مِثْلَ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے الفاظ سے ان کے حصے متعین کر کے ان کی تشریح کر دی ہے کہ ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر یا ایک بھائی کا حصہ دو بہنوں کے برابر ہوگا اسلئے یہ سب حصے مقرر شدہ ہیں اور الحقوا الفرائض باھلھا کے مفہوم میں داخل ہیں۔ وہ ذوی الفروض ہوں یا عصبات ہوں۔ انھیں ان کے متعین حصے دیدینے کے بعد جو ترکہ باقی بچے وہ قریب ترین رشتہ دار کو دے دو جن کے حصے متعین نہیں ہیں۔ مثلاً یہ نقشہ دیکھئے۔

(نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

مسئلہ ۶

دور کے چچیرے بھائی کا بیٹا	بیٹی	ماں
$\frac{۲}{۶}$	$\frac{۳}{۶}$	$\frac{۱}{۶}$

اور چچیرے بھائی کی بیٹی
محروم الارث

اس مثال میں ماں اور بیٹی ذی الفروض میں سے ہیں یعنی جن کا حصہ قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ ماں کا چھٹا حصہ اور بیٹی کا نصف ہے۔ باقی ایک تہائی کے لئے دو رشتہ دار موجود ہیں اور سارے رشتہ داروں میں جو باقی رہ گئے ہیں یہی دونوں قریب ترین ہیں۔ ایک دور کے چچیرے بھائی کا بیٹا اور دوسرے دور کے چچیرے بھائی کی بیٹی۔ چونکہ ان دونوں کے حصوں کی تعیین کتاب اللہ میں نہیں کی گئی ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ باقی رشتہ داروں میں سے جو اب قریب ترین ہوں، ان میں سے مذکر کو باقی مال دے دو۔ لہٰذا دور کے چچیرے بھائی کے بیٹے کو باقی تہائی دیدی جائے گی اور دور کے چچیرے بھائی کی بیٹی کو کچھ نہیں ملے گا۔

ایک اور مثال دیکھئے۔

مسئلہ ٦

پچازاد پھوپی	پچازاد چچا	بیٹی	ماں
محروم	۳/٦	۳/٦	۱/٦

اس مثال میں ماں اور بیٹی تو ایسے رشتہ دار ہیں جن کے حصے قرآن سے مقرر شدہ ہیں۔ ماں کا چھٹا حصہ اور بیٹی کا نصف۔ یہ کل چار حصے ہوے۔ دو حصے باقی بچے اور باقی رشتہ داروں میں اب قریب ترین رشتہ دار بھی دو ہیں۔ ایک تو چچازاد چچا اور دوسرے چچازاد پھوپھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ یہ جو دو حصے بچ گئے ہیں وہ ان دونوں میں سے یعنی چچا زاد چچا اور چچازاد پھوپھی میں سے جو قریب ترین مرد رشتہ دار ہو اُسے دیدو۔ لہذا چچازاد چچا کو بقیہ دو حصے دیدئے جائیں گے اور چچازاد پھوپھی محروم رہے گی۔ اس حدیث کا مطلب یہی ہوسکتا ہے۔ ہمارے فقہاء نے جو کچھ سمجھا ہے وہ صحیح نہیں بیٹھتا۔

مثلاً یہ مثال دیکھئے

اصل مسئلہ ٦ ــــ ۱۸

بیٹا	بیٹی	ماں
۱۰/۱۸	۵/۱۸	۳/۱۸

اس مثال میں ماں ذوی الفروض میں سے ہے جسے میراث کا چھٹا حصہ بنص قرآنی ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد باقی ترکہ قرآن کے مطابق تو لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے مطابق $\frac{١٠}{١٨}$ اور $\frac{٥}{١٨}$ کے حساب سے بیٹے اور بیٹی کو ملنا چاہیے۔ لیکن حدیث کے مطابق اَوْلیٰ رَجُلٍ ذَکَرٍ یعنی بیٹے کو سارا ترکہ مل جانا چاہیئے اور بیٹی کو محروم ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔
ایک اور مثال دیکھئے۔

اصل مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بہن	بھائی
$\frac{٣}{١٨}$	$\frac{٩}{١٨}$	$\frac{٢}{١٨}$	$\frac{٤}{١٨}$

اس مثال میں ماں اور بیٹی دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں۔ ماں کا چھٹا حصہ اور بیٹی کا نصف قرآن سے متعین ہے باقی جائداد کی تقسیم یوں ہونی چاہیئے کہ بھائی کو بہن سے دوگنا دیا جائے۔
لیکن اگر مذکورہ حدیث پر عمل کیا جائے تو اَوْلیٰ رَجُلٍ ذَکَرٍ کے اعتبار سے سب بھائی کو مل جانا چاہیئے اور بہن کو محروم ہونا چاہیئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔
ایک اور مثال دیکھئے۔

مسئلہ - ۶

بھتیجا	بہن	دو بیٹیاں
محروم	٢/٦	٤/٦

اس مثال میں دو بیٹیاں ذوالفروض میں سے ہیں۔ جن کا حصہ نص قرآنی ترکہ کا دو تہائی ہے اور باقی ایک تہائی بہن لے لیگی۔ کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ یعنی بیٹیوں کے ساتھ بہنیں ہوں تو انھیں عصبہ قرار دیدو لہٰذا بہن باقی ایک تہائی عصبہ کی حیثیت سے لیلے گی اور بھتیجا محروم رہے گا۔ یہ تقسیم صحیح اور مسلمہ ہے لیکن بخاری کی اس حدیث کے مطابق دو تہائی دونوں بیٹیوں کو دے کر باقی ایک تہائی بھتیجے کو ملنا چاہئے کیونکہ وہ اَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

ایک اور مثال دیکھئے یہ مشہور مثال علمائے فرائض کی اصطلاح میں مسئلہ التشبیب کے نام سے مشہور ہے جو فرائض کی مشہور کتاب "السراجی" کی فصل فی النساء کے صفحہ ٢٥ پر مذکور ہے۔

مسئلہ ٦ — ١٨

ایک پڑپوتی	دو پوتیاں	دو بیٹیاں
١/١٨	٢/١٨	١٢/١٨

ایک پڑپوتے کی بیٹی	ایک پڑپوتے کا بیٹا
$\frac{1}{18}$	$\frac{2}{18}$

اس مثال میں بیٹیاں ذوی الفروض میں سے ہیں۔ جن کا حصہ قرآن کی طرف سے دو تہائی مقرر ہے۔ باقی ماندہ $\frac{1}{3}$ حصہ بخاری شریف کی حدیث کے مطابق "اَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ" کی حیثیت سے پڑپوتے کے بیٹے کو ملنا چاہئے۔ کیونکہ ذوی الفروض کے بعد وہ قریب ترین مرد رشتہ دار ہے۔ اور پوتیاں، پڑپوتی۔ پڑپوتے کی بیٹی سب محروم الارث ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ان میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مگر علمائے فرائض کے نزدیک مسلمہ صورت یہ ہے کہ حقیقی بیٹیوں کو ان کا حصّہ کل ترکہ کی دو تہائیاں دے کر جو ایک تہائی ترکہ بچے وہ ان سب میں اس نسبت سے تقسیم کر دیا جائے کہ مرد کو دو لڑکیوں جتنا حصہ دیا جائے کیونکہ پڑپوتے کے بیٹے نے ان سب کو عصبہ بنا دیا ہے اور اب باقی ترکہ باوجود اوپر نیچے درجہ رکھنے کے مرد کو دو حصے اور لڑکیوں کو ایک ایک حصے کی نسبت سے تقسیم ہوگا۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول کلّی بیان فرمایا تھا کہ "اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَلِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ" (مقررہ حصے ان کے حق داروں کو دے کر جو باقی بچے وہ قریب ترین مرد رشتہ دار کا حصّہ ہے) اسکا

مطلب وہ نہیں ہے جو ہمارے فقہاء نے سمجھا ہے کیونکہ اس مطلب کی بناء پر یہ قاعدہ قدم قدم پر ٹوٹ جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا اصول بیان فرمائیں جو ہر قدم پر ٹوٹ جائے ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ لامحالہ اس کا مطلب وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کہ اھل الفرائض سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حق داروں کو مراد لیا ہے جن کے حصے قرآن میں مقرر شدہ ہیں عام اس سے کہ فقہاء کی اصلاح میں ان کو ذوی الفروض کہا جاتا ہو یا عصبات کہا جاتا ہے اور اَوْلٰی رَجُل ذکر سے مراد وہ مرد قریبی رشتہ دار ہے جو مذکورہ رشتہ داروں سے الگ ہو یعنی قرآن کریم نے ان کا کوئی حصہ مقرر نہ کیا ہو۔ کیونکہ علم الفرائض کی یہ اصطلاحات کہ ورثاء تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام بہت بعد کی اصطلاحات ہیں۔ ان اصطلاحات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں تلاش کرنا بے معنی سی بات ہے۔

ہماری اس تفصیل کے مطابق يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کے بناپر (اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مذکر کو مونث سے دوگنا حصہ ملے گا) چونکہ ولد میں پوتا، پڑپوتا، نواسا، پڑنواسا، ایسے ہی پوتی، پڑپوتی، نواسی پڑنواسی نیچے سے نیچے تک سب داخل ہیں۔ اس لئے وہ اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا کے مطابق حق داروں میں سے ہیں اور ان کا حصہ قرآن کریم سے مقرر شدہ

ہے۔ان کو تو اولاد ہونے کی حیثیت سے ہر مذکر کو مونث سے دوگنے کے حساب سے ترکہ میں حصہ ملے گا ہی۔ ان کے حصے تقسیم کر دینے کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر کچھ ترکہ باقی بچا ہے تو قریب ترین مرد رشتہ دار کو جس کا حصہ قرآن نے مقرر نہیں کیا اسے دیدیا جائے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی یتیم پوتے کو محروم نہیں کرتی بلکہ اس کی وراثت کے لئے دلیل ہے۔

قائم مقامی

علماء اہل سنت والجماعت اور شیعوں کے درمیان قائم مقامی کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمائے اہل سنت کے نزدیک قائم مقامی کی بنیاد پر کوئی شخص وراثت کا حق دار نہیں ہوتا کہ بیٹا مرگیا ہے تو پوتا اس کا قائم مقام ہوکر وارث بن جائے جبکہ شیعہ مذہب کے مطابق قائم مقامی ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے شیعہ مذہب میں بیٹا مر جائے تو پوتا اس کا قائم مقام ہوکر وارث بن جاتا ہے اور اہل سنت کے ہاں قائم مقامی کے مسئلہ کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اس لئے وہ پوتے کو وارث نہیں قرار دیتے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا یہ اختلاف کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے کہ یتیم پوتے کو محروم قرار دے دیا جائے۔ اہل سنت کے ہاں قائم مقامی کے نام سے کوئی اصول موجود نہیں مگر اسی سے ملتا جلتا ایک دوسرا اصول موجود ہے کہ میت کے اصول و فروع میں کوئی بالواسطہ رشتہ دار، واسطہ کے وفات پاجانے کی صورت میں وارث ہو جائے گا۔ اس اصول کا مآل

بھی وہی ہے جو قائم مقامی کے اصول کا ہے۔ مثلاً کسی شخص کا باپ اور دادا دونوں موجود ہیں تو وراثت باپ کو ملے گی دادا کو نہیں ملے گی، لیکن اگر باپ وفات پا جائے تو اب دادا باپ کی حیثیت سے ترکہ کا وارث ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی کی ماں بھی موجود ہے اور نانی بھی موجود ہے تو وراثت ماں کو ملے گی نانی کو نہیں ملے گی لیکن اگر ماں مر جائے تو پھر نانی ماں کی حیثیت سے وراثت کی حق دار ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر بیٹا اور پوتا (یعنی اسی بیٹے کا بیٹا) دونوں موجود ہوں تو بیٹا وارث ہوگا۔ پوتے کو وراثت نہیں ملے گی، لیکن اگر بیٹا مر جائے تو چونکہ درمیانی واسطہ باقی نہیں رہا تو پوتا بحیثیت بیٹے کے وارث ہو جائے گا۔ مسئلہ زیر بحث میں چونکہ پوتے کا چچا اس کے درمیان اور اس کے دادا کے درمیان واسطہ نہیں تھا بلکہ واسطہ اس کا باپ تھا تو چچا کی موجودگی سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نہ تو وہ واسطہ تھا نہ وہ حاجب ہوگا۔ لہٰذا اس کی وجہ سے پوتا محروم نہیں ہو سکتا۔ شیعہ اور اہل سنت کے مسلک میں فرق یہ ہے کہ شیعہ مسلک میں قائم مقامی کے اصول کے مطابق وراثت کی تقسیم بلحاظ نسب عمل میں لائی جاتی ہے۔ یعنی قائم مقام وہ حصہ حاصل کرے گا جو متوفی کو (اگر وہ زندہ ہوتا) ملتا۔ جب کہ اہل سنت کے ہاں وراثت علی الرؤس عمل میں لائی جائے گی

ذیل کی مثال سے شیعہ و سنی مسلک کا فرق واضح ہو جائیگا

مسئلہ متوفی زید

بیٹا حامد (مرگیا) — بیٹا محمود (مرگیا)

پوتا سعید — پوتا رشید — پوتا عمران

اس صورت میں اہل سنت کے مسلک کے مطابق
چونکہ دونوں بیٹے مر گئے ہیں اور اب تین پوتے موجود ہیں لہذا کل ترکہ $\frac{1}{3}$ کے حساب سے تینوں پوتوں میں مساوی تقسیم ہو جائیگا اور شیعہ مسلک کے مطابق رشید اور سعید، حامد کے قائم مقام ہیں ۔ حامد کا حصہ $\frac{1}{2}$ ہوتا اگر وہ زندہ ہوتا ۔ لہٰذا وہ حصہ دونوں پوتوں سعید اور رشید میں $\frac{1}{4}$ کے حساب سے تقسیم ہو جائے گا اور عمران کو جو محمود کا تنہا بیٹا ہے اور محمود کے مرجانے کی وجہ سے اس کا قائم مقام ہے ۔ لہٰذا اسے وہ حصہ ملے گا جو محمود کو ملتا ، اگر وہ زندہ ہوتا ۔ محمود کا اپنا حصہ $\frac{1}{2}$ تھا ۔ لہٰذ وہی عمران کو ملے گا

شیعہ مسلک اور سنی مسلک میں فرق صرف اتنا ہے لیکن یتیم پوتا شیعہ مسلک کے اعتبار سے وراثت کا حق دار قائم مقامی کے اعتبار سے ہے اور سنی مسلک کے اعتبار سے اس لئے ہے کہ دادا اور پوتے کے درمیان جو واسطہ بیٹے کا تھا وہ نہیں رہا ۔ دونوں مسلکوں کے اعتبار سے یتیم پوتے کو محروم قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

منکرین وراثت کا نقطہ نظر

دوسری طرف ہمارے علمائے کرام کی اکثریت ہی جو یتیم پوتے کو جب کہ اس کا باپ دادا کی حیات میں فوت ہو چکا ہو وراثت کا حق دار نہیں سمجھتے ۔ ان کا نقطہ نظر اور ان کے دلائل سمجھنے کے لئے ہم ذیل میں حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مختصر مضمون جو ماہنامہ انوار العلوم جامعہ اشرفیہ لاہور ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا ۔ بلا تبصرہ نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین جانبین کے نقطہ نظر اور فریقین کے دلائل پر غور و فکر کر کے خود ہی کوئی مناسب فیصلہ فرما سکیں ۔

پوتے کا حق وراثت

از حضرت العلام مولانا المولوی الحاج الحافظ الشاہ ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی زیدمجدہ

بعد الحمد والصلوٰۃ، جنوری ۱۹۵۴ء کے "طلوع اسلام" میں یہ بحث دیکھ کر میں نے چند صفحات کا مضمون لکھ کر اپنے ایک عزیز کو دیدیا تھا کہ نقل کر کے اخبار میں بھیج دیں۔ مگر اس نے اصل ہی بھیج دی اخبار والے نے اُس کو شائع نہ کیا تو مجھے دوبارہ اس پر قلم اٹھانا پڑا۔

یہ مسئلہ ایسا نہ تھا کہ جس پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہوتی کیونکہ چودہ سو برس سے امت کا اس پر اتفاق چلا آرہا ہے کسی نے بھی آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا قرآن کے خلاف ہے۔ اس کو تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف مسلمان بھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ چودہ سو برس سے امت اسلامیہ قرآن کے خلاف کسی مسئلہ پر متفق چلی آرہی ہے۔ یہ جسارت وجرأت مدیر طلوع اسلام جیسے منکرین حدیث ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ ایسے بدیہی اور اجماعی مسئلہ کو بھی قرآن کے خلاف بتلا رہے ہیں۔ اب ذرا اُن کے دلائل ملاحظہ ہوں

اس دعوے کی بنیاد اس پر ہے کہ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ

اَوْلَادِ کُمْ میں لفظ اولاد بیٹوں پوتوں پڑپوتوں سب کو شامل ہے۔ اسی طرح لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ میں الوالدان باپ دادا، پردادا، سب کو عام ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ جیسے چچا کی موجودگی میں بیٹا اپنے باپ کا وارث ہے اسی طرح چچا کی موجودگی میں پوتا بھی اپنے دادا کا وارث ہونا چاہئے کیونکہ اولاد میں پوتا بھی داخل ہے اور "الوالدان" میں دادا بھی شامل ہے۔ مگر اُن کو اتنی خبر نہیں کہ "اولاد" میں پوتوں، پرپوتوں کا داخل ہونا اور "الوالدان" کا دادا، پردادا کو شامل ہونا حقیقت نہیں بلکہ مجاز ہے۔ اسی طرح لفظ "ابا" اور "ابن" باپ بیٹے کیلئے حقیقت دادا اور پوتے لئے مجاز ہے۔

آیت میراث میں یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ کے بعد ہی اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا مذکور ہے جس نے ظاہر کر دیا کہ "الوالدان" سے مراد "آباء" ہیں اور اولاد" سے مراد "ابناء" ہیں۔ لغت عرب میں دادا کے لئے لفظ "جد" اور پوتوں کے لئے لفظ "حفدة" مستقل موجود ہے۔ قرآن میں

ؔ اور حقیقی معنے ہو سکنے کے وقت مجازی معنے مراد لینے جائز نہیں۔ تو کسی بیٹے کے ہونے کے وقت پوتا مراد لینا جائز نہیں۔ اور اس وقت پوتا اولاد کم کا مصداق ہی نہیں اس لئے مَا تَرَكَ الْوَالِدَانِ کے نصیب کا حق دار بھی نہیں ۱۲

ؔ یعنی مذکرین میں اول درجہ میں یہ مراد ہیں یہ جب نہ ہونگے اس وقت مجازی معنے مراد لئے جائیں گے ۱۲

بھی دوسری جگہ اس کا استعمال موجود ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً

(سورۃ النحل)

اللہ نے تمھارے واسطے تمھاری بیبیوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

اب ان کو اس پر دلیل قائم کرنا چاہیئے کہ آیت میراث میں "الوالدان" اور "اولاد" کو حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں استعمال کیا گیا ہے ائمہ تفسیر و فقہ کے اجماع سے استدلال کرنے کا ان کو حق نہیں کیونکہ

ہے کیونکہ حقیقی معنی کو بغیر دلیل کے چھوڑنا جائز نہیں ۱۲

ے یعنی اول تو کسی مفسر نے یہ کہا ہی نہیں کہ لفظ ولد پوتے پر حقیقت ہو کر بولا جاتا ہے اور کہا ہوگا تو اس کی غلطی بتائی گئی ہوگی۔ لیکن اگر مفسر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ لغت والوں نے اور فقہ والوں نے اور ساری امت نے بھی اگر کہیں یہ کہہ دیا ہوتا کہ ولد کے حقیقی معنی پوتا ہیں۔۔۔ ۔۔۔ اور سب کا اس پر اجماع ہوتا تو ان کو اجماع سے استدلال کا حق نہیں جو دوسری جگہ اجماع کو قبول نہیں کرتے یہاں کیسے کرتے ہیں؟ دوسرے ان سب کا پھر یہ اجماع ہے کہ بیٹے کے ہوتے پوتا وارث نہیں تو اس دوسرے اجماع کا مطلب ہوگا کہ اگر پوتا ولد کے حقیقی معنے ہیں تو اس وقت بھی بیٹے کے ہوتے وارث نہیں جب اس اجماع کو تسلیم کیا جائے تو اس کو بھی تو ماننا ضروری ہوگا پھر پوتا بیٹے کے ہوتے ہوئے وارث نہیں ہو سکتا ۱۲

ان کا تو اس پر بھی اجماع ہے کہ بیٹے کے ہوتے پوتا وارث نہیں ہوتا۔ ایک جگہ اجماع کو ماننا دوسری طرف ٹھکرا دینا ناحق کی زبردستی ہے۔

پھر اگر قرآن سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث ہونا ثابت ہے تو اسے ہر حال میں وارث ہونا چاہیئے خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مرچکا ہو اس کی کیا دلیل ہے کہ یتیم پوتا تو دادا کا وارث ہوگا غیر یتیم وارث نہ ہوگا؟ اور جو دلیل طلوع اسلام نے بیان کی ہے وہ اس کی من گھڑت ہے۔ قرآن کی طرف اس کو منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس سوال کے حل کے لئے دوسرا اصول سامنے آتا ہے قرآن نے اقربون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقرب کے معنے ہیں وہ میت جس کے اور وارث کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو"۔ یہ کس قدر بے باکی اور جسارت ہے کہ قرآن نے تو والاقربون کو الوالدان پر عطف کیا تھا۔ آیت کا مطلب یہ تھا کہ "مردوں عورتوں کا حصہ ہے اس چیز میں جو والدین اور نزدیکی قرابت دار چھوڑ جائیں"۔ جس سے ہر سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے والاقربون کا مصداق والدین نہیں بلکہ ان کے علاوہ دوسرے قرابت دار ہیں۔ مگر طلوع اسلام اس کو والدین اور اولاد کے ساتھ چسپاں کرنا چاہتا ہے پھر اقرب کے معنی میں "موجود" کی قید لگانا کہ میت کے اور وارث کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو خالص ایجاد بندہ ہے جس پر وہ کوئی دلیل قرآن یا لغت سے قائم نہیں کر سکتا۔

اقرب قریب کا اسم تفضیل ہے جس کے معنی ہیں قریب تر اور قریب ترہ وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان واسطہ نہ ہو۔ جس کے درمیان میں واسطہ ہوگا وہ اقرب نہیں بلکہ بعید ہے خواہ واسطہ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ پوتا دادا کا اقرب نہیں خواہ یتیم ہو یا غیر یتیم بلکہ بیٹا اقرب ہے۔ تو جس طرح پوتا اپنے باپ کی موجودگی میں دادا کا وارث نہیں ہو سکتا اسی طرح اپنے چچا کی موجودگی میں بھی دادا کا وارث نہیں ہو سکتا کیونکہ چچا دادا کا اقرب ہے۔ پھر نہ معلوم طلوعِ اسلام کو یتیم پوتے ہی سے کیوں ہمدردی ہے۔ یتیم پوتی سے ہمدردی کیوں نہیں؟ اس کو اس کا بھی قائل ہونا چاہئے کہ یتیم پوتی بھی اپنے چچا کی موجودگی میں دادا کی وارث ہوگی۔ مگر چونکہ پنجاب کے جاہلوں کو لڑکیوں کا وارث ہونا گوارا نہیں اس لئے وہ ان کی خاطر صرف

ے یعنی قریب تر دو طرح کا ہوتا ہے حقیقی کہ بلا واسطہ ہو اور نسبتی کہ دوسروں کی نسبت سے قریب ہو بلا واسطہ بیک واسطہ سے، بیک واسطہ بدو واسطہ سے اور اتحاد درجہ میں قوت و تعدد علاقہ سے ہو یہاں بیٹے اور پوتے میں اقرب وہ ہے جو بلا واسطہ ہو کہ حقیقی اقرب یہی ہے۔ پوتا بواسطہ ہے خواہ واسطہ زندہ ہو یا مردہ یہ اقرب حقیقی نہیں ہاں بیٹا کوئی بھی زندہ نہ رہے تو یہ اقرب نسبتی ہو سکتا ہے کہ پڑپوتے کی نسبت اقرب ہے اور بیٹے کے ہوتے نہ حقیقی اقرب نہ نسبتی، چاہے بیٹا اس کا باپ ہو یا چچا۔ ۱۲

یتیم پوتے ہی کی میراث پر زور دینا چاہتا ہے۔

اگر اقرب کے وہی معنی ہیں جو طلوع اسلام بیان کرتا ہے تو یتیم بھتیجے اور یتیم بھانجے اور یتیم نواسے کو بھی میت کے بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی میں وارث ماننا چاہئے کیونکہ ان کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہیں۔[۵۷]

یہ ہے منکرین حدیث کی قرآن فہمی کہ وہ الفاظ کے معنی خود گھڑتے

---

۵۷ اسلم جیراج پوری کے مضمون اور ضمیمہ بل میں گو یہ سب ہیں مگر طلوع اسلام میں نہیں لہذا یہاں اتفاق سے حق بات مان لی گئی ہوگی کیونکہ قرآن شریف میں بھانجے کا حصہ نہ معین طریق پر ہے کہ ذوی الفروض ہوں نہ باقی ملنے پر ہے کہ عصبات ہوں ان سب کے نہ ہونے پر کلیہ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ سے ہے اور ایسے ہی نواسے۔ کیونکہ وہ ولد میں داخل نہیں اس لئے کہ نسب، باپ کی طرف سے ہوتا ہے ماں کی طرف سے نہیں آیت وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ سے یہ ثابت ہے اس لئے وہ بھی نہ معینہ حصہ میں ہے نہ باقی والوں میں یہ بھی ذوی الارحام میں داخل ہے۔ مگر حدیث شریف کے حکم سے صرف بھتیجا باقی لینے والوں میں ہوتا ہے جب وہ اقرب نسبتی بنتا ہو کہ اس سے قریب کا کوئی نہ ہو۔ شاید یہاں طلوع اسلام نے عادت کے خلاف اس کو مان لیا ہوگا۔ اب جہاں اپنی عادت کے خلاف اس کو مانا تو اس کو بھی ماننا ضروری ہے کہ پوتا جو اقرب نسبتی ہو سکتا ہے اقرب حقیقی کے سامنے محروم ہے ورنہ ان کا بھی انکار لازم آئے گا ۱۲

ہیں اور اپنی من گھڑت باتوں کو قرآن کی طرف منسوب کر کے امت کے اجماعی قول کو قرآن کے خلاف قرار دیتے ہیں ۔

ان لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ جس طرح یتیم پوتے کو چچا کی موجودگی میں دادا کی میراث سے بے تعلق کیا گیا ہے اسیطرح چچا کو بھی اس یتیم کے باپ کی میراث سے محروم کیا گیا ہے ۔ اگرچہ وہ لاکھوں روپیہ چھوڑ کر مرا ہو ۔ کیونکہ بیٹے کے ہوتے بھائی اقرب نہیں ۔ رہا یہ سوال کہ اگر یتیم پوتے کا باپ کچھ بھی چھوڑ کر نہ گیا ہو اور دادا کی میراث کا حقدار اس کا چچا ہو گیا تو اس یتیم پوتے کی پرورش کیونکر ہو گی ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دادا اس یتیم پوتے کے لئے اپنی زندگی میں جائداد کا کچھ حصہ نامزد کر سکتا ہے یا اسکے لئے وصیت کر سکتا ہے ۔ اگر دادا نے کچھ نہ کیا تو ایسے نادار یتیم کی پرورش اس کے چچا کے ذمہ ہے ۔ حاکم شرع اس کو مجبور کرے گا کہ اپنے یتیم بھتیجے کی تعلیم و تربیت اور نان و نفقہ کا پورا اہتمام کرے ۔ پھر اسلامی بیت المال میں بھی یتیموں بیواؤں کا بڑا حق ہے جس کے بعد وہ پریشان نہیں ہو سکتے منکرین حدیث کو نہ آئین اسلام کی کچھ خبر ہے نہ وہ پاکستان میں اس کو جاری کرانا چاہتے ہیں بس قرآن میں خواہ مخواہ تحریف کر کے علماء اسلام اور فقہائے امت کو بدنام کر کے اپنا من گھڑت آئین چلانا چاہتے ہیں جس کا نمونہ اسی ایک مسئلہ سے ظاہر ہو رہا ہے ۔

والسلام

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ ۔ از ڈھاکہ ۹ ۲/۵۴

کتابُ الوقفُ

وقف کے سلسلہ مسائل پر گفتگو کرنے سے پہلے چند باتیں سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ کتاب الزکوٰۃ میں ہم ملکیت کے تصور پر قرآنی نقطۂ نظر سے طویل بحث کر چکے ہیں۔ اسے دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ ملکیت کا جو تصور ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ مالک ہر چیز کا اللہ ہے۔ افراد کو کسی چیز کی ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ افراد کو اشیائے کائنات سے صرف استفادہ کا حق ہے۔ ہر چیز افراد کے پاس امانت ہے۔ وہ ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔ تمام اشیائے کائنات مباحات کے ضمن میں آتی ہیں جو تمام نوع انسانی کے لئے ہیں۔ ان پر اس شخص کا حق ہے جو ان کو پہلے حاصل کر کے اپنے قبضہ میں لیلے۔ جیسا کہ مَوات (افتادہ زمین) پر اسی شخص کا حق ہے جو اسے آباد کرے۔ یہی صورت تمام اشیائے کائنات کی ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے

اَفَرَاَیۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰہُمۡ سِنِیۡنَ ($\frac{۲۶}{۲۰۵}$)

ذرا بتاؤ تو اگر ہم نے انھیں چند سال کے لیے
فائدہ اٹھانے کا حق دے دیا ہے الخ

سورۂ صٰفّٰت میں ہے

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۳۷/۱۴۸)

چنانچہ وہ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک
وقت مقررہ تک فائدہ اٹھانے کا حق دے دیا۔

سورۂ بقرہ میں ہے

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ
اِلٰى عَذَابِ النَّارِ (۲/۱۲۶)

اللہ نے فرمایا، جو کفر کرے گا اسے بھی ہم تھوڑے
عرصہ کے لئے فائدہ حاصل کرنے کا حق دیدیں گے
پھر اسے جہنم کے عذاب کی طرف دھکیل دیں گے۔

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بہت سی ہیں۔ ہم نے نمونۃً صرف تین آیتیں پیش کر دی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم اشیائے کائنات میں جو تصرفات کرتے ہیں وہ مالکانہ تصرفات نہیں ہوتے بلکہ ہمیں جو استفادہ کا حق حاصل تھا اس حق کو ہم دوسروں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ ہمارے تمام خرید و فروخت، ہبہ، عاریت، اور وصیت یا وراثت کے معاملات کی حقیقت یہی ہے۔

دوسری اہم بات جو سمجھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا عام اسلوب یہ ہے کہ جو چیز مفاد عامہ کے لئے یعنی پوری

نوع انسانی کے لئے ہوتی ہے اسے قرآن کریم حق تعالے کی طرف منسوب کر دیتا ہے

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۷/۱۲۸)

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اسے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے دیدے۔

سے یہی مراد ہے کہ زمین کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ وہ پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔ وہ جسے چاہے اس کا وارث بنا دے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (۵۹/۷)

اللہ جو کچھ اپنے رسول کو مختلف آبادیوں سے بغیر جنگ کے دلا دے وہ اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے

ظاہر ہے کہ اللہ ان چیزوں کا محتاج نہیں ہے۔ نہ اسے ان چیزوں کی ضرورت ہے اس کے معنے یہی ہیں کہ یہ تمام چیزیں مفاد عامہ کے لئے ہیں۔ ان پر تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ وہ کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتیں۔ اور

یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸/۱)

لوگ آپ سے اموال غنیمت کے بارے میں سوال

کرتے ہیں ۔ (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ
اور رسول کے لئے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ اللہ کو ان اموال غنیمت کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی ۔ ساری کائنات اسی کی ہے ۔ اس کا مطلب، یہی ہے کہ اموال غنیمت کسی خاص شخص کا حق نہیں ہیں ۔ وہ مفاد عامہ کے لئے ہیں ۔ ان پر تمام مسلمانوں کا حق ہے ۔

وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضَاعَفُ لَھُمْ
وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (۵۷/۱۸)

اور جنھوں نے اللہ کو قرض حسنہ دیا ۔ اُن کو کئی گنا
اجر دیا جائے گا اور انھیں شریفانہ اجر ملے گا ۔

ظاہر ہے کہ اللہ کو قرض کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اسے بندوں کی دولت کی کیا ضرورت ہے ۔ مطلب یہی ہے کہ انسانیت کے مفاد عام کے لئے اپنی مملکت کو روپیہ پیسہ دو تاکہ اس کا اجر تمھیں دیا جا سکے ۔ قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بے شمار ہیں ۔ (۵/۳۴ ، ۸/۲۷ ذ ۹/۱۰۷ ذ ۵۸/۵ ذ ۵۸/۲۰ ذ ۵۹/۵۲ ذ ۶۴/۱۷ ذ ۷۳/۲۰ ذ ۸/۴۱ ذ ۹/۱ ذ ۹/۳ ذ ۲/۱۱۴ ذ ۹/۱۷ ذ ۹/۱۸ ذ ۹/۹۱ ذ ۱۱/۶ ذ ۲۴/۲۳ ذ ۴۲/۱۰ ذ ۵۷/۱۰ ذ ۶۴/۱۴ ذ ۷۲/۱۸ ذ) ان تمام آیات میں مختلف چیزوں کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور وہ تمام اشیاء مفاد عامہ سے تعلق رکھتی ہیں ۔ بعض چیزیں پوری نوع انسانی سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض چیزیں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے،

اس کے بعد ان آیات پر غور فرمائیے۔ سورۂ جن میں ہے

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ
اَحَدًا ٥ (۷۲/۱۸)

اور مسجدیں اللہ کے لئے ہیں تو اللہ کے ساتھ
کسی اور کو (شریک بناکر) نہ پکارو۔

نیز سورۂ بقرہ میں ہے

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۔
(۲/۱۱۴)

اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو
اللہ کی مسجدوں سے (لوگوں کو) روکے کہ ان میں
اس کا نام لیا جائے اور ان کی ویرانی کی کوشش
کرے۔

سورۂ توبہ میں ہے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ
وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (۹/۱۸)

اللہ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد رکھ سکتے ہیں جو

---

۵۷ اَلْمَسَاجِدُ کے معنے بعض حضرات نے بجائے مسجدوں کے سجدوں کے کئے ہیں۔ دونوں ترجمے صحیح ہیں۔ ہم نے پہلے ترجمہ کو اختیار کرلیا ہے کہ وہ بھی غلط نہیں ہے۔

اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہوں، صلوٰۃ
قائم کرتے ہوں، زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور اللہ
کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔

اس سے پہلے ہے

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ
شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ

(۹/۱۰)

مشرکین کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مسجدوں
کو آباد کریں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے خلاف
کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔

ان تمام آیات میں مساجد کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ مسجد بنانے والوں نے جہاں یہ مسجدیں تعمیر کی تھیں انہی زمینوں پر بنائی تھیں جو ان کے قبضہ میں تھیں اور جن سے انھیں منفعت حاصل کرنے کا حق تھا۔ انھوں نے اپنے حق کو مفاد عامہ کی طرف منتقل کر دیا اور اپنا قبضہ اٹھالیا، تاکہ لوگ ان مسجدوں میں بلا روک ٹوک آ جا سکیں اور اللہ کا نام لے سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مباح چیز پر قبضہ کر لینے کے بعد جو انتفاع کا حق اسے حاصل ہوا تھا۔ آدمی اسے مفاد عامہ کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ یعنی اصل کے اعتبار سے ہر چیز مباح تھی جو اس پر پہلے قبضہ کرلے وہ اس کی ہو جاتی تھی۔ آدمی اپنے اس قبضہ

کو اٹھا کر اسے پھر اپنی اصل حالتِ اِباحت کی طرف لوٹا دیتا ہے اور اسے مفادِ عامہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے وقف کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ کسی چیز کو جو کسی فرد کے قبضۂ اقتدار و انتفاع میں تھی وقف کر کے مفادِ عام کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے اور اپنا انفرادی قبضہ اس سے اٹھا لیا جاتا ہے - لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ وقف کی یہ صورت قرآن کریم کے عین مطابق ہے اور یہ جائز ہے - مفادِ عامہ کی طرف جس چیز کا قبضہ اور انتفاع کا حق منتقل کیا جائیگا وہ اسلامی حکومت کی تحویل میں رہے گی اور وہی اس کا انتظام و انصرام کرے گی - اس کے بعد وقف کرنے والے شخص کا قبضہ ختم اور اس سے اس کے انتفاع کا حق ساقط ہو جائے گا - اب اس کے تمام حقوق مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یعنی اسلامی حکومت کی طرف منتقل ہو جائیں گے وہ شخص جس کے قبضہ میں وہ چیز تھی ہر قسم کا تصرف کرنے کا حق رکھتا تھا - وہ زمین پر کوئی عمارت بنائے - وہ بنائی ہوئی عمارت کو ڈھائے جو چاہے کرے کر سکتا تھا - اب یہ تمام حقوق اسلامی حکومت کو حاصل ہو گئے ہیں - وہ مفادِ عامہ کے لئے اس میں رد و بدل بھی کر سکتی ہے - وہ اس کو منہدم کر کے دوسری جگہ پر اسے تبدیل بھی کر سکتی ہے - وقف کر دینے کے بعد اس میں کسی قسم کا کوئی تقدس پیدا نہیں ہو جاتا - یہ صرف انتفاع کے حق کو منتقل کر دینے کا نام ہے - اس سے

زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ وقف کرنے والے شخص کی ملکیت اس وقت تک ساقط نہیں ہوگی جب تک حاکم وقت اس کی تصدیق نہ کر دے۔ نیز اس صورت میں بھی اس کی ملکیت ساقط ہو جائے گی جب کہ وقف کرنے والا یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد فلاں چیز اللہ کے لئے (یعنی مسلمانوں کے مفاد عامہ کے لئے) وقف ہے

(ہدایہ ص ۶۳۶ ج ۳)

واضح رہے کہ حضرت امام صاحب کا مطلب ملکیت سے وہی حق کا انتفاع ہے۔ کیونکہ ملکیت کا وہ تصور جو ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ قرآن کریم کے صریح خلاف ہے۔ لہذا انتفاع کا یہ حق اسی وقت منتقل ہو سکتا ہے جب وہ ہیئت اجتماعیہ اسے قبول کرے جس کی طرف وہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ نیز اگر اس نے یہ کہا ہے کہ میں مر جاؤں تو فلاں چیز وقف ہوگی اس صورت میں بھی اس کے مر جانے کے بعد تمام حقوق منتقل ہو جانے چاہئیں۔ کیونکہ آدمی کے مر جانے کے بعد اس کے جو حقوق تھے وہ ختم ہو چکے ہیں اور آدمی کو اپنی زندگی میں اپنے قبضہ میں تمام چیزوں کے متعلق تصرفات کا حق تھا۔ لہذا اس نے جو وقف کا تصرف کیا ہے وہ اپنی مقبوضہ چیز میں کیا ہے۔ لہذا اس کا یہ تصرف جائز ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی حاکم وقت کی تصدیق ضروری ہے کیونکہ جس (ہیئت

اجتماعیہ) کو یہ حقوق منتقل کئے جا رہے ہیں۔ اگر وہ اسے قبول ہی نہیں کرتا تو یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ حقوق کا ہبہ ہے۔ اور ہبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا جا رہا ہے) اسے قبول نہ کرے۔

امام شافعی اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف کرنے والے کی ملکیت صرف اس کے اس اعتراف سے ساقط ہو جاتی ہے کہ میں نے یہ چیز وقف کر دی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ملکیت اس وقت تک ساقط نہیں ہو گی جب تک وقف کرنے والا اپنے وقف کا کسی کو متولی مقرر کر کے اس کے قبضہ میں نہ دیدے۔ (ایضاً ہدایہ ص ۶۳۷ ج ۲)

امام محمد کے ارشاد میں ہمیں اس سے اختلاف ہے کہ کسی خاص فرد کو متولی مقرر کر کے موقوف چیز کو اسکے حوالہ کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ جو چیز مفاد عامہ کے لئے منتقل کی جائے (یعنی اللہ کے نام پر وقف کی جائے) اس کی نگرانی اور حفاظت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یعنی حکومت ہی کی طرف منتقل ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر وقف کرنے والے نے اپنے وقف کے انتظام کیلئے کوئی بورڈ مقرر کر دیا ہے۔ کوئی کمیٹی بنا دی ہے جسے حکومت کی منظوری اور نگرانی حاصل ہے تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ چیز بڑی حد تک حکومت ہی کی تحویل میں رہتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر رواج چلا آرہا ہے کہ کسی خاص شخص کو متولی بنا کر چیز اس کے سپرد کر دی جاتی ہے

(اور غالباً امام محمدؒ کا منشار بھی یہی ہے) اس میں بڑے مفاسد ہیں اور بالآخر وہ متولی ہی ان چیزوں کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ پھر یہ بات اصولاً بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ متولی ہیئت اجتماعیہ کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقف کرنے والے شخص کا نمائندہ ہوسکتا ہے۔ لیکن وقف جو اللہ کے نام پر کیا جاتا ہے اس کا تعلق عام مسلمانوں سے ہوتا ہے۔ کسی فرد واحد سے نہیں ہوتا۔ اور عام مسلمانوں کی نمائندہ اسلامی حکومت ہی ہوسکتی ہے۔

بعض لوگ ناجائز کاموں کے لئے وقف کر دیتے ہیں کہ فلاں مکان یا جائیداد کو میں اس لئے وقف کر رہا ہوں کہ اس کی آمدنی سے ہر سال محرم کے موقعہ پر تعزیئے بنائے جائیں، عَلم نکالے جائیں، مزارات پر چادریں چڑھائی جائیں۔ لنگر خانے چلائے جائیں، بزرگوں کی فاتحہ دلائی جائی وغیرہ ذلک۔ حکومت وقت کو ان خرافات کی پابندی لازم نہیں۔ وقف اللہ کے لئے یعنی مسلمانوں کے مفاد عامہ کے لئے ہے۔ اسلامی حکومت اس کی آمدنی کو مفاد عامہ ہی میں صرف کرے گی۔

امام شافعیؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ اسی کے قائل ہیں کہ وقف کی ہوئی چیز کو نہ فروخت کیا جا سکتا ہے نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے نہ اس میں وراثت جاری ہوسکتی ہے

(ہدایہ ص ۶۳۷ ج ۲)

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ ہبہ، وراثت اور

فروخت انفرادی قبضہ میں جاری ہو سکتی ہیں اجتماعی قبضہ میں نہیں ہو سکتیں ۔ اب یہ چیزیں انفرادی قبضہ میں نہیں رہیں ۔ جو چیزیں عام مفاد مسلمین کے لئے وقف کی جا چکی ہیں ان کو فروخت کر دینا، ہبہ کر دینا، اس میں وراثت جاری کرنا عام مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے ۔

لیکن حکومت وقت اس میں تبدیلی کر سکتی ہے یعنی جو حقوق اس کے قابض کو حاصل تھے وہ تمام حقوق اب حکومتِ وقت کو حاصل ہوں گے ۔ کیونکہ وقف انتقال حقوق ہی کا نام ہے ۔ وقف کرنے والے نے کوئی عمارت یا کوئی زمین کے لئے یا اسکول اور کالج کے لئے وقف کی تھی ۔ لیکن اس علاقہ میں مدرسے، اسکول اور کالج کافی ہیں، وہاں اس کے بجائے مفاد عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہسپتال یا ڈسپنسری یا پبلک پارک بنا دیا جائے تو حکومت اسلامی ایسی تبدیلی کر سکتی ہے ۔

ایسے ہی کسی نے کوئی مسجد بنائی تھی ۔ مفاد عامہ کا تقاضا وہاں شاہراہ تعمیر کرنے کا ہے ۔ لیکن وہ مسجد اس شاہراہ میں حارج ہو رہی ہے ۔ تو مفاد عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس مسجد کو منہدم کر کے شاہراہ میں شامل کر لینا اور اس سے ہٹ کر دوسری جگہ مسجد کو تعمیر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ کیونکہ جس شخص نے یہ زمین وقف کی تھی اسے مقبوضات میں ان تصرفات کا حق حاصل تھا ۔ اب اس کے حقوق حکومت کو منتقل ہو گئے ہیں ۔ لہٰذا حکومت کو بھی وہ تمام تصرفات جائز ہوں گے جو

وقف کرنے سے پہلے اصل قابض کو حاصل تھے۔

امام سرخسیؒ نے مبسوط میں امام ابو حنیفہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک وقف صحیح ہی نہیں ہوتا۔ امام صاحب کے نزدیک وقف کرنے سے ملکیت ساقط نہیں ہوتی۔ وقف کرنے والا اصل چیز کو تو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ صرف اس کے منافع کا صدقہ کرتا ہے۔ اور منافع موجود نہیں ہیں اور جو چیز موجود نہ ہو اس کو صدقہ کرنے کے کوئی معنے نہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ زید نے ایک زمین کو وقف کر دیا۔ امام صاحبؒ کے نزدیک وقف کر دینے کے معنے یہ ہیں کہ زمین تو وقف کرنیوالے کی ملکیت رہے گی لیکن اس سے جو پیداوار ہوگی وہ مفاد عامہ پر خرچ کی جائیگی۔ پیداوار چونکہ ابھی موجود نہیں ہے لہٰذا صدقہ کرنے کے کوئی معنے نہیں ہیں۔

(ایضاً ہدایہ ص ۶۳۷ ج ۲)

یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ملکیت کا وہ تصور جو عام طور پر لیا جاتا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ تو قرآن کریم کے خلاف ہے۔ جو شخص وقف کر رہا ہے وہ زمین کو نہیں بلکہ اس سے اپنے حق انتفاع کو وقف کر رہا ہے۔ اور وہ موجود ہے۔ معدوم نہیں ہے اگر اسے معدوم مانا جائے تو پھر ہبہ، عاریت، وصیت بیع و فروخت کے تمام دروازے بند ہو جانے چاہئیں۔

حالانکہ قرآن کریم نے ان تمام تصرفات کو جائز قرار دیا ہے (تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی)

امام ابوحنیفہ کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ

لاحبس عن فرائض اللہ تعالیٰ

(اللہ کے مقرر کئے ہوئے وراثت کے حصوں کو حبس کرنا یعنی ان کو معطل کر دینا جائز نہیں ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ نیز ابن ابی شیبہ نے حضرت شریح سے نقل فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ اس طرح کی روکی ہوئی (محبوس یا موقوف) چیزوں کو فروخت فرمایا کرتے تھے۔

(ہدایہ ودرایہ ج ۲ ص ۶۳۷)

یہ دلیل بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ ورثاء کے حقوق وقف کرنے والے کی زندگی میں جبکہ وہ مرض الموت میں مبتلا نہیں ہے اس کی مقبوضات سے متعلق نہیں ہوتے۔ ورثاء کے حقوق قابض کی موت کے بعد متعلق ہوں گے اگر قابض کی زندگی ہی میں ورثاء کے حقوق ثابت مان لئے جائیں تو نہ اسے ہبہ کرنا جائز ہونا چاہئے نہ بیع کرنا نہ وصیت کرنا۔ کیونکہ تمام صورتوں میں ورثاء کا حق معطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام تصرفات

سب کے نزدیک صحیح ہوتے ہیں ۔ تو وقف کا تصرف بھی صحیح ہونا چاہیئے ۔

دراصل (جہاں تک ہم سمجھتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات زمانۂ جاہلیت کی ان رسوم سے متعلق ہیں کہ وہ اونٹوں کو (سائبہ، حام وغیرہ کے نام سے) بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے کہ اب نہ ان سے کوئی منفعت حاصل کی جا سکتی تھی نہ ان کو فروخت کیا جا سکتا تھا نہ ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھایا جا سکتا تھا ۔ یہ بھی ان کے ہاں وقف ہی مانے جاتے تھے۔ ایسے اوقاف قطعًا ناجائز ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) اسی ذیل میں وہ اوقاف بھی آجاتے ہیں جو کسی مزار کے نام پر جانوروں کو چھوڑ دینے کی صورت میں کیئے جاتے ہیں ۔ نیز شیخ سدو کے بکرے بھی اسی ضمن میں آتے ہیں ۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک بھی نقل کیا جاتا ہے کہ صرف جائداد غیر منقولہ کو وقف کیا جا سکتا ہے ۔ منقولہ جائداد مثلاً نقد رقم، کتابیں، اسلحہ، مصاحف وغیرہ کو وقف نہیں کیا جا سکتا ۔ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ان منقولہ چیزوں کو وقف کیا جا سکتا ہے جو غیر منقولہ جائداد کے تابع ہوں ۔ مثلاً زمین کے ساتھ ہل، چرس، بیل وغیرہ وقف کیئے جا سکتے ہیں ۔ غیر متعلق اور غیر تابع چیزوں کا وقف صحیح نہیں ہوگا امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جسکے اصل کو باقی رکھتے ہوئے

نفع حاصل کیا جا سکے اور جس کو فروخت کرنا اور ہبہ کرنا صحیح ہو اس کو وقف کر دینا صحیح ہے۔

(ہدایہ ص ۴۳۹ - ۶۴۰ ج ۲)

ہمارے خیال میں امام شافعیؒ کے قول کو ترجیح دینی چاہیئے۔ کیونکہ منقولہ اور غیر منقولہ کی تفریق کی کوئی دلیل ہمیں نہیں مل سکی۔

وقف علی الاولاد وقف علی الاولاد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کوئی مکان یا زمین یا اور کوئی چیز وقف کر دیتا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں اس کی آمدنی میں استعمال کروں گا اور میرے بعد اس کی آمدنی کی حقدار میری اولاد ہوگی۔ اور اگر میری اولاد میں سے کوئی باقی نہ رہے تو اس کی آمدنی فقراء اور مساکین پر خرچ ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام محمدؒ۔ ہلالؒ الرازی اور امام شافعیؒ اسے جائز نہیں سمجھتے۔ امام محمدؒ۔ ہلال الرازی اور امام شافعیؒ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ وقف کے معنے اپنے حقوق انتفاع کو ختم کر کے یہ حقوق عامہ مسلمین کی طرف (تقرب الٰہی کی نیت سے) منتقل کر دینے کا نام ہے اور اس صورت میں وقف کرنے والا شخص اپنے اور اپنے بعد اپنی اولاد کے حقوق انتفاع کو ختم نہیں کر رہا ہے اس لئے اس کی ملکیت ختم ہو کر حق تعالےٰ کی طرف منتقل ہی نہیں ہوئی۔ لہذا وقف صحیح نہیں ہوگا

یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص ایک ہزار روپے صدقہ کرے اور یہ شرط لگائے کہ ان میں سے پانچ سو روپے میرا حق ہوگا یا کوئی مسجد وقف کرے اور یہ شرط رکھے کہ مسجد کا فلاں حصہ میرے لئے مخصوص ہوگا ہو تو نہ یہ صدقہ صحیح ہوتا ہے اور نہ وقف صحیح ہوتا ہے۔

(ہدایہ ص ۶۴۲ ج ۲)

ہمارے خیال میں اس صورت کے جائز قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت کو تمام فقہاء نے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اسطرح وقف کرے کہ میرے مرنیکے بعد فلاں چیز وقف ہو گی لیکن جبتک میں زندہ ہوں اس سے مجھے انتفاع کا حق باقی رہیگا۔ رہگیا مرنیکے بعد انتفاع کا حق اولاد کیطرف منتقل کردینے کی بات تو وہ بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ حسن سلوک، احسان اور صدقات میں حق تعالے نے اولوالقربیٰ (قرابت داروں) کا حق تسلیم کیا ہے اور انھیں دوسرے مستحقین پر ترجیح حاصل ہو سورۂ بقرہ میں ہو

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

اَلْمُتَّقُوْنَ ٥ (۲/۱۷۷)

نیکی تو یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، یوم آخرپر، ملائکہ پر، کتاب (قرآن) پر اور انبیا، پر ایمان لائے اور باوجود مال کی محبت کے اسے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، ضرورت مندوں، اور لوگوں کی گلو خلاصیوں میں دے اور صلوٰۃ قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب کوئی معاہدہ کرے تو اسے پورا کرے اور تنگی ترشی میں ضبط نفس سے کام لے اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہے۔ ایسے ہی لوگ سچے (مسلمان) ہیں اور یہی لوگ تقویٰ شعار اور متقی ہیں

نیز سورۂ نساء میں ہے

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۙ

(۴/۳۶)

اور اللہ ہی کی بندگی اختیار کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو، والدین کے ساتھ حسن سلوک

کرو نیز قرابت داروں یتیموں مسکینوں قرابت دار پڑوسیوں، اجنبی پڑوسیوں، ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں، مسافروں، نیز ان لوگوں کے ساتھ جو تمھارے ہاتھ کے نیچے ہوں (آج کل ملازمین اور خدمت گار) احسان کرتے رہو۔ یقیناً حق تعالیٰ مغرور شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا۔

نیز سورۂ نحل میں ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ج یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ٥

(۱۶/۹۰)

اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے اور اس کا کہ قرابت داروں کو مال دیا جائے اور بے حیائی اور نازیبا کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت اس لئے کرتا ہے تاکہ تم اسے ہمہ وقت یاد رکھو۔

نیز سورۂ بنی اسرائیل میں ہے

وَاٰتِ ذَی الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ٥

۱۷/۲۶

اور قرابت داروں کو ان کا حق دو، نیز مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کرو۔

ان تمام مصارف کی تفصیل ہم کتاب الزکوۃ میں بیان کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ہر ہر مصرف سے مراد کون کون لوگ ہیں اسے دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ انہوں نے حضور سے پوچھا کہ صدقات میں کونسا صدقہ افضل ہے تو آپ نے فرمایا ، جو نادار آدمی کو دیا جائے اور ہمیشہ ابتدا ان سے کرو جن کی کفالت تمہارے ذمہ ہے۔

(ابو داؤد بحوالہ جمع الفوائد صفحہ ۱۴۸ ج ۱)

نیز نسائی نے حضرت سلمان بن عامر رضؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہوتا ہے اور قرابت دار پر صدقہ کرنا دو صدقوں کے برابر ہوتا ہے ۔ ایک تو صدقہ ہے ہی دوسرا صلہ رحمی کا ثواب بھی ہوتا ہے۔

(بحوالہ جمع الفوائد صفحہ ۱۷۱ ج ۲)

ان تمام آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کا مستحسن اور مامور ہونا بلکہ مرجح ہونا ثابت ہے ۔ اولاد کے لئے جو وقف کیا جاتا ہے وہ بھی مفادِ عامہ ہی کے ضمن میں آتا ہے کیونکہ اقربا اور رشتہ دار بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں ہیں ۔ وہ

بھی ان ہی کا ایک حصہ ہیں اور ان کا حق مقدم ہے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی آیات میں جو اوپر گذر چکی ہیں حسن سلوک کے جو مصارف بیان فرمائے گئے ہیں ان میں سب سے پہلے ذِی القربیٰ (قرابت داروں) ہی کا نام لیا گیا ہے سورۂ نحل اور سورۂ بنی اسرائیل میں خصوصیت کے ساتھ ذِی الْقُرْبیٰ (قرابت داروں) کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم اس حسن سلوک کی جو وقف علی الاولاد وغیرہ کی صورت میں کیا جاتا ہے مخالفت کرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔

(فقہ القرآن جلد اوّل)

زیادہ تر عبادات پر مشتمل ہے جسمیں تعارف مصنف وکتاب، از مولانا طاہر المکی صاحب مدظلہ، ناظم جامعہ مدینۃ العلوم (اورنگ آباد کراچی ہے۔ پھر مقدمۃ الکتاب از مؤلف ہے جسمیں احادیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دینی حیثیت سے سیر حاصل بحث کیگئی ہے۔ اسکے بعد مندرجہ ذیل ابواب سے یہ جلد مشتمل ہے
کتاب الطہارۃ جسمیں وضو، غسل اور تیمم کے قرآنی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔
کتاب الصلوٰۃ جس میں اوقات صلوٰۃ۔ اذان، شرائط صلوٰۃ، ارکان صلوٰۃ، رکعات صلوٰۃ، صلوٰۃ المسافر، صلوٰۃ الجمعہ، صلوٰۃ الخوف، باب الجنائز۔
کتاب الزکوٰۃ میں ملکیت کا تصور، عوامل پیداوار، اشتراکی اور اسلامی معاشی نظام کا فرق، زمین کی ملکیت، زکوٰۃ کی مقدار، زکوٰۃ کا نصاب، مستحقین کو زکوٰۃ، زکوٰۃ حکومت لیگی۔
کتاب الصوم میں روزے کے قرآنی مسائل، باب الاعتکاف۔
کتاب الحج میں حج کے مسائل، قربانی کے مسائل، جنایات حج کا بیان ہے۔ باب الاضحیہ
کتاب النکاح میں تعدد ازدواج، نابالغوں کا نکاح، باب الکفارت۔ باب المہر کتاب الرضاعت، وغیرہ مسائل کی قرآنی نقطۂ نظر سے مطابق وضاحت کی گئی ہے۔
کتابت وطباعت دیدہ زیب، کاغذ سفید گلیز ڈ، ضخامت ۶۶۶ صفحات قیمت ۵ روپے

(فقہ القرآن جلد دوم)

فقہ القرآن کی دوسری جلد مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

کتاب النکاح اس میں اولاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے سلسلہ میں اسلام کے معاندین اور دوست نما دشمنوں نے جو افسانہ طرازیاں کی ہیں ان کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس سال کی عمر میں چھ سالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے نکاح کیا اور جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر صرف نو سال تھی اور وہ گڑیاں کھیلتی تھیں انھیں رخصت کرالیا۔ یا یہ کہ آپ ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کے خواہش مند تھے۔ اسی وجہ سے آپ کے متبنی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو طلاق دی۔ اور آپ بغیر نکاح اور بغیر اطلاع حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر چلے گئے اور فرمایا کہ زینب رض سے میرا نکاح حق تعالیٰ نے آسمان پر کر دیا ہے۔ یا یہ کہ عورتیں دربار نبوی میں حاضر ہو کر اپنا نفس آپ کو پیش کرتی تھیں اور آپ ان کی پیش کش قبول فرما لیا کرتے تھے۔ وغیرہ

اس کے بعد کتاب الطلاق میں طلاق کے طریقے۔ طلاقوں کی تعداد بیک وقت تین طلاقیں دینے کی حقیقت حکمین اور قاضی کے ذریعے طلاق۔ خلع کے مسائل۔ ایلاء اور ظہار کے قرآنی مسائل۔ آیت تخییر اور آپ کے ایلاء فرمانے کا افسانہ اور اس کی حقیقت۔ لعان کے مسائل۔ عدت کے قرآنی مسائل۔ بیوی اور بچوں کے نفقہ کے مسائل۔

پھر کتاب العتاق میں غلام اور لونڈیوں کی حقیقت اور آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق افسانہ تحریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راز وغیرہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔

ضخامت ۶۰۸ صفحات۔ قیمت صرف پچاس روپے۔

(فقہ القرآن جلد سوم)

فقہ القرآن کی تیسری جلد فرائض و حقوق پر مشتمل ہے۔ ملک کے نامور محققین اور ماہر قانون داں حضرات کا خیال ہے کہ آج تک کسی زبان میں بھی حقوق و فرائض سے متعلق اتنی جامع کتاب نہیں لکھی گئی اس کتاب میں حقوق نسواں سے متعلق ابواب خاص طور پر قابل دید ہیں۔ عورت جو کبھی ہزار برس سے ہر معاشرہ میں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ایشیا کا مظلوم ترین ہستی ہی چلی آرہی ہے فاضل مؤلف نے وضاحت سے بتایا ہے۔ کہ اسلام نے سب سے پہلے ان مظالم کے خلاف جہاد کیا اور اسے اس کا جائز مقام دلایا ہے۔ ماہرین قانون نے مختلف اخبارات و رسائل میں اس کتاب کی تعریف و توصیف فرمائی۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلوں میں جابجا حوالے دیئے۔ مثلاً شریعت پٹیشن نمبر کے ۔ ۳ ؍ ۱۹۸۲ء (ملاحظہ ہو پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۳ء فیڈرل شریعت کورٹ ۷۳) میں پانچ مرتبہ عدالت نے فقہ القرآن کا حوالہ دیا ہے۔ قانون شہادت کے سلسلہ میں اس جلد کے مندرجات پر مبنی پاکستانی اخبارات میں طویل مقالے شائع ہوئے۔ قدیم الخیال مولویوں کے حلقے میں اس کتاب نے ہلچل ڈال دی ہے۔ عورتوں سے متعلق تمام امتیازی مروجہ قوانین کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔ اسکے علاوہ قرابت داروں کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، یتامیٰ کے حقوق، حاجت مندوں کے حقوق، بیماروں اور معذوروں کے حقوق۔ مہمانوں کے حقوق، انسانی برادری کے حقوق، حتیٰ کہ جانوروں اور بے جان نباتات کے حقوق۔ تمام حقوق و فرائض کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔

کتاب و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ
ضخامت ۵۳۶ صفحات۔ قیمت صرف پچاس روپے۔

(فقہ القرآن جلد چہارم)

فقہ القرآن چوتھی جلد میں قرآنی حدود، تعزیرات و جنایات سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ حد قذف کے ضمن میں افسانہ افک کی قلعی کھولی گئی ہے جو سیدہ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق مشہور کیا گیا ہے۔ کہ معاذ اللہ آں محترمہ کے خلاف تہمت لگائی گئی تھی۔ یہ بحث ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ اس کے بعد قصاص و دیات سے بحث کر کے۔ قصاص سیدنا ذوالنورین حضرت عثمان خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں آج تک پھیلائی جاتی رہی ہیں ان کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

کتاب الخوارج میں باغیوں کے احکام۔ خوارج سے متعلق تفصیلی بحث کہ وہ کون تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عہد تک ان کا کیا رول رہا ہے۔

کتاب التعزیر میں شراب کی تعزیر۔ قطع طریق یعنی ڈاکہ ڈالنے کی تعزیر اور زنا کی تعزیر سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد قتل مرتد پر بھی مفصل بحث ہے۔

یہ جلد حدود و تعزیرات کے سلسلہ میں نہایت جامع کتاب ہے جس میں وہ تمام مباحث آگئے ہیں جن کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ نیز وہ تمام غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمارے مروّجہ فقہ کی وجہ سے اسلام کے نام پر بدنما داغ ہیں۔ مثلاً باپ سے قتل ہو جائے تو اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ عورت غلطی سے قتل ہو جائے تو اسکی دیت آدھی ہوتی ہے قتل عمد میں بھی دیت دیکر قصاص سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔

ضخامت تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات۔ قیمت صرف ساٹھ ۶۰ روپے

(فقہ القرآن جلد پنجم)

"رجم اصل حد ہے یا تعزیر ؟" یہ بحث جلد چہارم میں آئی ہے لیکن چونکہ گذشتہ دنوں پاکستان میں قوانین اسلامی کو نافذ کرنے کے ضمن میں زنا کی حد کے سلسلے میں یہ بحث عوام وخواص کے اذہان کو پریشان کر رہی تھی کہ زنا کے لئے اسلامی قانون حدود میں "رجم" کی کیا حیثیت ہے؟ ہمارے علمائے کرام کا قدیم الخیال طبقہ مصر تھا کہ زنا کی سزا اگر زنا کے مجرم شادی شدہ ہوں تو رجم یعنی سنگ سار کر دینا ہے۔ فاضل مؤلف نے قرآن وسنت کے ناقابل تردید شواہد سے ثابت کیا ہے کہ زنا کی حد شرعی سنگسار کرنا نہیں ہے بلکہ سو کوڑے مارنا ہے۔ البتہ اگر تعزیراً حکومت وقت کسی خاص مقدمے میں عبرت اندوزی کیلئے رجم کرنا چاہے تو رجم کر سکتی ہے مگر اس کو قرآنی حد نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں مفصل بحث کے بعد اپنی تائید میں علامہ انور شاہ کشمیری، پروفیسر ابو زہرہ مصری وغیرہ کئی علمائے کرام کے اقوال پیش کئے گئے ہیں۔

وفاقی شرعی عدالت نے ایک مرتبہ یہ فیصلہ کر چکنے کے بعد کہ رجم حد قرآنی نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے حکومت کی ریویو کی درخواست پر از سر نو غور وخوض شروع کر دیا ہے۔ اور سنا ہے کہ اس نے اپنے فیصلے سے رجوع کر لیا ہے۔ بہر حال اس مسئلے میں اسلامی نظام حدود کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں انکا اس کتاب میں کافی وشافی جواب دیدیا گیا ہے۔ حکومت اور اس کی شرعی عدالت وقتی مصالح کے پیش نظر کیا فیصلہ کرتی ہے اس سے ہمیں غرض نہیں ہے ہمیں یہ بتا دینا تھا کہ رجم قرآنی حد نہیں ہے اور ہم نے اسے کما حقہ ثابت کر دیا ہے اور عہد حاضر کے محققین اور ماہرین قانون شرعی کی تائیدات سے مسئلہ کو بالکل منقح کر دیا ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید گلیزڈ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات۔ قیمت صرف بیس روپے۔

(فقہ القرآن جلد ششم)

اس جلد کا مرکزی مسئلہ عورتوں کی شہادت اور دیت ہے عام طور پر ہمارے ہاں عورتوں کی شہادت اور دیت نصف، مانی جاتی ہے۔ اور حدود و قصاص کے مقامات میں عورتوں کی شہادت کو ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ فقہ القرآن کی تیسری اور چوتھی جلد میں یہ مسائل مختصراً زیر بحث آئے تھے اور فاضل مصنف نے متعارف و مدلول مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے قرآن کریم کی روشنی میں ثابت کیا تھا کہ عورتوں کی شہادت، اور دیت منصف نہیں بلکہ مکمل ہونی چاہئے اور عورتوں اور مردوں میں اس سلسلہ میں کوئی امتیاز برتنا قرآن کریم کے خلاف ہے جس پر علماء کرام کے حلقوں سے نہایت شدید اختلاف کیا گیا بلکہ نہایت دیدہ دلیری سے عربی عبارتوں میں تحریف و تصحیف کی گئی اور بعض جگہ غلط بیانیوں سے کام لیا گیا۔ فاضل مصنف، نے اس جلد میں اس مسئلہ کا بھرپور جائزہ لیا اور ثابت کیا کہ علماء کرام کا موقف صراحۃً قرآن کریم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی سلسلہ میں موصوف نے "اجماع" کے مسئلہ پر جس کی دہائی بڑی شد و مد سے دی جا رہی تھی ایک فیصلہ کن مقالہ بھی تحریر کیا تھا جو اس جلد میں شامل ہے۔ اس جلد کا تعارف ملک کے نامور چیف جسٹس آفتاب حسین صاحب سابق چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے تحریر فرمایا ہے۔

ضخامت ۵۲۸ صفحات ، سفید کاغذ گلیزڈ

قیمت :-

صرف پچپن روپے۔